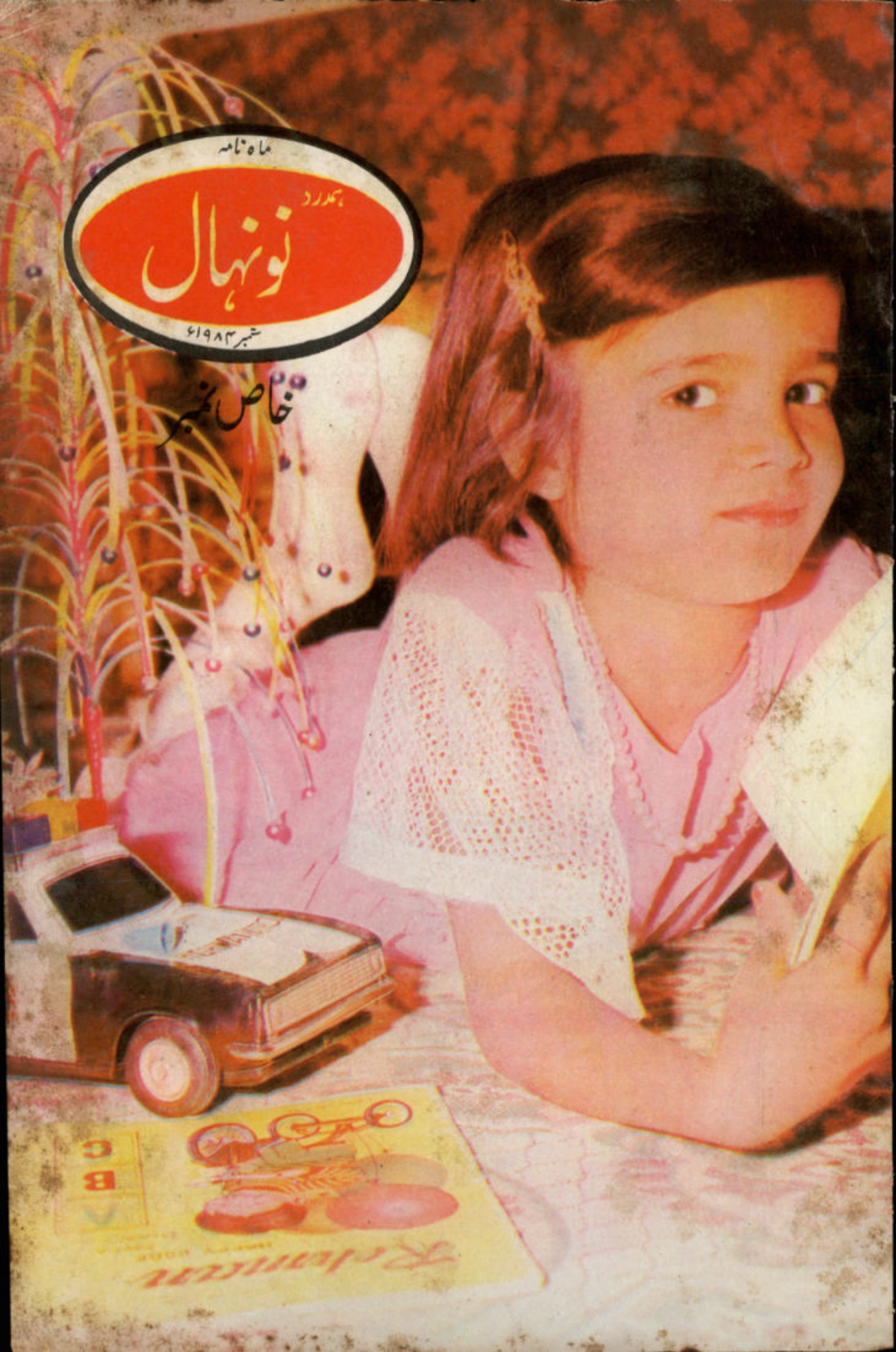
ماہ نامہ
ہمدرد
نونہال
ستمبر ۱۹۸۳ء
خاص نمبر

ہوگا دنیا میں تو بے مثال میرے بچے میرے نونہال
فطری طور پر کوئی دو بچے اپنی شکل وصورت، عادات و اطوار اور دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہوتے اور یوں ہر بچہ بے مثل کہلایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر ماں اپنے بچے کو انفرادی طور پر ایک تن درست، روشن دماغ اور بے مثل کامیاب انسان دیکھنا چاہتی ہے۔ اس آرزو کی تکمیل کا زیادہ تر انحصار بچے کی صحیح اور صحت مند پرورش پر ہے۔
دوراندیش مائیں اپنے بچوں کی صحت مند پرورش اور آرام وسکون کے لیے انہیں نونہال ہربل گرائپ واٹر باقاعدگی سے دیتی ہیں۔
جڑی بوٹیوں سے تیارشدہ خوش ذائقہ نونہال ہربل گرائپ واٹر بچوں کی آئے دن کی تکالیف مثلاً بدہضمی، قبض، اپھارہ، قے و دست، بے خوابی، دانت آنا اور پیاس کی شدت وغیرہ کے لیے ایک مفید اور مؤثر گھریلو دوا ہے۔
Naunehal
Naunehal
Herbal Gripe Water
Hamdard
نونہال
ہربل گرائپ واٹر
بچوں کو مطمئن، مسرور اور صحت مند رکھتا ہے

ٹیلیفون 616001 تا 616005

ہمدرد نونہال

خاص نمبر

ذی الحجہ ○ ۱۴۰۴ ہجری
ستمبر ○ ۱۹۸۴ عیسوی
جلد ○ ۳۲
شمارہ —— ۹
فی شمارہ —— ۳ رُپے
قیمت خاص شمارہ ۰۰/ ۱۰ رُپے
سالانہ —— ۰۰/ ۳۰ رُپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۰۰/ ۶۶ رُپے

مجلس ادارت

صدر مجلس
○ حکیم محمد سعید

مدیر اعلا
○ مسعود احمد برکاتی

مدیرۂ اعزازی
○ سعدیہ راشد

پتا: —— ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ ناظم آباد کراچی ۱۸

ہمدرد فاؤنڈیشن (پاکستان) نے نونہالوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا۔

اس رسالے میں کیا کیا ہے

جاگو جگاؤ	جناب حکیم محمد سعید	۵
پہلی بات	مسعود احمد برکاتی	۶
ہمارے ہادی کا آخری حج	جناب عبدالواحد سندھی	۷
پتھر (نظم)	جناب شاعر لکھنوی	۹
خیال کے پھول	ننھے گل چیں	۱۰
حکیم ابن سینا	جناب ڈاکٹر سہیل برکاتی	۱۱
جب تم جوان ہو (نظم)	جناب دلاور فگار	۱۴
مسکراتی تحریریں	جناب شفیق الرحمٰن، جناب مشتاق احمد یوسفی جناب ابنِ انشا، جناب مسعود مفتی	۱۷
خوشی اور اطمینان	جناب ملّا واحدی	۲۳
ایک محسنہ کے نام	مسعود احمد برکاتی	۲۵
سورج کی طاقت	جناب شاداں پرویز	۲۹
گڑیا کی شادی (نظم)	جناب قمر ہاشمی	۳۳
کارٹون	جناب مشتاق	۳۴
جوتوں کا تماشا	جناب معراج	۳۵
ننھا چلا ہے مدرسے (نظم)	جناب طالب حسین طالب	۴۷
عنوان لکھیے (انعامی مقابلہ)	ادارہ	۴۹
ہماری پیاری زمین	محترمہ رخسانہ اسرائیل	۵۵
طب کی روشنی میں	جناب حکیم محمد سعید	۵۷
چھوٹی لڑکی بڑی کامیابی	ادارہ	۶۳
تحفے	باذوق نونہال	۶۷
اتحاد و اتفاق کا	مسعود احمد برکاتی	۷۳
یہ نہیں ہو گا (ڈراما)	جناب میرزا ادیب	۷۷
حکیم محمد سعید کی شرارتیں	جناب حکیم محمد سعید	۸۷
اپنا پیشہ (نظم)	جناب غنی دہلوی	۹۱
گھنگرو والے بڑے میاں	جناب احمد جمال پاشا	۹۳
تلادیس کا آدم خور	جم کاربٹ	۹۷
خوش رہنا سیکھو	محترمہ ریحانہ زماں	۱۰۵
بھرے کا شنار	جناب علی اسد	۱۰۹
ہمدرد انسائکلوپیڈیا	جناب علی ناصر زیدی	۱۲۳
امام غزالی	مسعود احمد برکاتی	۱۲۷

ناگرا آبشار	جناب حکیم محمد سعید	۱۲۹
جب ۲۳ویں اولمپک کھیل....	جناب ساجد علی ساجد	۱۴۳
بارش کے رنگ (نظم)	محترمہ عینیہ فرح	۱۴۹
گھوڑے کہاں گئے؟	جناب معراج	۱۵۱
باتوں کا پٹارا	جناب مناظر صدیقی	۱۶۱
شرلاک ہومز کا استاد	......	۱۷۱
اخبار نونہال	ننھے صحافی	۱۷۶
نونہال مصوّر	ننھے آرٹسٹ	۱۷۸
ہماری تاریخ کے خوب صورت لمحے	جناب احمد خاں خلیل	۱۸۱
سمندر اور اس کے عجائبات	جناب علی اسد	۱۸۷
چالاک خرگوش کے کارنامے (۲)	جناب کرشن چندر	۱۹۳
وزن اُٹھانے کا صحیح طریقہ	مسعود احمد برکاتی	۲۰۴
بِن کہے	محترمہ فہمیدہ عتیق	۲۰۷
ایک انوکھا انٹرویو	ادارہ	۲۱۵
الزام کس پر	جناب محمد حسین حسّان	۲۲۳
لڑکیوں کے لیے	محترمہ صالحہ حسن، محترمہ صائمہ کمال	۲۳۷
اقوالِ حکیم	جناب عصمت علی پٹیل	۲۳۹
صحت مند نونہال	ادارہ	۲۴۲
ملا نصر الدین کا انصاف	جناب محمد عامر محمود	۲۴۵
کام کی لذّت	محترمہ ریحانہ رجب علی	۲۴۷
ایمزون کے جنگلوں میں	جناب مناظر صدیقی	۲۴۹
معلومات عامہ نمبر ۲۲۱ انعامی سوالات	ادارہ	۲۵۷
خط کی کہانی	محترمہ زبیدہ جبیں	۲۶۱
دو مٹکے بھر فارسی	ادارہ	۲۶۸
ایک نرالی ڈاک کمپنی	ادارہ	۲۷۰
مسکراتے رہو	ننھے مزاح نگار	۲۷۵
بزم نونہال	نونہال پڑھنے والے	۲۷۹
نونہال ادیب	ننھے لکھنے والے	۲۸۳
اس شمارے کے مشکل الفاظ	ادارہ	۳۰۱
معلومات عامہ نمبر ۲۱۹ کے جوابات	ادارہ	۳۰۲

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے، لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں اُن کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اس رسالے کی تمام کہانیوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ ان میں سے کسی کی کسی حقیقی شخص یا واقعے سے مطابقت محض اتفاقی ہو سکتی ہے، جس کے لیے ادارہ ذمّے دار نہ ہوگا۔

حکیم محمد سعید پبلشر نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارۂ مطبوعاتِ ہمدرد ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸ سے شائع کیا۔

عالمی ٹرافی معیار کا بیّن ثبوت ہے۔

ہم دعویٰ ہی نہیں کرتے بلکہ
الحمدُ لِلّٰہ ہماری تمام مصنوعات معیاری اور
عالمی شہرت یافتہ ہیں !

BUXLY PAINTS
بکسلے پینٹس لمیٹڈ

United

جاگو جگاؤ

نفرت سے بڑا کوئی دُشمن نہیں

محبّت سے اچھا کوئی دوست نہیں

احترام سے اعلا کوئی وَصف نہیں

اخلاق سے بڑی کوئی طاقت نہیں

حکیم محمد سعید

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ اس میں کچھ سامان بھی رکھا تھا۔ یہ کوٹھری کے مالک بہت نیک اور شریف آدمی تھے۔ ان کے پاس ایک ٹارچ بھی تھی۔ اس ٹارچ کو انھوں نے جلا کر اس کوٹھری میں رکھ دیا۔ اس سے جو روشنی ہوئی وہ اس کوٹھری کے اندر رہی۔ باہر اندھیرا ہی رہا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ بھائی، آپ نے روشنی کو بند کیوں کر رکھا ہے، تو انھوں نے کہا کہ کوٹھری میری ہے۔ مجھے اسی میں اُجالا کرنا ہے، اس لیے میں نے ٹارچ کو وہیں رکھا ہے۔ ایک حد تک تو ان صاحب کی بات درست تھی، لیکن قومی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے اُن کی بات اچھی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے اچھی بات یہ ہے کہ آدمی کو جو نعمت بھی میسر ہے اُس سے خود بھی فائدہ اُٹھائے اور دوسروں کو بھی پہنچائے۔ علم بھی ایک اُجالا ہے، اخلاق بھی ایک روشنی ہے۔ علم اس لیے ہے کہ انسان خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی اس سے محروم نہ رکھے۔ جو لوگ علم رکھتے ہیں، مگر دوسروں تک پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے، وہ اُجالے کو بند رکھتے ہیں۔ اُجالا جتنا پھیلتا ہے اتنی ہی برکت پھیلتی ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ علم کا چراغ جلاؤ تاکہ اس کی روشنی میں خود بھی سیدھے راستے پر چل سکو اور دوسرے بھی بھٹکنے سے بچ سکیں۔ اگر علم کے چراغ کو کوٹھری میں بند رکھو گے تو وہ ایک نہ ایک دن بجھ جائے گا۔ اگر اُس کے اُجالے کو عام کرو گے تو سب کا فائدہ ہوگا اور اس کی روشنی پھیلانے میں ہر انسان حصّہ لے سکے گا۔

ہمدرد نونہال کا مقصد یہی ہے کہ علم کا اُجالا پھیلے۔ یاد رکھیے علم کا کوئی بدل نہیں۔ دولت، حکومت، شہرت، غرض کوئی چیز علم کی جگہ نہیں لے سکتی بلکہ یہ سب چیزیں علم کے بغیر مل بھی جائیں تو جلد ہی چھن جاتی ہیں۔ پاکستان کو علم کی ضرورت ہے، اس لیے طالب علم پاکستان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ بہترین طالب علم وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے۔ جناب حکیم محمد سعید، ہمدرد فاؤنڈیشن اور ہمدرد نونہال کے ہم خادموں کی یہی خواہش اور کوشش ہے کہ پاکستان میں علم، طالب علم اور عالم کا بول بالا ہو۔

خاص نمبر میں وہ سب کچھ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے علم بڑھے، جس سے ذہنی تفریح ہو اور جو بچے پسند کرتے ہیں۔ رات دن کی مسلسل محنت کے بعد خاص نمبر کو آپ کے لیے دل چسپ بنایا ہے۔ یقین ہے آپ کو پسند آئے گا اور آپ اس اُجالے کو دوسروں تک پھیلائیں گے۔

ہمارے ہادیؐ کا آخری حج

عبدالوحد سندھی

ہجرت کا دسواں سال تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا۔ ذی قعدہ سنہ ۱۰ ہجری میں اعلان کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ یہ خبر پورے عرب میں پھیل گئی۔ اس بابرکت موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے شوق میں پورا عرب اُمنڈ آیا۔

ماہ ذی قعدہ کی آخری تاریخوں میں آپ کی سواری مدینۂ طیبہ سے روانہ ہوئی اور ۴ ذی الحجہ کی صبح کے وقت آپ مکہ مکرمہ تشریف لے آئے۔ وہاں آنے کے بعد پہلے آپ نے کعبہ کا طواف کیا اور پھر آپؐ نے مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا فرمائی۔

اس کے بعد آپؐ صفا کی پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ وہاں سے اُتر کر مروہ کی سعی کی، یعنی دوڑ لگائی۔ ان چیزوں سے فراغت کے بعد آپ نے جمعرات کے روز یعنی آٹھویں ذی الحجہ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا۔

دوسرے دن ۹ ذی الحجہ کی صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے اور عرفات کے میدان میں تشریف لائے۔ عرفات کے میدان میں آپ نے وہ مشہور تاریخی خطبۂ حج دیا، جو دنیا کی تاریخ میں "حقوقِ انسانی" کا پہلا منشور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے انسانوں کے لیے اہم باتوں کے بارے میں ہدایتیں فرمائیں:

۱۔ لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکھٹے نہیں ہوں گے۔

۲۔ لوگو! تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں، جیسا کہ تم آج کے دن کی، اس شہر کی، اس مہینے کی حرمت کرتے ہو۔ لوگو! تمھیں عن قریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمھارے کاموں کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار میرے بعد گم راہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

۳۔ لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے ملیامیٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون میرے خاندان کا ہے یعنی ابن ربیعہ بن الحارث کا خون، جو

بنی سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہُذیل نے اُسے مار ڈالا تھا۔ میں چھوڑتا ہوں۔
جاہلیت کے زمانے کا سود ملیامیٹ کر دیا گیا۔ پہلا سود اپنے خاندان کا جو میں مٹاتا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ وہ سارے کا سارا چھوڑ دیا گیا۔

۴۔ لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمے داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو اچھی طرح کھلاؤ، اچھی طرح پہناؤ۔

۵۔ لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑ لوگے تو کبھی گم راہ نہ ہوگے۔ وہ قرآن، اللہ کی کتاب ہے۔

۶۔ لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سُن لو کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ مالوں کی زکوٰۃ نہایت خوش دلی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حج بجالاؤ۔ اپنے حکام کی اطاعت کرو، جس کی جزا یہ ہے کہ تم پروردگار کی فردوسِ بریں میں داخل ہوگے۔

۷۔ لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی پوچھا جائے گا، مجھے ذرا بتا دو کہ تم کیا جواب دوگے؟

سب نے کہا، "ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچا دیے۔ آپ نے رسالت اور نبوّت یعنی اللہ میاں کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔" ہمارے پیارے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف اپنی انگلی اُٹھائی اور تین دفعہ فرمایا، "اے اللہ تُو گواہ رہنا۔" پھر آپؐ نے فرمایا، "جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ (یہ سب باتیں) ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔" اس موقع پر قرآن پاک کی ایک آیت نازل ہوئی جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"آج میں نے تمھارے لیے دین کو پورا کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمھارے لیے اسلام کو بہ حیثیت دین پسند کیا۔"

آخری حج کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے طریقے خود برت کر دکھا دیے کہ حج کس طرح کرنا چاہیے۔

اسی موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "مجھ سے حج کے مسئلے سیکھ لو۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت آئے۔"

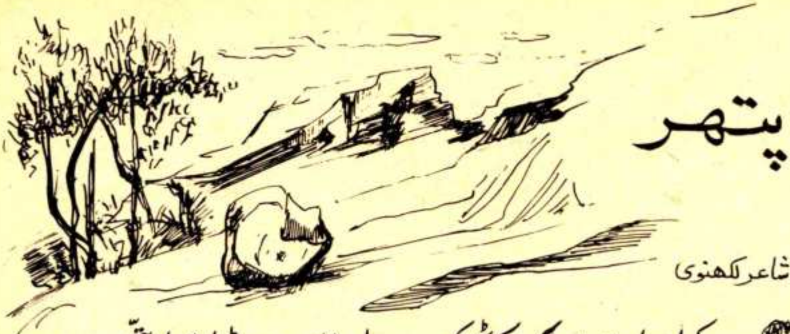

پتھر

شاعر لکھنوی

کھا رہا ہے ہر ایک کی ٹھوکر — راہ میں یہ پڑا ہوا پتھر
جسم پر اس کے سیکڑوں ہیں داغ — کس قبیلے کا ہے یہ چشم و چراغ
کون سے اُونچے خاندان سے ہے — سِلسلہ اس کا کس چٹان سے ہے
کس طلب نے اِسے ستایا ہے — اِس طرف کس غرض سے آیا ہے
گرچہ اِک عمر سے ہے گرد آلود — آدمی سے بڑا ہے اِس کا وجود
لاکھ اپنی جگہ یہ بھاری ہے — اس کی فطرت میں خاکساری ہے
اپنی گردش کا خود کفیل ہے یہ — اپنی راہوں کا سنگِ میل ہے یہ
سختیوں کی تو اس کو عادت ہے — سخت دل ہو کے نرم طینت ہے
حادثوں سے کبھی یہ نہیں ڈرتا — ٹھوکروں پر بھی اُف نہیں کرتا
اس نے دیکھی ہے وقت کی ہر راہ — آدمی کی رَوِش سے ہے آگاہ

لمحہ لمحہ ہے اس کا یہ اعلان
راستہ "دیکھ کر" چلے انسان

خیال کے پھول

• حضور اکرمؐ

جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔

مرسلہ: پرنس افضل شاہین، بہاول نگر

• حضرت علیؓ

سچ بات سُن کر سچ کہنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔

مرسلہ: راؤ مصوّر علی، مٹھن کوٹ

• حضرت امام مالکؒ

انسان کا سب سے بڑا بوجھ غصّہ ہے۔ مرسلہ: فصیحہ فاطمہ، روہڑی

مولانا رومیؒ

حقیقی کامیابی لگاتار محنت سے حاصل ہوتی ہے۔

مرسلہ: عظمیٰ فاطمہ، روہڑی

• شیخ سعدیؒ

جو دوسروں کے غم سے بے غم ہے آدمی کہلانے کا مستحق نہیں۔

• علامہ اقبالؒ

جد و جہد ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔

مرسلہ: مامون اکبر کنڈی، ڈیرہ اسماعیل خاں

• جالینوس

نیک لوگوں کو دشمنوں سے بھی نفع حاصل ہوتا ہے۔

• خلیفہ مامون رشید

شیریں کلام اور خوش خلق کے ساتھ محبت واجب ہوتی ہے۔

مرسلہ: صدف حنیف، کراچی

• جنید بغدادی

اللہ کے نزدیک سب سے پیاری بات والدین کی اطاعت ہے۔ مرسلہ: عبداللہ آزاد، کراچی

• افلاطون

ہر شخص کچھ نہ کچھ عقل و فراست رکھتا ہے، لیکن ہر شخص عقل و فراست سے کام لینا نہیں جانتا۔

مرسلہ: نجم الحسن نیازی، حیدرآباد

• مولانا محمد علی جوہر

ماں کی اصل خوب صورتی اُس کی محبت ہوتی ہے۔ میری ماں دُنیا کی سب سے خوب صورت ماں ہے۔

مرسلہ: اکرم علی ہیسبانی، حیدرآباد

• مولانا ابوالکلام آزاد

غلامی کے چاہے کیسے حسین نام کیوں نہ رکھے جائیں غلامی بہرحال غلامی ہے۔ مرسلہ: ظہیر حسن، لاہور

• گوئٹے

مسرت تمام خوبیوں کی ماں ہے۔ مرسلہ: طیب رشید، لاہور

حکیم ابنِ سینا

ڈاکٹر سہیل برکاتی

بخارا ایک زمانے میں دنیا کا مشہور و معروف شہر تھا۔ یہاں کے لوگ علم حاصل کرنے کے بہت شوقین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عالموں کی قدر کرنے کے ساتھ علم حاصل کرنے کے لیے بہت دُور دُور کا سفر بھی کرتے تھے۔ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے بخارا پر نوح بن منصور نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ سخت بیمار پڑا۔ اس کے دربار کے معالجوں کی تمام کوششوں کے باوجود صحّت یاب نہ ہو سکا۔ بخارا میں اس وقت ایک نوجوان طبیب بھی موجود تھا۔ اس نوجوان طبیب کی عمر اُس وقت صرف سترہ سال تھی۔ چوں کہ درباری طبیبوں کے علاج سے بادشاہ کو فائدہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے اس نوجوان کو بھی دربار میں طلب کیا گیا۔ اس کے علاج سے بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ اس طبیب کو دنیا آج حکیم ابنِ سینا کے نام سے جانتی اور ایک عظیم طبیب، مفکّر اور سائنس

داں مانتی ہے۔ اس کا پورا نام ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن حسن بن علی بن سینا ہے۔ شہر بخارا کے ایک قصبے اخشنہ میں سن ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔

ابنِ سینا بچپن ہی سے بہت ذہین اور علم کا بہت شوقین تھا۔ ابھی دس برس ہی کا تھا کہ ابنِ سینا نے قرآن شریف حفظ کر لیا اور کچھ ادبی علوم کا مطالعہ بھی مکمل کر لیا۔ اپنے بیٹے کی ذہانت اور علم سے دل چسپی دیکھ کر ابنِ سینا کے باپ نے اس کی تعلیم پر خاص توجہ دی اور اس کے لیے اُستاد مقرر کیے۔ ان اُستادوں میں سے ایک کا نام ابوعبداللہ الناتلی بھی تھا، جن سے اس نے فلسفہ، منطق اور حساب کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ ابنِ سینا نے ان علوم میں جلد ہی اتنی مہارت حاصل کر لی کہ بعض مسائل کو وہ اپنے اُستاد سے زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگا اور یوں اُستاد کو اپنے شاگرد سے فائدہ پہنچا۔

بوعلی ابنِ سینا کے زمانے میں لوگ عام طور سے کئی کئی مضامین کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایک ہی آدمی طب، فلسفہ، ادب، طبیعیات، کیمیا، حساب جیسے مختلف قسم کے علوم نہ صرف پڑھتا تھا بلکہ ان میں مہارت بھی پیدا کرتا تھا۔ اس لیے ابنِ سینا نے بھی طبیعیات کی طرف توجہ دی اور اس مضمون کی کتابیں پڑھنے کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی۔ ابنِ سینا کو علم طب دوسرے مضامین کے مقابلے میں بہت آسان لگا اور وہ طبیب کی حیثیت سے بہت کام یاب رہا۔ اس کے علاج سے لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ ابنِ سینا نے طب کی تعلیم بھی دی، کیوں کہ ابنِ سینا کو علم حاصل کرنے سے دل چسپی تھی اس لیے طبیب بننے کے بعد بھی اس نے دوسرے علوم کا مطالعہ جاری رکھا۔ وہ فلسفہ، منطق، طبیعیات کے علاوہ ریاضیات کی کتابوں سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ اس کے مطالعے کے شوق اور علم سے دل چسپی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر اس کے سامنے کتابیں پھیلی ہوتی تھیں اور وہ ان کو پڑھنے میں اور سمجھنے میں اتنا معروف رہتا تھا کہ سونے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ ابن سینا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب وہ سولہ سال کا تھا تو ڈیڑھ سال تک بہت کم سو یا، ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا اور جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تو مسجد میں جاکر نماز پڑھتا اور مسئلہ حل ہونے کی دُعا مانگتا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ان تمام علوم کی کتابیں پڑھ کر فارغ ہو چکا تھا جن کا ذکر آپ نے اوپر پڑھا ہے۔

علم حاصل کرنے کے بعد اس کو دوسروں تک پہچانا اور اس میں اضافہ کرنا ہر تعلیم یافتہ انسان

کا فرض ہوتا ہے۔ ابنِ سینا نے طب پڑھی تو اس کے ذریعہ سے علاج کرکے لوگوں کو بیماریوں سے نجات دلائی اور دوسرے لوگوں کو طب کی تعلیم دی۔ اسی طرح اس نے طب، فلسفہ، منطق اور طبیعیات پر چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھیں جن کی تعداد کسی نے پچاس، کسی نے ۹۹ اور کسی نے کئی سو لکھی ہے۔ اس کی سب سے مشہور کتاب کا نام "القانون فی الطب" ہے۔ جسے طب کا انسائکلوپیڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ابنِ سینا نے قدیم و جدید طب پر موجود تمام معلومات کو اکٹھا کر دیا ہے اور ان معلومات میں اپنے علم اور تجربے سے اضافہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں معلومات کو پیش کرنے کا انداز نیا ہونے کے ساتھ اتنا دل چسپ تھا کہ بہت جلد یہ کتاب مقبول ہو گئی۔ "القانون فی الطب" اتنی مفید کتاب ثابت ہوئی کہ لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور یورپ کی درس گاہوں میں ایک عرصے تک اس کو نصاب میں شامل رکھا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جدید سائنسی طب کو پروان چڑھانے میں جن کتاب کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ ابنِ سینا کی یہی کتاب ہے۔ اس کتاب کا فائدہ اٹھانے کے لیے دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ علم طب کی درس گاہوں میں اب بھی اس کتاب کو خاص طور سے پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرے علوم پر بھی حکیم ابنِ سینا کی جو کتابیں ہیں ان میں قابلِ قدر معلومات ملتی ہیں۔ طبیعیات میں اس نے توانائی، حرارت، روشنی وغیرہ سے متعلق نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ ابنِ سینا کی کتابوں میں فلسفے پر "الشفا" منطق پر "الاشارات والتنبیہات" بھی بہت مشہور ہیں۔

پرانے زمانے کے بادشاہوں کا ایک شوق یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ نام وَر عالموں اور ماہروں کو اپنے درباروں میں بُلاتے تھے اور ان کو انعام و اکرام دیتے تھے، جس سے اُن کا مقصد عالموں کی عزّت افزائی کے علاوہ علم کا فروغ بھی تھا۔ ابنِ سینا کو بھی اپنی اعلا علمی قابلیت کی وجہ سے مختلف بادشاہوں اور امیروں کے دربار میں رہنے کا اتفاق ہوا، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔
امیر قابوس، نوح بن منصور، خوارزم شاہ، امیر مجد الدولہ، امیر ہمدان شمس الدولہ۔
درباروں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ابنِ سینا کو عزت و مرتبہ کے ساتھ مالی آسائش بھی ملی۔ لیکن بادشاہوں کی ناراضگی یا کسی اور وجہ سے ابنِ سینا کو زندگی کا کچھ حصّہ قید میں بھی گزارنا پڑا۔ یہ عظیم حکیم اور سائنس داں ستاون سال اس دنیا میں رہنے کے بعد جون ۱۰۳۷ء میں ہمدان میں انتقال کر گیا۔

تم جب جوان ہو

دلاور فگار

ہمدرد فاؤنڈیشن نے یونیسکو پروگرام کی تائید اور مطابقت میں ۲۱۔مارچ ۱۹۸۴ء کو بچّوں کی شاعری کا عالمی دن منایا اور تیرہ سال سے کم عمر بچّوں کا ایک مشاعرہ بہ عنوان "آؤ، ایک بے خوف دنیا تعمیر کریں" منعقد کیا۔ یہ "بچّہ مشاعرہ" اپنی مثال آپ تھا۔ تیرہ سال سے کم عمر بچّوں کے لیے یہ نظم لکھی ہے جسے ایک سو تیرہ سال تک کے بچّے پڑھ سکتے ہیں۔

بچّو! مری دُعا ہے کہ تم جب جوان ہو
انسان کا جہاں میں نہ یوں امتحان ہو
دُنیا تمھاری خوفِ تصادُم سے دُور ہو
ہاں، اِک خدا کا خوف دِلوں میں ضرور ہو

اللہ تم کو جوہرِ شعری ضرور دے
تم وہ غزل لکھو جو دِلوں کو سرُور دے
اس وقت اس جہاں میں جو بھڑکی ہوئی ہے آگ
تم جب جوان ہو تو نہ ہو وقت کا یہ راگ

تم جب جواں ہو چار طرف یہ دھواں نہ ہو
یعنی تمھارے دَور میں "آتش" جواں نہ ہو
تم جب جواں ہو امن کی آواز ہو بلند
دنیا کے ہر علاقے میں ہو جائے جنگ بند

دنیا سلامتی کے نئے مرحلے میں ہو
راکٹ نہ ہوں فضاؤں میں، لاکٹ گلے میں ہو
حملوں کی بُو نہ آئے سیاسی بیان میں
یہ اَسلِحہ کی دوڑ نہ ہو اس جہان میں

ورثے میں وقت تم کو مسائل نہ دے کے جائے
یہ اسلحہ، یہ بم، یہ مزائل نہ دے کے جائے

ہم اسلحہ کے سائے میں پل کر جواں ہوئے
پڑھ لکھ کے سوئے منزلِ پیری رواں ہوئے

ہم کو تو محفلوں میں بھی تنہائیاں ملیں
چہروں کی آرزو تھی، سو پرچھائیاں ملیں

جو فلم ہم نے دیکھی ہے دنیا کے ہال میں
تم بھول کے بھی دیکھو نہ خواب و خیال میں

تم سے ادا ہو رسمِ کہن باقیات کی
تم واقعی مثال ہو اخلاقیات کی

"ہمدرد" بھی یہی ہو، "یونیسکو" بھی ہو یہی
لیکن تمھاری زیست کی اقدار ہوں نئی

گزریں فضائے امن و اماں میں تمھارے دن
بچّو! تمھاری نسل ہو ایک نسلِ مطمئن

ہم نے مشاعرے پڑھے تیغوں کے سائے میں
تم شعر یوں نہ پڑھنا غزل کی سرائے میں

زندہ ہیں ہم ہراسِ مسلسل کے درمیاں
تم جب جواں ہو جینے کے لائق ہو یہ جہاں

آئے خوشی تمھارے قدم چومتی ہوئی
تم کو حیاتِ تازہ ملے جھومتی ہوئی

پاکستانی ہاکی ٹیم زندہ باد

آج کتنی خوشی کا دن ہے۔ آج پاکستان کا بچّہ بچّہ نازاں ہے کہ لاس اینجلز اولمپک کھیلوں کے ہاکی فائنل میں پاکستانی ٹیم نے کام یابی حاصل کی۔ اولمپک چیمپین بن جانا بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس کام یابی پر پوری پاکستانی قوم خوش ہے اور پاکستانی ٹیم کے باصلاحیت اور باہمّت کھلاڑیوں کو دُعائیں دے رہی ہے۔ خدا اس ٹیم کو اور کام یابیاں عطا کرے۔

اس کام یابی پر پاکستانی ٹیم کے نوجوانوں اور ان کے پُرعزم کپتان کے علاوہ ہاکی فیڈریشن، پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن، اس کے سربراہ اور مجموعی طور پر پوری قوم مبارک باد کی مستحق ہے۔ کسی پاکستانی کی کام یابی دراصل پوری پاکستانی ملّت کی کام یابی ہوتی ہے۔ کوئی پاکستانی اچھا کام کرتا ہے تو پاکستان کا نام روشن ہوتا ہے۔ کوئی سائنس داں، کوئی عالم، کوئی پروفیسر، کوئی حکیم، کوئی ڈاکٹر، کوئی ایڈیٹر، کوئی تاجر، کوئی لیڈر، کوئی کھلاڑی اگر نمایاں اور قابلِ فخر کام کرے تو وہ گویا قوم اور ملک کی خدمت کرتا ہے اور اس کی عزت بڑھاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ ملک و قوم کو بھی اس کی قدر کرنی چاہیے۔ دراصل کسی بھی قوم کا کوئی فرد کوئی بڑا کام، اچھا کام یا قابلِ فخر کام انجام نہیں دے سکتا، جب تک کہ قوم مناسب حالات پیدا نہ کرے۔ اگر قوم قدر دان نہیں ہے، اگر قوم ہمّت نہیں بڑھاتی، اگر قوم انصاف نہیں کرتی تو اس قوم کا کوئی آدمی بڑا نہیں بن سکتا، عظیم کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔

آج پاکستانی ٹیم کی عظیم کام یابی جہاں ہمیں مسرت اور خوشی کے لمحات عطا کر رہی ہے وہاں یہ سبق بھی دے رہی ہے کہ ہم اگر جانب داری نہیں برتیں، انصاف کریں، محنت اور خدمت کی قدر کریں اور دل بڑھائیں تو ہمارے کھلاڑیوں کو ہمیشہ ایسی ہی بلکہ اس سے بڑھ کر فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ اور کھیل پر ہی کیا منحصر ہے ہر میدان میں، علم و سائنس میں، تجارت میں اور سیاست میں بھی شان دار اور قابلِ فخر کامرانیاں اور نیک نامیاں حاصل ہوں گی۔

ہماری تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ جب ہم نے اسلام کے اعلا اصولوں پر عمل کیا، اتحاد و اتفاق سے رہے، آپس میں تعاون کیا تو ہم نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ آج بھی یہی اسپرٹ ہمیں ترقی و عروج کے آسمان پر پہنچا سکتی ہے۔

ادارہ ہمدرد نونہال اپنے کھلاڑیوں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہے۔

مُسکراتی تحریریں

مشہور مزاح نگاروں کی تحریروں کے خوب صورت ٹکڑے

جانوروں کی بولیاں

شفیق الرحمٰن

جنگلوں میں ایک سائیں جی ملا کرتے تھے جن سے بہت متاثر ہوا، کیوں کہ انھیں پرندوں جانوروں کی بولیاں سمجھنے کا فن آتا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کچھوا کئی سو برس تک زندہ رہتا ہے۔ سائیں جی نے دو کچھوؤں کو جو میاں بیوی معلوم ہوتے تھے آہستہ آہستہ چلتے دیکھا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا، "سُن لیا بابا، سُن لیا، تم نے میری زندگی کے ڈھائی تین سو سال تو ضائع کر دیے ہیں، اب اور کیا چاہتی ہو۔"

پھر ایک دن سرحد پر ڈاکوؤں اور پولیس کی آپس میں شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ صحرائی ہرن پہلے تو ڈر کر چھپتے رہے، پھر ایک سینیئر ہرن نے ہمت کر کے حالات کا معائنہ کیا اور سارے ہرنوں سے بولا، "خواتین و حضرات! آپ اطمینان سے گھاس کھائیے۔ آج یہ ہمیں مارنے نہیں بلکہ ایک دوسرے کو شُوٹ کرنے آئے ہیں۔"

سائیں جی نے ان لوگوں کے قصّے بھی سُنائے جو پہلی مرتبہ گاؤں آتے ہیں۔ ایک بیل کھیت میں جگالی کر رہا تھا۔ شہر سے کچھ لوگ پک نِک منانے آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے نعرہ لگایا، "پتا نہیں اس جانور کے منھ میں چیونگ گم کس نے ڈال دی!" اسی طرح ایک روز سائیں جی نے دو اونٹوں کا مکالمہ سُنا۔ ایک اونٹ اپنے دوست سے کہہ رہا تھا، "ایک مرتبہ شدید سردی میں میرے مالک کے کھیتوں پر شہری مہمان آئے۔ علی الصباح ایک اناڑی نے مجھ پر سواری کی کوشش کی اور میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ جب اُسے کامیابی نہ ہوئی تو میرے کان، ماتھا، گردن، کوہان ٹٹول کر آخر ہار مان گیا اور اُترتے ہوئے بولا، "آج تو اتنی سردی ہے کہ اونٹ بھی اسٹارٹ نہیں ہو رہا، یہاں تک

کہ اس کا اسٹارٹر بھی نہیں مل رہا۔" اسی طرح ایک دن سائیں جی نے اپنے ڈیلمیشن کو ڈانٹ دیا۔ (ڈیلمیشن کُتّے کی ایک نسل ہے جس کے کتّے کافی بڑے اور چتکبرے ہوتے ہیں۔) سائیں جی کی ڈانٹ پر کُتّے نے بُردباری سے بھونکتے ہوئے یہ جواب دیا، "آپ دن بھر بلا وجہ مجھے بھگا بھگا کر اس قدر ہلکان کر دیتے ہیں کہ میں رات کو پہرا دینے کے قابل نہیں رہتا۔ دراصل آپ کو کتّے کی صحیح ترکیبِ استعمال نہیں معلوم۔ دوسری شکایت مجھے یہ ہے کہ آپ کے کچھ ملاقاتی مجھے ایسا سفید کتّا سمجھتے ہیں جس پر سیاہ دھبّے پڑے ہوں۔ باقیوں کا خیال ہے کہ میں دراصل کالا کتّا ہوں جس پر غلطی سے سفید چھینٹے ڈال دیے گئے ہوں۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں اعلا درجے کا ڈیلمیشن ہوں، جو حادثاتِ زمانہ سے جاہلوں میں آپھنسا ہوں۔"

مرسلہ: طاہر جاوید، کراچی

نگری نگری
مشتاق احمد یوسفی

مرزا کوئٹہ کی فوقیت یکے بعد دیگرے دنیا کے دوسرے شہروں پر ثابت کرنے لگے۔

لاہور: کیلنڈر سے اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینے خارج کر دیے جائیں تو

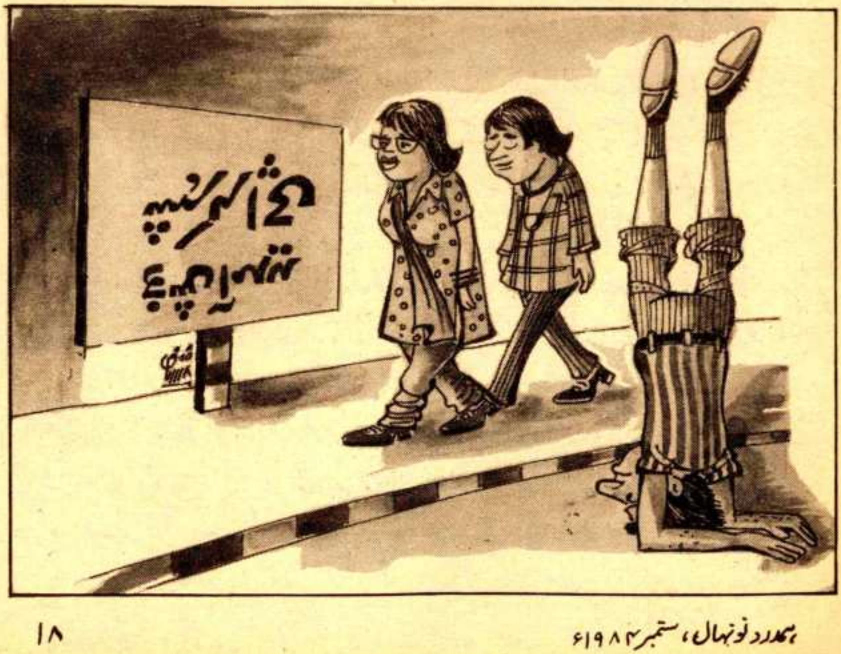

واللہ لاہور کا جواب نہیں۔

مری: ملکۂ کہسار مری۔ صاحب، جلوہ گری میں کوئٹہ سے کم نہیں ؎

وہی نقشہ ہے وے اس قدر آباد نہیں

اور دلّی: شہر بُرا نہیں، مگر غلط ملک میں آباد ہے۔

جینوا: صحت گاہِ عالم۔ صاحب، مرنے کے لیے اس سے زیادہ پُر فضا مقام روئے زمین پر نہیں۔

کراچی کے بارے میں کیا رائے ہے حضور کی؟

"بہت اچھی۔ اگر آپ سر کے بَل کھڑے ہو کر دیکھیں تو کراچی کی ہر چیز سیدھی نظر آئے گی۔" پھر کوئٹہ کی برتری ثابت کرتے کرتے بے دھیانی میں کہنے لگے "ہائے، یہ عظیم شہر کراچی میں ہوتا تو کیا بات تھی۔"

مرسلہ: عائشہ عنبرین، کراچی

صحت کا خیال — ابنِ انشا

صحت کا خیال چینیوں کو اس حد تک رہتا ہے کہ وحشت ہوتی ہے۔ ہم ایسے آرام طلبوں کا تو وہاں جینا حرام ہو جائے۔ ورزش ہر کوئی روز کرتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ڈھاکے کے رہنے والے سڑکوں پر اتنا تھوکتے ہیں کہ ڈھاکا میونسپلٹی کو ایک الگ داروغہ صفائی رکھنا پڑا ہے۔ جہاں یہ جاتے ہیں وہ سی آئی ڈی کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ اُن کو وہاں (چین میں) بڑی تکلیف ہوئی۔ وہاں یہ رواج نہیں۔ نہ اجازت ہے۔ پانی اُبال کر پیتے ہیں۔ موبل آئل وہاں گاڑیوں میں ڈالا جاتا ہے، اصلی یا بناسپتی گھی کہہ کر فروخت نہیں کیا جاتا۔ بھٹے کی اینٹیں بھی مکان بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، ہلدی اور مرچ میں ملا کر اُن سے تعمیرِ معدہ کا کام نہیں لیا جاتا۔ وہاں دودھ بھی گایوں بھینسوں کا ہوتا ہے، تالابوں یا کمیٹی کے نلکوں سے حاصل نہیں کیا جاتا۔

مرسلہ: شبانہ انجم، خیر پور میرس

میں بھی کیا ہوں — شفیق الرحمٰن

ایک مرتبہ ایک بڑے فلاسفر کسی حجام کی دُکان پر حجامت کرا رہے تھے۔ دفعتہً کوئی سڑک پر

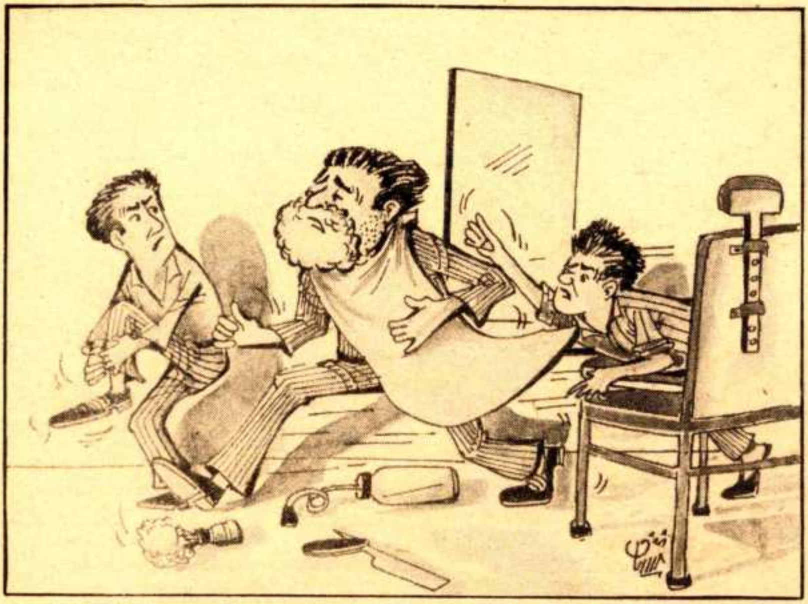

چلّایا" میاں عبد القدوس صاحب! میاں عبد القدوس صاحب! آپ کے مکان کو آگ لگ گئی۔"

وہ تڑپ کر اُٹھے۔ حجام کو پرے دھکیلا۔ گلے کا سفید کپڑا ایک طرف دے مارا۔ چہرے کا صابن ایک اور صاحب پر پھینکا۔ دو گاہکوں سے بُری طرح ٹکرائے۔ سڑک پر کُودے، پھسلے، گرے، پھر اُٹھے، ایک دہی بڑے والے سے ٹکرائے۔ اُچھل کر بھاگے، کچھ دُور جا کر رُک گئے اور سر کھجانے لگے،" پھر شرمندہ ہو کر بولے: "اُفوہ! میں بھی کیا ہوں، بھلا میرا نام عبد القدوس کہاں ہے؟" مرسلہ: سلیم احمد سلیمی، لاڑکانہ

سیّاحوں کی ضروریات

ابنِ انشا

دنیا کا کون سا شہر ہے جہاں قابلِ دید چیزیں نہیں۔ ہم دکھانے پر آئیں تو کراچی میں بھی بہت کچھ دِکھا کر سیّاح کو حیران کر سکتے ہیں۔ اگر تاریخی آثار، محلات اور باغات کی قبیل کی کوئی شے نہیں تو اونٹ گاڑی تو ہے۔ پھر محلات اور باغات تو ہر پرانے شہر میں مل جاتے ہیں، لیکن اونٹ گاڑی تو بغداد، ایتھنز، قاہرہ وغیرہ میں چراغِ رُخِ زیبا لے کر ڈھونڈیں تب بھی نہ ملے گی۔

لاہور میں بھی کئی مقاماتِ دیدنی ہیں۔ مُغلیہ خاندان کے دُور اندیش حکم رانوں نے کیمرے اور دُوربین لے کر یورش کرنے والے سیاحوں کی ضرورت کا اندازہ پہلے ہی سے کر لیا تھا۔ ایک بادشاہ قلعہ بنا گئے اور اس کے در و دیوار پر شیشے، کانچ وغیرہ لگا گئے کہ دیکھو اور حیرت کرو۔ ایک اور بادشاہ نے ایک اونچی سی مسجد بنا دی تاکہ جس کو مسجدیں دیکھنے کا شوق ہو، لال رنگ کی شاہی مسجد دیکھ لے۔ کچھ سیاحوں کو فاتحہ پڑھنے اور شاعروں وغیرہ کے مزار دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ ان کی سہولت کے لیے قوم نے علّامہ اقبال نام کے ایک بڑے شاعر کو مار کر عین مسجد اور قلعے کے درمیان دفن کر دیا تاکہ کم فرصت سیاح سب کچھ ایک جگہ دیکھ کر واپسی کے لیے جہاز پکڑ سکیں۔ مزید دل چسپی کے لیے ملکہ نور جہاں نے بھی یہاں مرنا اور مزار بنوانا پسند کیا۔ اِدھر باغبان پورے کی طرف جگہ خالی تھی، جھگیاں وغیرہ ابھی نہیں پڑی تھیں، نہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی والوں نے بورڈ لگایا تھا تو وہاں ایک باغ بنا دیا گیا اور بیچ میں کچھ درخت لگا کر چوبچے وغیرہ بنا دیے۔ یہ شالامار باغ ہو گیا۔

مرسلہ: صلاح الدین احمد کامران، کراچی

کرکٹ نامہ

مسعود مفتی

ہم نے جان چھڑانے کے لیے ٹیلے فون کے لیے دفتر سے نمبر ملایا۔ "ہیلو! بجلی والوں کے انکوائری آفس کا نمبر کیا ہے؟" اس نے نمبر بتایا تو ہم نے ملایا۔ جیسے ہی اُدھر سے کسی نے ریسیور اُٹھایا، ہم نے کہا، "ہیلو!"

جواب آیا، "پاکستان فور ہنڈرڈ فار فور۔"

عرض کیا، "بھائی، خدا کے لیے اسکور رہنے دو اور ہماری بجلی آ کر ٹھیک کر دو۔"

بولے، "تو خدا کے لیے آپ بجلی والوں کو فون کریں۔"

پوچھا، "آپ کون ہیں؟"

"پاکستان ٹائمز کا کرکٹ انکوائری آفس۔"

ہم نے ٹیلے فون والوں سے احتجاج کیا کہ انھوں نے غلط نمبر کیوں دیا تو وہاں سے لڑکی بولی، "آپ نے غلط نمبر کیوں لیا۔ جب کہ آج ساری دنیا صرف کرکٹ انکوائری آفس کا نمبر پوچھ رہی ہے۔"

مرسلہ: زیبا تقی حسین، کراچی

تم کھانستے رہو

شفیق الرحمٰن

"اگلی ملازمت ایک نواب صاحب کے ہاں کی۔ تیسرے چوتھے روز ہی یہ پتا چل گیا کہ انھیں مبالغے کی عادت ہے۔ شکاری کے لیے انھوں نے اشتہار بھی یوں دیا تھا: "نواب صاحب کے لیے جو خود بلند پایہ شکاری ہیں، ضرورت ہے ایک نوعمر، چُست، پھُرتیلے شکاری کی جسے کم از کم ساٹھ سال کا تجربہ ہو۔" جب گھُڑ دوڑ ہارتے تو بڑے فخر سے بتاتے: "میں تو ہمیشہ سب سے بہادر اور نڈر گھوڑے پر شرط لگاتا ہوں، جو بقیہ گھوڑوں کو آگے لگا کر ان کا خوب تعاقب کرتا ہے۔"

ایک روز میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ اپنی عمر اور رُتبے کو دیکھتے ہوئے اس مبالغہ آرائی پر کچھ کنٹرول ہونا چاہیے۔ بولے: "میاں، تم ٹوک دیا کرو۔" میں نے کہا، سب کے سامنے اچھا معلوم نہیں ہوتا تو کہنے لگے: "اشارہ کر دینا، میں سمجھ جاؤں گا۔" اگلے روز انھوں نے کسی مگر مچھ کا ذکر شروع کیا کہ رعایا نے درخواستیں دیں کہ ہمیں اس ظالم اور خوں خوار مگر مچھ سے نجات دلائیے، جو پچاسی فیٹ لمبا ہے اور انسان اور حیوان کی تاک میں رہتا ہے۔ اس پہ میں آہستہ سے کھانسا تو فرمایا: "ہم نے آدمی بھیج کر پتا کرایا تو معلوم ہوا مگر مچھ پچھتر فیٹ لمبا تھا۔" میں پھر کھانسا تو فرمایا: "ہم نے سوچا، سُنی سنائی باتوں کا کیا اعتبار، خود جا کر دیکھتے ہیں۔ موقع پر پہنچ کر ایک اُونچے سے ٹیلے سے ملاحظہ فرمایا تو پینسٹھ فیٹ لمبا لگا۔" میں نے پھر گلا صاف کیا تو بولے: "ہم نے اپنی پسندیدہ بندوق تھامی جو عمر میں ہم سے چار پانچ برس بڑی ہوگی اور مگر مچھ کے قریب پہنچے تو اس کی لمبائی کم از کم پچپن فیٹ معلوم ہوتی تھی۔ میں پھر کھانسا تو گویا ہوئے: "ہم نے شُست لی اور تقریباً پچیس تیس فائروں سے اُسے ہلاک کر ڈالا اور فوراً نپوایا۔ مگر مچھ پینتالیس فیٹ لمبا نکلا۔" میں نے کھانسنے کی کوشش کی ہی تھی کہ انھوں نے فوراً ٹوک دیا، "میاں تم کھانستے رہو، اب نپ چکا ہے۔"

مرسلہ: عمران فیروز خلجی، ناظم آباد

زہر شناس پرندہ

سلطان محمود احمد غزنوی کو ایک بادشاہ نے تحفے کے طور پر ایک ایسا خاص پرندہ بھیجا تھا جو کھانے میں شامل زہر شناخت کر لیتا تھا۔ زہر آلود کھانے کے قریب اس پرندے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے اور آنسوؤں کا پانی نیچے گرتے ہی پتھر بن جاتا تھا۔

مرسلہ: محمد عباس، کراچی

خوشی اور اطمینان

ملّا واحدی

زندگی کی ضروریات نہ رُکیں اور جسم جن عناصر سے مرکب ہے اُن میں اعتدال رہے تو ایسی خوشی محسوس ہوتی ہے جیسے دِل کی کلی کھل رہی ہے، لیکن یہ خوشی کی ایک قسم ہے۔ اس کے لیے خوشی کے بجائے لفظ انبساط استعمال کیا کرتے ہیں۔

ضرورتوں کے رُک کر پورا ہونے اور بیمار پڑ کر صحت پانے سے بھی خوشی کی لہر دوڑتی ہے بلکہ راحت کی قدر وہی خوب جانتا ہے جو تکلیف میں پھنس چکتا ہے۔ اُس کی حصولِ مسرت کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔

خوشی کے حصول کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ہر شخص اپنی طبیعت کے مناسب چیزوں اور باتوں سے خوش ہوتا ہے۔ خوشی کے لیے طبیعت کی مناسبت لازمی چیز ہے۔ بعض آدمی تاش کھیلنے یا پتنگیں لڑانے میں سارا دن گزار دیتے ہیں اور مگن رہتے ہیں۔ بہت سے آدمیوں کو صبح سے شام تک محنت کرنے میں مزا آتا ہے۔ طبیعتوں میں کتنا فرق ہو گیا۔ دن بھر تاش کھیلنے والا اور پتنگیں لڑانے والا کام کے نام سے گھبراتا ہے اور کام کرنے والا تاش کھیلنے اور پتنگیں لڑانے پر لعنت بھیجتا ہے۔

مناسبت طبع کے علاوہ دوسری شرط خوشی کے حصول کی اچھی ذہنیت ہے۔ ذہنیت اچھی نہیں ہے تو صحیح خوشی کبھی حاصل نہیں ہوگی، اور مجرمانہ ذہنیت کے لوگ تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خوشی ہے کیا شے۔ وہ اپنے حسابوں میں کام یاب بھی ہو جائیں اور اُنھیں اُن کی طبیعت کا مانگا سب کچھ مل جائے تب بھی حقیقی خوشی اُن کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اُنھیں مگن کہنا بس ایسا ہی ہے جیسے کسی کنیز کو بیگم کہہ دینا۔

سچّی بات تو یہ ہے کہ خوشی نام ہے اطمینانِ قلب کا۔ مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں کو اطمینانِ قلب کہاں نصیب۔ اطمینانِ قلب پھانسی کے تختے پر موجود ہو تو انسان خوش رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ حق کے لیے جان دے رہا ہوں۔ اطمینانِ قلب حوصلوں کو پست، ارادوں کو سُست اور توقعات کو متزلزل کر لینے سے نہیں ملتا۔ سخت سے سخت اذیت برداشت کر لینے سے ملتا ہے۔ اطمینانِ قلب محنتوں اور کلفتوں سے حاصل کی ہوئی راحت میں پوشیدہ ہے۔ اطمینانِ قلب نہ ہو تو عیش و عشرت کے سامان انسان کو خوش

نہیں کر سکتے۔ حقیقی خوشی فقط اُنھیں حاصل ہوتی ہے جو اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ آگاہ رہو کہ اطمینانِ قلب اللہ کا بندہ بن جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اُس کا ذکر کرنے سے، اُس کے احکام ماننے سے، اُس کے قوانین کی پیروی کرنے سے۔ (سورہ ۱۳۔ آیت ۲۸) خوشی حاصل کرنے کا یہ نسخہ اللہ کا تجویز کردہ ہے، اس میں ردّوبدل ممکن نہیں ہے۔

انسان جو کام کرتا ہے وہ اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اطمینانِ قلب جس خوشی میں نہ ہو اُسے خوشی سمجھنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ جو حضرات محنت کر کے جائز طریقوں سے رُپیہ کماتے ہیں اور رُپیہ کما کر اِترا نہیں جاتے، مغرور اور متکبّر نہیں ہو جاتے، بلکہ کماتے اس نیت سے ہیں کہ رُپیہ اُن کاموں میں خرچ کریں گے جن سے عقبیٰ سنورے، غریبوں پر ترس کھاتے ہیں، اُنھیں سہارا دیتے ہیں، ناتوانوں کی دست گیری کرتے ہیں، نیم جانوں سے دُعائیں لیتے ہیں، وہ چاندی سونے ہی کی دولت سے نہیں، اطمینان کی دولت سے بھی مالامال ہیں۔

محمد ہاشم تاجر سرمہ

عید گاہ - ایم اے جناح روڈ کراچی - فون: 216684

قائم شدہ 1794ء

ایک محسنہ کے نام

مسعود احمد برکاتی

اے میری رفیقہ!

تُو میری عمر بھر کی ساتھی ہے، میں جس لمحے اس دنیا میں آیا اُسی لمحے سے تُو نے میری خدمت شروع کر دی۔ وہ دن اور آج کا دن ہے تُو نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میری زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جس میں، میں تجھ سے بے نیاز ہوا ہوں۔

تُو میری خدمت کرتی ہے، دن رات بے عُذر خدمت کرتی ہے، پھر بھی شور نہیں مچاتی، چُپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہتی ہے۔ آواز نکالتی بھی ہے تو اتنی مَدّھم اور مُدّھر کہ مجال ہے جو کسی کے سکون میں خلل پڑے۔ دن کے ہنگاموں اور شور و شغب میں تو تیری ننھی آواز سُننا بھی مُحال ہے، رات کے پُرسکون اور خاموش لمحوں میں البتہ کوئی کان لگائے تو وہ ایک ایسی صدا سُن سکتا ہے جو کسی موسیقی سے کم فرحت انگیز نہیں۔ تیری آواز ہلکے سُروں میں نکلتی ہے، لیکن اس میں بڑی طاقت ہے، بڑی جان ہے۔ تیری آواز سوتوں کو جگا دیتی ہے، دِلوں کو ہلا دیتی ہے۔ کاہلوں کو دوڑا دیتی ہے۔ تیری آواز میں جادو ہے کہ ہر آدمی پر اثر کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بچپن میں تیری قدر نہیں معلوم ہوتی، جوانی میں تجھ سے لگاؤ ہو جاتا ہے، لیکن صرف اتنی دیر کے لیے جتنی دیر کسی کے انتظار میں گزرے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور تیری ضرورت بھی ختم۔ جوانی جیسے جیسے اپنے قدم بُڑھاپے کی طرف بڑھاتی جاتی

ہے، تیری ضرورت کا احساس زیادہ ہونے لگتا ہے اور تیری یاد ستانے لگتی ہے، پھر آدمی چاہتا ہے کہ تُو کسی لمحے اُس سے جُدا نہ ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گھبرا کر تیری طرف دیکھتا ہے اور پھر گردن جُھکا کر اپنی حالت پر غور کرنے لگتا ہے اور آنے والے کل کے خیال میں کھو جاتا ہے۔

مگر تُو بڑی وضع دار ہے۔ انسان بچپن میں کچھ ہوتا ہے، جوانی میں کچھ اور بُڑھاپے میں کچھ، لیکن تیری وضع میں فرق نہیں آتا۔ تیرا رویّہ ہمیشہ یک ساں رہتا ہے تُو ہر وقت اور ہر عمر میں تعاون کے لیے تیار رہتی ہے۔ تیری طرف بچّہ رجوع کرے یا بوڑھا تُو ہمیشہ صحیح اور سچّی بات کرتی ہے۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتی۔ یہ اور بات ہے کہ جو آدمی خود ہی دھوکا کھانا چاہے وہ تیرے قُرب سے گھبراتا ہے۔ تُو چاہے اس کے پہلو میں ہو یا اس کے بازو پر، لیکن وہ تجھ سے نظریں چُراتا ہے۔ تیری خاموش صداؤں کو بھی سُننا نہیں چاہتا۔ غفلت کی مدہوشی اس کو تیری راہ نمائی سے دُور رکھنا چاہتی ہے، لیکن تُو پھر بھی اس کے کام آتی ہے۔ دیر سویر وہ تجھ سے نظریں چار کرتا ہے اور تیری پیشانی کی تحریر پڑھ کر سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اے میری بے زبان دوست!

مجھ پر تیرے بہت سے احسانات ہیں۔ تُو نے مجھے بہت سے نقصانات سے بچایا۔ تُو نے مجھے گزرنے والی عمر کا احساس دلایا۔ تیری وجہ سے میں مہذّب کہلایا۔ تیری وجہ سے میں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام میں لایا۔ تُو نے مجھے صبح و شام کا فرق بتایا۔ تُو نے مجھے دن رات میں تمیز سکھائی۔ تُو نے مجھے دِنوں مہینوں اور برسوں کا شمار سکھایا۔

تُو نے مجھے ماضی حال مستقبل کا احساس دلایا۔ تُو نے ہی مجھے تاریخ کا شعور بخشا۔ تُو نے مجھے گزری ہوئی عمر کی غفلتوں پر پشیمان کیا۔ دوریِ منزل کا احساس دِلا کر مجھے تیز رفتاری بخشنے والی بھی تُو ہی ہے۔

اے میری محسنہ!

میں جب سے تیری محبت میں مبتلا ہوا، عشق کا نشہ ہرن ہوا اور زندگی کی چاہت نے میرے وجود کو روشنی بخشی۔ جب سے میں نے تجھ پر پیار کی نگاہیں ڈالنی شروع کیں، مجھ میں زندگی کی لہریں موجیں مارنے لگیں۔ جب سے میں نے تیرا کہا مانا دنیا میں میرا اعتبار بڑھا۔ لوگوں کی نظروں میں بڑی وقعت بڑھ گئی۔ جب تک میں تیری آواز پر کان نہیں دھرتا تھا سب کے پیچھے تھا، میں زمانے کی تیز قدمی کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن جب سے میرے کانوں نے تیری سُریلی آواز کو پہچانا ہے، میں دنیا میں سب سے آگے ہوں۔ اب میں پھسڈی نہیں کہلاتا بلکہ دنیا نے مجھے اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ زمانہ میرے پیچھے چلتا ہے اور فخر محسوس کرتا ہے۔ تُو نے میری قیمت بڑھائی۔ پہلے میں قیمت لیے بغیر جینے کے مینے ہر کسی کو بخش دیتا تھا، لیکن اب میرا لمحہ لمحہ قیمتی ہے اور لوگ مجھے میرے ہر منٹ کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ یہ سب تیری یہ دولت ہے۔ تُو ہی میری محسن ہے اے گھڑی!

آپ کی کامیابی
ہماری سربلندی ہے
مسلم کمرشل بینک میں ہم کامیاب کرم فرماؤں کو اپنا
سب سے بڑا اثاثہ سمجھتے ہیں۔ آپ کی کامیابی کے سفر
میں ہماری سہولتیں، خدمات اور مشورے شریک
سفر ہیں۔
آپ چاہے کاروبار سے وابستہ ہوں یا زراعت سے، یا
ہمارے معزز سیونگ اکاؤنٹ ہولڈر ہوں، آپ کی
کامیابی ہماری خدمت کا پیمانہ ہے، اور ہم اس پر نازاں ہیں۔
مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ

سورج کی طاقت

شاداں پرویز

وہ دن دُور نہیں جب ہم پٹرول، بجلی، گیس اور کوئلے کے محتاج نہیں رہیں گے۔ سورج کی طاقت (شمسی توانائی) سے کھانا پکے گا۔ گھر روشن، ٹھنڈے اور گرم ہو سکیں گے۔ کارخانوں کی مشینیں چلیں گی۔ بسیں، کاریں اور ریل گاڑیاں چلنے لگیں گی۔ ہوائی جہاز اور راکٹ اُڑیں گے۔

آپ نے آتشی شیشے کا کھیل تو دیکھا ہو گا۔ ہاں یہ آتشی شیشہ وہی ہوتا ہے جس کو سورج کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس میں سے دھوپ گزر کر ایک خاص نقطے پر آکر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اگر ہم وہاں کوئی کاغذ رکھ دیں تو وہ کاغذ جل جائے گا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ کاغذ کیوں جلا؟ آتشی شیشے کے سامنے کاغذ کے جلنے کی وجہ یہ ہے کہ شیشے سے سورج کی کرنیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں اور جمع ہونے سے ان میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کاغذ کے اس حصّے کو جلا دیتی ہیں جس پر وہ پڑتی ہیں۔ اب آپ لوگ بھی آتشی شیشے سے کاغذ کو جلا کر دیکھیے، مگر دیکھیے اس بات کا خیال رکھیے کہ کہیں آپ آتشی شیشے کو اپنے بدن کے کسی حصّے کے سامنے رکھ کر نہ دیکھنے لگیں ورنہ وہ بھی جلنے لگے گا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سورج کی روشنی میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

ہاں تو اسی طاقت کو ہم استعمال میں لائیں تو اس سے مختلف کام لیے جا سکتے ہیں۔ آج جو بھی کام مٹّی کا تیل، پٹرول، کوئلا، لکڑی اور بجلی سے لیے جاتے ہیں یہ سارے کام سورج کی توانائی سے لیے جا سکتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ اب ہماری زمین کے اندر بہت تھوڑا پٹرول، مٹی کا تیل اور کوئلا رہ گیا ہے اور پٹرول زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس وجہ سے اب ہمیں کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جس سے کہ بغیر پٹرول کے ہمارے جہاز اُڑ سکیں، راکٹ اُڑ سکیں، بغیر بجلی کے ہمارے گھر میں سارے بلب روشن رہیں۔ گرمیوں کے موسم میں کمروں کو ٹھنڈا کرنے

کے لیے کولر چلیں، فریج چلیں، ہمارا تمام کھانا بغیر بجلی یا کوئلے اور لکڑی کے پکے اور بغیر پٹرول یا ڈیزل کے ہماری کاریں چلیں، جو نہ دُھواں دیں اور نہ آواز۔ بغیر کسی ایندھن کے ہماری بسیں اور ریل گاڑیاں چلیں۔ ابھی تو یہ باتیں آپ کو بالکل پرستان کی معلوم ہو رہی ہوں گی، مگر بہت جلدی یہ دن آنے والا ہے، کیوں کہ آج کل ہمارے سائنس داں اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہم سے پہلے ہماری ضروریات معلوم کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو کام بجلی اور پٹرول سے لیے جا رہے ہیں وہ سب سورج کی توانائی سے لیے جائیں گے۔

ویسے یہ بات نہیں ہے کہ ہم سورج کی توانائی سے کوئی کام نہیں لے رہے ہیں۔ سورج کی توانائی کا استعمال تو زمین پر اس دن سے ہو رہا ہے جس دن سے اس پر زندگی شروع ہوئی ہے۔ ہم اپنی بہت سی چیزیں دھوپ میں رکھ کر سُکھاتے ہیں۔ ہم لکڑی سُکھا کر اُسے جلانے کے قابل بناتے ہیں۔ ہمارے کسان اناج کو دھوپ میں سُکھا کر گوداموں میں رکھتے ہیں۔ ہم ہری مرچوں کو سُکھا کر انھیں لال کر لیتے ہیں اور وہ بہت دِنوں تک محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ مگر یہ طریقہ بہت پرانا ہے۔ اب تو سورج کی توانائی سے چلنے والی ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو دو تین دن میں مرچیں سُکھا دیتی ہے۔ زیادہ دن دھوپ میں رکھنے سے بہت سی مرچیں سَڑ گل بھی جاتی تھیں اور ان پر گندگی بھی جم جاتی تھی۔ اس مشین میں نہ کوئلا خرچ ہوتا ہے اور نہ بجلی۔ بس سورج کی روشنی سے سارا کام ہو جاتا ہے۔

پہلے جغرافیہ کے اُستاد پڑھاتے تھے کہ جب بادل پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں تو بارش ہوتی ہے، مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ بارش ہونے میں بھی سورج ہماری مدد کرتا ہے۔ سورج کی گرمی سے سمندر کی اوپری سطح کا پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے اور بادلوں کی شکل لے لیتا ہے۔ پھر جب یہ بادل ٹھنڈے ہوتے ہیں تو پانی کی بوندوں میں بدل جاتے ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ بارش ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ یہ ہماری کھیتی کو بڑا فائدہ پہنچاتی ہے۔

جرمنی کے ایک سائنس داں نے تو ایک ایسا ریڈیو بھی بنایا تھا جو کہ سورج کی گرمی سے چلتا ہے۔ اس میں بیٹری یا بجلی کا تار لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ بجلی سے کام نہیں کرتا۔ اس کو تو سورج کی دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ریڈیو کو چلانے کے لیے بس ایک کام کرنا پڑتا ہے وہ یہ کہ اس ریڈیو کے پچھلے حصّے کو کھول کر دھوپ میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں ایک ایسی چھوٹی

سی مشین لگی ہوتی ہے جو کہ سورج کی گرمی اکٹھی کر کے اپنا کام کرتی ہے۔ یہ مشین بہت چھوٹی ہوتی ہے، بالکل سگرٹ کی ڈبیا کے برابر۔

سورج کی توانائی سے ٹیلے فون بھی لگائے گئے ہیں اور اس سے ٹیلے وژن بھی چلایا گیا ہے۔ اب دھیرے دھیرے سورج کی توانائی کا استعمال عام ہو رہا ہے۔ ہندستان میں بھی ایک سائنس داں نے سورج کی توانائی سے چلنے والا ایک انجن ایجاد کیا تھا اور کھیتوں میں پانی دینے کا ایک پمپ بھی ایجاد ہو چکا ہے۔ اس پمپ کی مدد سے پانی زمین کے اندر سے کھینچا جا سکتا تھا، مگر اس کا استعمال عام نہیں ہوا، کیوں کہ اس طرح پانی کھینچے جانے پر خرچ بہت آتا تھا۔ ویسے اس سے پہلے ہی یہ پمپ مصر میں ایجاد ہو چکا تھا۔ اس سے دریائے نیل کا پانی کھینچ کر دُور دُور کھیتوں میں بھیجتے تھے۔ اس کے بعد امریکا نے بھی اس میں دل چسپی لی اور انھوں نے بھی ایک ایسا پمپ اب سے ستّر سال پہلے بنایا۔

سائنس دانوں نے سورج کی توانائی سے چلنے والی کار بھی ایجاد کی ہے۔ یہ کار نہ دھواں دیتی ہے اور نہ آواز دیتی ہے۔ دھواں یہ اس وجہ سے نہیں دیتی کہ اس میں نہ پٹرول خرچ ہوتا ہے نہ ڈیزل۔ پٹرول سے چلنے والی کاروں سے جو دھواں خارج ہوتا ہے وہ کاربن کہلاتا ہے۔ یہ ہماری فضا کو گندا کرتا اور صحت کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ سورج کی توانائی سے جو کار چلتی ہے اس میں آٹھ بیٹریاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ بیٹریاں کار کی چھت پر لگا دی جاتی ہیں تاکہ سورج کی دھوپ ان پر سیدھے طور پر پڑے۔ یہ بیٹریاں سورج کی روشنی میں چارج ہوتی رہتی ہیں مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کاریں رات کو نہیں چلتی ہیں۔ یہ بیٹریاں جو اس کار میں لگتی ہیں شمسی بیٹریاں کہلاتی ہیں۔ یہ بیٹریاں سورج کی روشنی سے اتنی طاقت کھینچ لیتی ہیں جس سے وہ کار اُس وقت بھی چلتی ہے جب دھوپ نہیں ہوتی اور ہم رات کو بھی کار چلا سکتے ہیں۔

سورج کی توانائی سے جاڑوں میں گھروں کو گرم کرنے کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ مگر اس کے لیے خاص طرح کے گھر بنانے چاہییں۔ یہ گھر پانی کے تالاب میں تیرتے ہیں اور اُن کی چھت پر ایک شیشہ لگا ہوتا ہے جو کہ سورج کی طرف رہتا ہے۔ گھر کی چھت اپنے اندر حرارت کو جذب کرتی رہتی ہے اور اس سے گھر گرم رہتا ہے۔ اس میں نہ بجلی خرچ ہوتی اور نہ ایندھن خرچ ہوا۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سورج کی توانائی بالکل مفت ہی پڑے گی۔ نہیں، اس کا حاصل کرنا آسان نہیں

ہے۔ جس طرح پٹرول زمین میں ہوتا ہے۔ اُس کے دریا بہتے ہیں، لیکن زمین سے اس کو نکالنا آسان نہیں ہے۔ اس پر خرچ بھی بہت آتا ہے۔ مزدور اُسے نکالتے ہیں اور پھر اُسے دُور دُور پہنچایا جاتا ہے۔ یہی سورج کی توانائی کا بھی معاملہ ہے۔ دیکھنے میں تو مفت لگتی ہے، لیکن اسے استعمال کرنے کے لیے جو بھٹّیاں بنائی جائیں گی اُن پر بڑا خرچ آئے گا۔ ہمارے سائنس دانوں کو یہ بات بہت پہلے سے معلوم تھی کہ سورج کی توانائی سے کتنے کام لیے جا سکتے ہیں، لیکن انھوں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی، کیوں کہ اس وقت دوسرے ایندھن بہت سستے تھے۔ لیکن اب یہ بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر اس پر ایک بار رُپیہ خرچ کر دیا گیا تو پھر یہ ہمیں بہت سستی پڑے گی۔

اب ہم کو اندازہ ہو رہا ہے کہ سورج کی توانائی کے استعمال کا زمانہ بہت جلد آنے والا ہے اور ہم روز بہ روز اس کے قریب آتے جا رہے ہیں۔ روز پتا چلتا ہے کہ سورج کی توانائی سے چلنے والی کوئی اور نئی چیز ایجاد ہو گئی۔ اس سے ٹیلے فون لگائے گئے ہیں۔ ٹیلے وژن چلائے گئے ہیں۔ کولر اور ایر کنڈیشنر چلائے گئے ہیں۔ چولہے اور کاریں بنی ہیں۔ ہوائی جہاز اور راکٹ اُڑائے گئے ہیں۔ ریل گاڑیاں چلائی گئی ہیں۔ مگر ابھی تک یہ چیزیں عام نہیں ہوئی ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بہت جلدی سورج کی توانائی عام ہو جائے گی اور دنیا کے بہت سے ملک اس کو استعمال کرنے لگیں گے۔ سورج کی توانائی سے ہمیں بہت سی آسانیاں ہوں گی اور دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔ آیئے ہم اور آپ بھی اس دور کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ (پیامِ تعلیم کا شکریہ)

مگر اہلِ علم کی مجلس

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضورؐ مسجد میں تشریف لائے۔ وہاں دو مجلسیں منعقد تھیں۔ ایک مجلس کے لوگ عبادت و دُعا میں مصروف تھے اور دوسری مجلس میں علمی گفتگو ہو رہی تھی۔ حضور نے فرمایا، "دونوں مجلس بھلائی پر ہیں، مگر اہلِ علم کی مجلس دوسری سے بہتر ہے اور میں بھی مُعلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

چناں چہ آپؐ انھی میں تشریف فرما ہوئے۔

مرسلہ: معز الدین کامران، کراچی

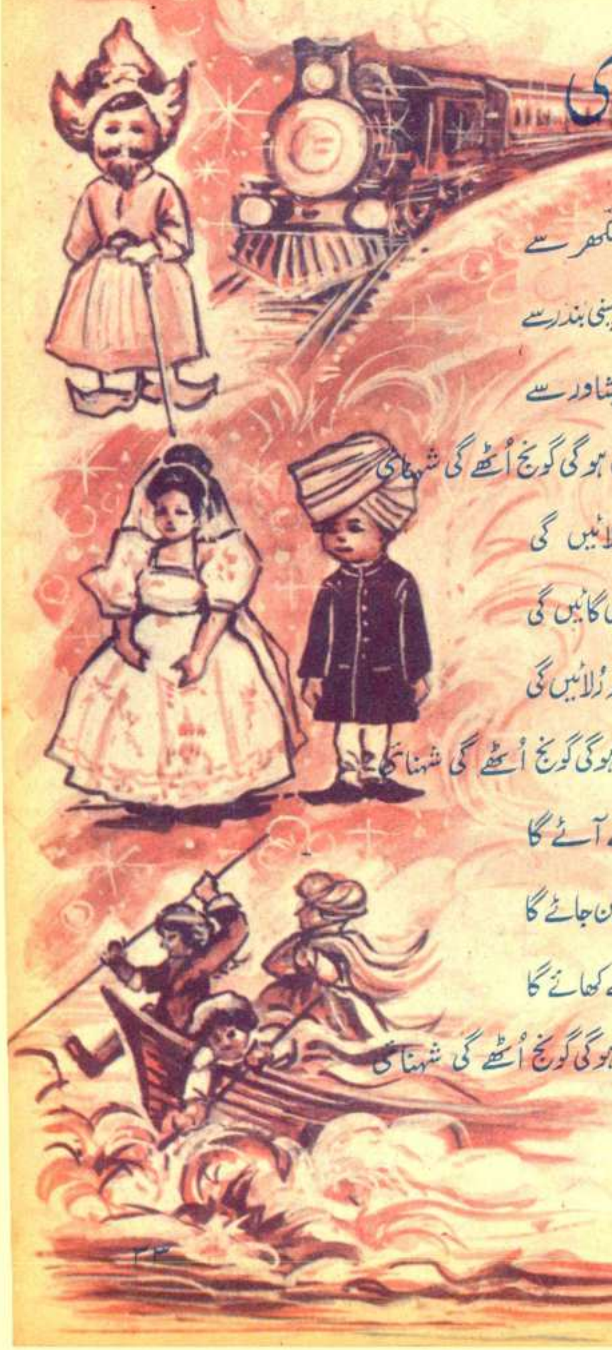

گُڑیا کی شادی

قمر ہاشمی

گُڈّو آیا مُنّو آیا، آیا لڈّن سکھّر سے
اسلم، اکرم دونوں آئے لانچ میں بِنی بندر سے
تاج، ثمینہ ریل میں آئیں کتنی دُور پشاور سے
کل گُڑیا کی شادی ہو گی گونج اُٹھے گی شہنائی

شمّی، رِفعت اپنے اپنے مہمانوں کو لائیں گی
گُڑیا سج کر بیٹھے گی سکھیاں بابُل گائیں گی
گُڑیا رُخصت ہو جائے گی امّی سب کو رُلائیں گی
کل گُڑیا کی شادی، ہو گی گونج اُٹھے گی شہنائی

داڑھی مُونچھ لگا کر گُڈّو لکڑی ٹیکے آئے گا
گُڑیا کی شادی میں گُڈّو قاضی جی بن جائے گا
گُڈّو موتی چُور کے لڈّو سب سے پہلے کھائے گا
کل گُڑیا کی شادی ہو گی گونج اُٹھے گی شہنائی

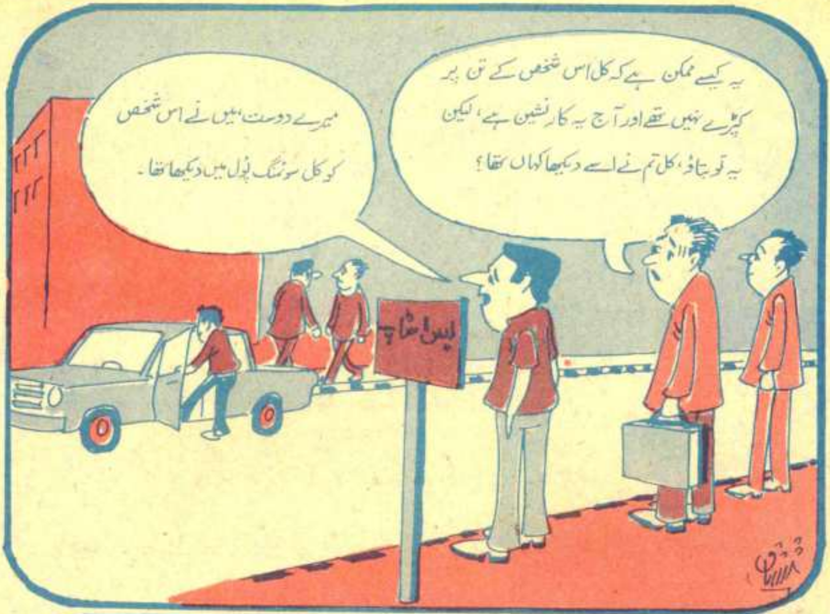
یہ کیسے ممکن ہے کہ کل اس شخص کے تن پر کپڑے نہیں تھے اور آج یہ کار نشین ہے، لیکن یہ تو بتاؤ، کل تم نے اسے دیکھا کہاں تھا؟
میرے دوست، میں نے اس شخص کو کل سوئمنگ پول میں دیکھا تھا۔
بس اسٹاپ

"خاتون، گم شدہ خاوند کی رپورٹ یہاں لکھوانے سے بہتر تھا کہ آپ پہلے اخبار میں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار چھپواتیں۔"
"تھانیدار صاحب، میں نے بھی یہی سوچا تھا، لیکن پھر خیال آیا کہ وہ نظر کا چشمہ بھی تو ساتھ نہیں لے گئے۔"

جوتوں کا تماشا

معراج

سردیوں کا موسم تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا، لیکن ایک گھر میں خوب رونق تھی۔ وہاں دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ اس وقت ایک دل چسپ بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک ڈاکٹر صاحب مغلیہ دورِ حکومت کی تعریف میں دلیل پر دلیل پیش کر رہے تھے۔ میزبان موجودہ زمانے کی ترقی، آرام اور آرائش پر بحث فرما رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "مغلیہ دَور میں لوگوں کو جو خوش حالی، آرام اور سکون میسر تھا وہ آج کل کے زمانے میں لوگوں کو حاصل نہیں ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں مغلیہ دور میں پہنچ جاؤں۔"

اتفاق سے وہاں تقدیر اور تدبیر کا گزر ہوا۔ تقدیر یہ مُباحثہ سُن کر ہنسی اور تدبیر سے بولی، "انسان کی فطرت بھی عجیب ہے۔ کبھی کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ اگر اس کی دلی تمنا پوری نہ ہو تو وہ اُداس رہتا ہے۔ اگر اس کی آرزو پوری ہو جائے تب بھی اُداس رہتا ہے۔ آج میں تمھیں اس کی تلوّن مزاجی کا تماشا دکھاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر تقدیر نے اپنی جھولی سے ایک جوڑی جوتے نکالے اور جہاں یہ گرما گرم بحث جاری تھی اُس کمرے کے باہر رکھ دیے۔

آخر یہ محفل برخاست ہوئی۔ ڈاکٹر نے جوتے پہنے، لیکن غلطی سے اُس نے قسمت کے عجیب و غریب جوتے پہن لیے۔ اس نے دوسرے لوگوں کو الوداع کہی اور قہقہہ لگا کر بولا، "واہ بھئی واہ، مغلیہ دَور کی بھی کیا بات ہے۔ کاش وہی زمانہ پھر لوٹ آئے۔"

تقدیر کے جوتوں میں یہ خاصیت تھی کہ انھیں پہننے والا جو بھی خواہش کرتا اُس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے جیسے ہی الفاظ ادا کیے اس کی خواہش پوری ہو گئی اور وہ مغلیہ زمانے میں پہنچ گیا۔ گھر کی سیڑھیاں اُتر کر جیسے ہی اس نے زمین پر قدم رکھا اس کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ اس زمانے میں پکّی گلیاں کم ہی ہوتی تھیں۔ گلی میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، کیوں کہ ان دنوں نہ

بجلی تھی اور نہ روشنی کا معقول انتظام تھا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی ڈاکٹر ایک بازار میں پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نہ وہ بازار اُسے جانا پہچانا معلوم ہوتا تھا اور نہ مکان اور دُکانیں۔ ڈاکٹر بڑبڑایا، "شاید میں نیند کی حالت میں راستہ بھول کر کسی اور طرف جا نکلا ہوں۔"

وہ صبح تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ جب دن نکل آیا تو ڈاکٹر نے دیکھا کہ شہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ چونے اور گچ سے بنے ہوئے مکانات تھے۔ تنگ تنگ گلیاں اور بازار تھے۔ لوگ پرانی طرز کے، عجیب طرح کے لباس پہنے پھر رہے تھے۔ ڈاکٹر حیران ہو ہو کر انھیں دیکھتا اور لوگ اُسے عجوبہ سمجھ کر حیرت سے دیکھتے۔ ڈاکٹر کو بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے ایک آدمی سے پوچھا، "یہاں کوئی ہوٹل ہے جہاں میں کچھ کھا پی سکوں۔"

اُس آدمی نے کہا، "آپ کا مطلب ہے سرائے یا بھٹیار خانہ؟"

ڈاکٹر کو یاد آیا کہ مُغلیہ دور میں ہوٹل اور ریستوراں نہیں ہوتے تھے۔

اُس نے کہا، "ہاں، مجھے کسی سرائے میں پہنچا دو۔"

تقدیر نے اپنی جھولی سے ایک جوڑی جوتے نکالے اور کمرے کے باہر رکھ دیے۔

اس آدمی نے ڈاکٹر کو کالی بھٹیاری کی سرائے میں پہنچا دیا۔

ڈاکٹر نے کہا، "بی بی، مجھے جلدی سے دو پیالی چائے بنا دو۔ ناشتے میں آلو کا بھرتا، ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ پراٹھے تل دینا۔"

کالی بھٹیاری نے حیران ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور بولی، "اے بھائی، چائے، آلو اور ٹماٹر کیا ہوتے ہیں۔"

تب ڈاکٹر کو یاد آیا کہ یہ سب چیزیں انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ ڈاکٹر نے جیسے تیسے ناشتا کیا، پھر وہ بولا، "بی بی، ڈبل قوام کا پان اور سگرٹ کا ایک پیکٹ تو کسی سے منگوا دو۔"

بھٹیاری پھر نہیں سمجھ سکی۔ تب ڈاکٹر کو یاد آیا کہ تمباکو تو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ ڈاکٹر عجیب مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ وہ سرائے سے باہر نکلا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اتنے میں کچھ لوگ ادھر آنکلے اور ڈاکٹر کا لباس دیکھ کر بولے، "شاید کوئی مسخرہ یا نٹ باز ہے جو اس عجیب لباس میں گھوم رہا ہے۔"

ڈاکٹر جھلّا کر بولا "مسخرے اور نٹ باز ہو گے تم لوگ کہ ایسے پرانے وقتوں کا لباس پہن کر گھوم پھر رہے ہو۔"

بس پھر کیا تھا۔ ان لوگوں نے ڈاکٹر کو اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور مُکّوں اور لاتوں سے اس کی تواضع کرنے لگے۔ اتنے میں کچھ سپاہی اِدھر آنکلے۔ ان کے سروں پر کُلاہ دار پگڑیاں، جسم پر پرانے طرز کی وردی، پاؤں میں سینڈل، ہاتھوں میں نیزے، کمر میں پٹکے اور پہلو سے لٹکی ہوئی تلواریں تھیں۔ وہ اسے پکڑ کر قاضی کی عدالت میں لے گئے۔ ڈاکٹر بہت ڈرا۔ اس نے سوچا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ قاضی نے جیل کی سزا سُنا دی تو عمر بھر جیل میں سڑتا رہوں گا۔ اے خدا تُو مجھے میرے اپنے زمانے میں پہنچا دے۔

اچانک اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ وہیں مکان کے باہر کھڑا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا، "شاید میں نے کوئی خواب دیکھا ہے، لیکن کتنا دل چسپ خواب تھا۔"

کوچوان پر کیا گزری

یہ جوتے ایک کوچوان کو ملے۔ وہ ایسے نرم اور ملائم جوتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے وہ جوتے پہن لیے اور اپنے آپ سے بولا، "لو میاں کوچوان، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ ایسے عمدہ جوتے پہنے تھے۔" وہ اپنے گھر گیا۔ وہ بہت تھک رہا تھا، اس لیے جوتے اُتارے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی

کھڑکی کے سامنے ایک فوجی کپتان کا کمرا تھا۔ اس کے سامنے قسم قسم کے پھل، لذیذ کھانے، اچار اور مربے رکھے ہوئے تھے۔ کوچوان تصور ہی میں ایسے لذیذ کھانوں کا مزا لینے لگا۔ وہ بڑبڑایا، "عرصہ گزر گیا ہے کہ دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اِدھر بعض لوگ ڈھیروں کھانا کھا کر بھی سیر نہیں ہوتے۔ کاش کہ میں اس موٹے کپتان کی جگہ ہوتا تو مزہ آجاتا۔ پھر تو ہر روز عید کا روز ہوتا اور ہر رات شب رات ہوتی۔"

اچانک اسے ایک جھپکی سی آئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کپتان کی میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے طرح طرح کے کھانے رکھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے ہاتھ مارنے لگا۔ ابھی اُس نے دو چار لقمے ہی اُٹھائے تھے کہ اردلی نے اُسے ایک رقعہ لا کر دیا۔ یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ دشمن نے حملہ کر دیا ہے اور جرنیل صاحب نے طلب کیا ہے۔ بے چارے کپتان (یعنی جو پہلے کوچوان تھا) کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا، "میں نے کبھی زندگی میں مکھی تک نہیں ماری

ڈاکٹر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نہ وہ بازار جانا پہچانا معلوم ہوا اور نہ مکان اور دکانیں۔

اب کیا ہو گا؟"

کپتان کو محاذِ جنگ پر جانا پڑا۔ وہاں قیامت کا منظر تھا۔ گولوں کے دھماکے، گولیوں کی سنسناہٹ، گاڑیوں اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ بے چارے کپتان کو اپنے بیوی بچّوں کی یاد ستانے لگی۔ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی ران میں لگی۔ ران سے خون کا فوارہ اُبلنے لگا۔ وہ درد سے چلّایا، "اے خدا میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟ مجھ سے بہتر تو وہ کوچوان ہے جو دن بھر کی محنت مشقت کے بعد شام کو گھر لوٹتا ہے اور اپنے بیوی بچّوں میں بیٹھ کر بے فکری سے باتیں کرتا ہے۔ کاش میں کبھی کپتان بننے کی خواہش نہ کرتا۔"

اس کے ساتھ ہی اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ بستر پر دراز ہے۔ وہ زور سے چلّایا، "اوہو، کیسا خوف ناک خواب تھا۔ مُنّے کی ماں، اگر میں کپتان ہوتا تو آج مَر ہی چکا ہوتا۔"

کوچوان کی بیوی چلّائی، "نوج، صبح سویرے تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

کوچوان نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا، "اور وہ جوتے کہاں گئے؟"

اس کی بیوی نے کہا، "شاید مُنّے نے کھڑکی سے باہر پھینک دیے ہیں۔"

کوچوان نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، اُسے جوتے نظر نہیں آئے۔ وہ بولا، "چلو خیر، کون سے اپنے تھے۔"

طالبِ علم پر کیا گزری

وہ جوتے ایک طالبِ علم نے اُٹھا لیے تھے۔ اس نے جوتے پہن لیے اور وہ اپنے گھر گیا۔ طالبِ علم نے کھانا کھایا پھر کرسی پر بیٹھ کر سبق یاد کرنے لگا:

"چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دُور ہے۔ چاند پر ہوا نہیں ہے، اس لیے وہاں جان دار زندہ نہیں رہتے۔ چاند کی سطح پر بے شمار پہاڑ اور غار ہیں۔"

لڑکا جماہی لے کر بولا، "کاش میں کسی طرح چاند پر پہنچ سکتا۔"

یہ لفظ اس کے منھ سے نکلے ہی تھے کہ اس کی کرسی برق رفتاری سے چاند کی طرف پرواز

کرنے لگی۔
لڑکا مسکرا کر بولا، "شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ خیر اب میں جاگنے سے تو رہا چاہے مرغا بننا پڑے۔"
اچانک ایک جگہ کرسی ٹھیر گئی۔ لڑکا انگڑائی لے کر بولا، "خوب، ہماری منزل آگئی ہے۔"
یہ کہہ کر اس نے کرسی سے چھلانگ لگادی۔ اس کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ لڑکا بولا، "یہ چاند ہے یا کوئی صحرا؟"
اس کے ہونٹ تو ہلے، مگر کوئی آواز سُنائی نہ دی۔ لڑکا حیران ہو کر سوچنے لگا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آخر اس کو خیال آگیا۔ وہ بولا، "خوب، دراصل یہ ہوا ہے جو ہماری آواز کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے، لیکن اگر یہاں ہوا نہیں ہے تو میں کیوں کر زندہ ہوں؟"
اس کے ہاتھ ناک کی طرف اُٹھے۔ وہاں پر ایک نلکی لگی ہوئی تھی۔ کمر سے بندھے ہوئے گیس کے سلنڈر سے ہوا کی تھوڑی تھوڑی مقدار اس کی ناک میں جا رہی تھی۔ لڑکے نے محسوس کیا کہ اس کا وزن بھی پہلے سے بہت کم معلوم دے رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بہت دُور نکل گیا۔ چاند کی سطح پر بے حد گہرے غار اور اُونچے اونچے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔
لڑکے نے زمین کی طرف دیکھا۔ وہ اب فُٹ بال کی طرح گول نظر آرہی تھی اور اس میں سے گہرے نیلے رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔ وہ زمین کی چمک دمک اور خوب صورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس نے چاند کے ایک گہرے سے غار میں جھانک کر دیکھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کس طرح اس کا ہاتھ پھسل گیا اور وہ ایک دَم گڑھے کے اندر سَر کے بل گرا اور سیکڑوں فیٹ کی گہرائی میں تیزی سے گرتا چلا گیا۔ اُس نے اپنے دل میں دُعا مانگی، "اے خُدا تو میری حفاظت فرما۔" اُس کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی اور وہ بالکل آہستہ سے نرم نرم ریت پر جا گرا۔ لڑکا جھٹ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دُور دُور تک ایک بہت بڑا شہر آباد تھا۔ قریب ہی ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں بہت سے مینڈک کی طرح کے لوگ کھڑے گُفت گو کر رہے تھے۔
ایک مینڈک کہہ رہا تھا، "زمین پر ایک بڑھیا رہتی ہے جو پکوڑے تل رہی ہے۔ وہ روز ہمیں دل چسپ خواب بھیجتی ہے۔"
لڑکا یہ سُن کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ اس کے قہقہے کی آواز سُن کر کچھ مینڈک اِدھر آئے۔

وہ لڑکے کو دیکھ کر چلّانے لگے، "ارے دیکھو کتنا بڑا مینڈک اِدھر آنکلا ہے۔ آج تو ہمارے مزے ہو گئے۔ اس کے پکوڑے تل تل کر کھائیں گے۔"

انھوں نے لڑکے کو گھیر گھار کر پکڑ لیا۔ پھر اسے کھینچتے ہوئے کڑاہی کی طرف لے چلے اور اسے دھڑام سے کڑاہی میں گرا دیا۔

بے چارے لڑکے کی چیخ نکل گئی۔ آخری وقت میں اس نے دُعا مانگی، "اے خدا میری حفاظت فرما۔"

اُسے ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ وہ کُرسی سے نیچے گر پڑا ہے۔ اس کی امّی نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ امّی نے پیار سے پوچھا، "تمھیں چوٹ تو نہیں آئی میرے چاند؟"

لڑکا منھ بنا کر بولا، "امّی جان، آپ مجھے چاند کہہ کر نہ پکاریے، دُور کے ڈھول سُہانے ہوتے ہیں۔"

لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا، "میرے جوتے کہاں گئے امّی؟" ماں نے جوتے سب جگہ تلاش کیے، لیکن وہ نہ ملنے تھے اور نہ ملے۔

تھانے دار پر کیا گزری

یہ جوتے ایک تھانے دار کو ملے۔ وہ ایسے عمدہ جوتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے جوتے پہن لیے۔ اُس کی کھڑکی کے سامنے ایک پودے پر بُلبل چہچہا رہا تھا۔ تھانے دار بولا، "کتنا پیارا پرندہ ہے۔ کاش میں بھی بُلبل ہوتا اور اس فضا میں بے فکری سے اُڑتا پھرتا۔"

یہ الفاظ ادا کرتے ہی اس کی حالت میں تبدیلی آنے لگی۔ کوٹ اور بازو پَر بن گئے۔ جوتے اور پاؤں پنجے بن گئے۔ تھانے دار اس تبدیلی پر قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا، "شاید، میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔"

اسی وقت ایک سپاہی کسی کام سے وہاں آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا، "یہ تھانے دار کہاں گیا؟" جب اس نے تھانے دار کی کرسی پر بُلبل بیٹھا ہوا دیکھا تو اُسے پکڑنے کے لیے لپکا۔ بُلبل کھڑکی کی راہ سے اُڑ کر باہر نکل گیا۔

مینڈک کی طرح کے لوگ لڑکے کو پکڑ کر کڑاہی کی طرف لے گئے۔

اسے ہوا میں اُڑنا بے حد دل چسپ لگا۔ وہ کبھی درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ جاتا، کبھی گھاس پر چہل قدمی کرنے لگتا، لیکن یہ خوشی زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی، پھر اچانک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ شکاری نے اُس کے اوپر جال پھینک دیا تھا۔ بُلبل نے چیخ چیخ کر کہا، "بدبخت، مجھے فوراً چھوڑ دے۔ جانتا نہیں کہ میں ڈونگا پور کا تھانے دار ہوں، بچو، یاد رکھنا کہ ایسی سزا دلاؤں گا کہ ہمیشہ یاد رکھو گے۔"

لیکن شکاری کو چیں چیں چوں ہی سُنائی دے سکی۔ اُس نے بلبل کو پنجرے میں بند کر دیا۔ تھانے دار (بُلبل) دِل ہی دل میں ہنسا اور بولا، "کبھی تو میرے ایک اشارے پر ملزموں کو قید کر دیا جاتا تھا اب میں خود قید کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

شکاری نے بُلبل ایک بڑھیا کے ہاتھ فروخت کر دی۔ وہ بولی، "پپّو اسے دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔"

بڑھیا نے بُلبل کا پنجرہ ایک میز پر رکھ دیا۔ وہاں ایک توتے کا پنجرہ بھی رکھا ہوا تھا۔ توتا اسے

دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ بہت زور زور سے ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ توتے نے پوچھا، "کہیے بی بلبل، مزاج تو اچھا ہے؟"

بلبل نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا، "آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے۔ چڑ چڑ رچوں چی۔"

توتا بولا، "اب ٹھنڈی آہیں بھرنے سے کیا فائدہ۔ اب تو زندگی بھر تمھیں یہیں رہنا ہوگا۔"

اتنے میں دروازہ بہت آہستگی سے کھلا اور ایک خوف ناک صورت والی بلا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بہت کرخت اور دل ہلا دینے والی آواز میں چیخ ماری، می آآآ آؤں، میاؤں!

توتا پر پھڑپھڑانے لگا۔ اس نے کہا، "دوست تمھارے پنجرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔ تم فوراً نکل جاؤ اور روشن دان کے راستے باہر اُڑ جاؤ۔ خدا حافظ۔"

بلبل نے ایسا ہی کیا۔ وہ روشن دان میں بیٹھ گیا اور اپنے دوست توتے کو دیکھنے لگا۔ بلّی پنجرے پر پنجے مارنے لگی۔ بے چارہ توتا پنجرے کی سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر ادھ موا ہو گیا۔ تب بلّی نے کسی طرح پنجرہ کھول کر توتے کو پکڑ لیا اور اسے پنجوں میں دبا کر کھانے لگی۔

بلبل روشن دان کے راستے باہر نکل گیا اور ہوا میں اُڑنے لگا، لیکن اب ایک اور مصیبت نازل ہو گئی یعنی ایک شکرا اس کا پیچھا کرنے لگا، بے چارہ بلبل کبھی تیزی سے دائیں مڑتا، کبھی بائیں مڑتا۔ کبھی پر سمیٹ کر غوطہ لگاتا، لیکن شکرے نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

بلبل اب تھکن سے چور چور ہو گیا تھا۔ اسے ایک مکان دکھائی دیا۔ اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ بلبل کمرے میں چلا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس نے دُعا مانگی، "اے خدا مجھے دوبارہ انسان بنا دے۔"

اس کی دُعا قبول ہو گئی اور وہ دوبارہ انسان بن گیا۔

اس نے دیکھا کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ حیران ہو کر بولا، "میرے خدا، یہ کیا اسرار ہے؟ اوہو، شاید میں سو گیا تھا اور میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

میز پر جوتے اسی طرح رکھے تھے۔ تھانے دار نے نفرت سے انھیں دیکھا اور بولا، "پتا نہیں یہ کیسے منحوس جوتے ہیں جنھیں پہن کر مجھے ایسا ڈراؤنا خواب دکھائی دیا۔" یہ کہہ کر اُس نے جوتوں کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

عبدل مزدور پر کیا گزری

یہ جوتے عبدل کو ملے جو اپنے کام سے واپس آرہا تھا۔ اُس نے جوتے اپنے تھیلے میں ڈال لیے۔ رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد اُس نے جوتے پہن کر دیکھے۔ وہ اسے ایسے عمدہ لگے کہ وہ جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے کہا، "ایسے جوتے تو سیٹھ عبداللہ کے پاس بھی نہ ہوں گے۔ کتنا مزا آئے کہ میں راتوں رات کروڑ پتی بن جاؤں۔"

اُس کی بیوی جھنجھلا کر بولی، "ارے تمھیں تو ایسی فضول باتیں سوجھتی رہتی ہیں۔ اب جوتے اُتارو اور آرام کی نیند سو جاؤ۔"

عبدل غنودگی کی حالت میں بولا، "آج میں جوتوں سمیت ہی سوؤں گا۔"

صبح جب عبدل کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ وہ پرانا مکان ہے اور نہ جھلنگا پلنگ۔ سب ہی کچھ بدلا ہوا تھا۔ عبدل اپنے دل ہی دل میں ہنسا، "خوب دل چسپ خواب ہے۔" یہ کہہ کر وہ کروٹ

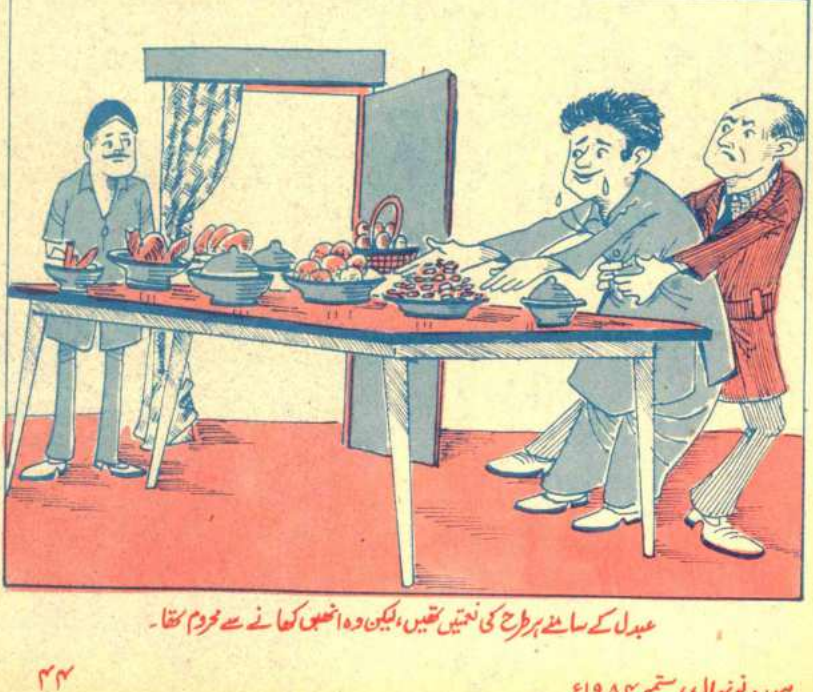

عبدل کے سامنے ہر طرح کی نعمتیں تھیں، لیکن وہ انھیں کھانے سے محروم تھا۔

لے کر پھر سونے لگا۔

اتنے میں ایک نوکر نے آکر اطلاع دی، "سرکار، ناشتا تیار ہے۔" سیٹھ عبدل کو اُٹھنا ہی پڑا۔

ناشتے کی میز پر صرف چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی۔ چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہی اسے اُبکائی سی آنے لگی۔ بالکل پھیکی سیٹھی چائے تھی۔

سیٹھ عبدل نے غصّے سے کہا، "بے وقوف اس بدمزہ چائے کو فوراً یہاں سے لے جاؤ اور میرے لیے حلوا پوری، نہاری اور رس ملائی لے کر آؤ۔"

نوکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ بولا، "سرکار، آپ کو ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

سیٹھ عبدل بولا، "جو میں کہتا ہوں، تم وہ کرو۔"

نوکر ہوٹل سے یہ سب چیزیں لے آیا۔ سیٹھ عبدل نے ابھی ناشتا شروع ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر فیضی آگئے۔ وہ یہ سب چیزیں دیکھ کر بہت ناراض ہوئے اور کہا، "یہ تم نے پھر بدپرہیزی شروع کر دی! میاں تم شوگر (ذیابیطس) کے مریض ہو اس لیے میٹھی چیزوں سے پرہیز کرو۔ یہ حلوا، رس ملائی اور مٹھائیاں تو زہر ہیں تمھارے لیے۔"

پھر نمکین چیزوں کی باری آئی۔

ڈاکٹر نے جھلّا کر کہا، "اور یہ کس کم بخت نے مشورہ دیا ہے کہ تم قورمہ اور نہاری کھایا کرو۔ ارے بھائی، تمھیں خون کا دباؤ (بلڈ پریشر) ہے۔ تم نمک کم کھاؤ بلکہ بالکل نہ کھاؤ۔ تمھیں معدے کا السر (زخم) بھی ہے۔ السر میں تیز مرچ مصالحہ سخت نقصان دیتا ہے۔"

سیٹھ عبدل نے سَر پیٹ لیا۔ وہ بولا، "میں کروڑوں رُپے کا مالک ہوں، لیکن یہ سب دولت میرے کس کام کی؟ دنیا کی سب لذتیں مجھ پر حرام ہیں۔ اب نہ میں میٹھا چکھ سکتا ہوں اور نہ نمکین کھا سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا، "میاں سب امراض امیر لوگوں کو مفت میں ملتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو دولت خود ایک بہت بڑی بیماری ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

دولت کو بہت لوگ یہ کہتے ہیں خدا ہے
میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زر ایک وَبا ہے

آخر عبدل کو وہی کڑوی کسیلی چائے زہر مار کرنا پڑی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد سیٹھ

عبدل نے کپڑے تبدیل کیے اور کارخانے کی طرف چلا۔ وہاں پہنچ کر سیٹھ کو معلوم ہوا کہ مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے اور وہ تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کچھ مزدوروں نے اس کی کار کو گھیر لیا۔ یہ شور ہنگامہ دیکھ کر سیٹھ عبدل کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس نے دُعا مانگی، "اے خدا تُو مجھے اس مصیبت سے نجات دِلا دے۔ مجھ سے بہتر تو وہ مزدور ہے جو روکھی سوکھی کھا کر مزے کی نیند سوتا ہے۔"

الفاظ ادا کرنے کی دیر تھی کہ سیٹھ عبدل پھر سے عبدل مزدور بن گیا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ نہ وہ بنگلہ تھا نہ نوکر چاکر۔ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور اُس کی بیوی اسے چائے کے لیے بُلا رہی تھی۔

اُس نے بیوی سے کہا، "خدا کا شکر ہے بیگم کہ میں سیٹھ عبدل نہیں ہوں۔ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ اور بیگم، میں نے کل رات ایک اچھا سبق سیکھا ہے۔"

بیوی نے پوچھا، "وہ کیا؟"

عبدل لہک لہک کر شعر پڑھنے لگا:۔

دولت کو بہت لوگ یہ کہتے ہیں خدا ہے
میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زر ایک وَبا ہے

اِدھر تقدیر تدبیر سے کہہ رہی تھی:

"دیکھا تم نے بہن، یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ یہ کبھی کسی حال میں خوش نہیں رہ سکتا، لیکن ہاں جو لوگ صبر کرتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں بے شک وہی لوگ ہر حال میں خوش رہیں گے۔"

رقبے کے لحاظ سے دنیا کے چار بڑے ملک

روس	رقبہ	۸،۶۵۰،۰۰۰	مربع میل یا	۲۲،۳۰۰،۰۰۰	مربع کیلو میٹر
کینڈا	"	۳،۸۵۲،۰۰۰	" " "	۹،۹۷۶،۰۰۰	" " "
چین	"	۳،۶۹۰،۰۰۰	" " "	۹،۵۵۸۱،۰۰۰	" " "
یو ایس اے	"	۳،۶۱۵۱،۰۰۰	" " "	۹،۶۳۶،۰۰۰	" " "

ننّھا چلا ہے مدرسے

طالب حسین طالب

بستہ بغل کے درمیاں اور ہاتھ میں تختی لیے
نکلا ہے گھر سے علم کی دِل میں لگن سچی لیے
ننّھا چلا ہے مدرسے

اپنے کھلنڈرے دوستوں سے سارے رشتے توڑ کے
تعلیم پانے کے لیے یہ کھیل سے منھ موڑ کے
ننّھا چلا ہے مدرسے

آنکھوں میں اِس کی دیکھیے کیسی خوشی کی ہے چمک
دِل میں لگن ہے عِلم کی، چہرے پہ کیسی ہے دَمک
ننّھا چلا ہے مدرسے

اپنے شفیق اُستاد سے، سیکھے گا یہ عِلم و ادب
بولے گا یہ تہذیب سے، اچھا کہیں گے اس کو سب
ننّھا چلا ہے مدرسے

ملتے ہی چُھٹّی لوٹ کر اسکول سے جب آئے گا
اس کو کریں گے پیار سب، انعام بھی یہ پائے گا
ننّھا چلا ہے مدرسے

فاضِل بنے گا ایک دن جب عِلم یہ پڑھ جائے گا
تعلیم کی برکت سے یہ دنیا میں عزّت پائے گا
ننّھا چلا ہے مدرسے

"اپنی مالکن کو سلام کہنا اور کہنا کہ ان چار آموں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آج شام کو آؤں گی۔"
"بیگم صاحبہ آپ ضرور آئیں، لیکن ازراہِ کرم پانچ آموں کا شکریہ ادا کیجیے گا۔"

امّی، میں پارک میں بیٹھا گا رہا تھا کہ کسی نے یہ جوتا پھینک کر مارا!
ارے یہ جوتا تو قیمتی ہے، جلدی سے جا کر دوبارہ گانا شروع کر دو، شاید وہ دوسرا جوتا بھی پھینک دے۔

انعامی مقابلہ

بلا عنوان سچا افسانہ

عنوان لکھیے

ذیل میں ایک سچا افسانہ دیا جا رہا ہے، جو ایک انگریز جناب ڈی۔ آر۔ ہالفورڈ ویٹ کنس نے لکھا ہے۔ یہ ولولہ انگیز افسانہ پڑھ کر اس کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے۔ سب سے اچھا عنوان لکھنے والے کو تین سو رُپے انعام دیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ صحیح عنوان آئے تو انعام برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ ادارے کا فیصلہ قطعی اور آخری تسلیم کیا جائے گا۔ آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۸۴ء ہے۔ جس کاغذ پر عنوان لکھیں اس پر اپنے نام اور پتے کے علاوہ کچھ اور نہ لکھیں۔ نام پتا گندا یا ادھورا لکھا ہو تو مقابلے میں شریک نہیں کیا جائے گا۔

یوسف حسین ایک معمولی سپاہی تھا۔ اس سے ملنے کے دو دن بعد ہی میں نے اس کو جان سے مار دیا ہوتا۔ مجھ پر کوئی الزام نہ آتا۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ میں، نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ کیا، لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ اگر میں نے اس کو واقعی مار ڈالا ہوتا تو کیا آج میں خود زندہ ہوتا؟

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا ہے۔ میں ایک برطانوی افسر کی حیثیت سے سنگاپور میں تعینات تھا کہ اتنے میں اچانک ملایا میں گوریلا جنگ شروع ہو گئی۔ یہ حرکت جن دہشت گردوں نے کی تھی وہ چاہتے تھے کہ ملایا کے ربر کے خاص جنگلات پر قبضہ کر لیں۔

مجھے جنگل کی لڑائیوں کا خوب تجربہ تھا، کیوں کہ میں دوسری عالمی جنگ کے دوران جنوب مشرقی ایشیا میں لڑ چکا تھا۔ چناں چہ مجھے شمال کی جانب رینگم ضلع کی کمان سنبھالنے کا حکم مل گیا۔ یہ مقام جوہور ریاست میں واقع ہے۔ ہمارا کام آسان نہ تھا۔ میرے پاس کُل بارہ سو آدمی تھے۔ ان میں ملایا والے بھی تھے اور سفید فام بھی تھے۔ ہم لوگوں کو پندرہ سو مربع میل کے خطرناک جنگلات میں امن و امان قائم رکھنا تھا۔ دہشت گردوں نے اس علاقے کو سب سے زیادہ خطرناک بنا دیا تھا۔ روزانہ کم از کم دو قتل ضرور ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اغوا، ڈکیتی اور دوسرے جرائم آئے دن ہوتے

رہتے تھے۔

دہشت گرد گولیاں برساتے ہوئے کسی رُبر کے جنگل میں داخل ہو جاتے تھے اور جو کچھ وہاں پاتے تھے لوٹ لے جاتے تھے۔ عمارتوں کو آگ لگا دیتے تھے اور پھر جنگل میں غائب ہو جاتے تھے۔ پھر جب وہ اپنے ہتھیاروں اور لوٹ کے مال کو چھپا لیتے تو معصوم بن کر آجاتے تھے۔ میں جب رینگم پولیس اسٹیشن پہنچا تو حاجی نامی ایک شخص نے میرا استقبال کیا۔ یہ ایک بوڑھا تجربے کار ملایا کا باشندہ تھا۔ اس شخص نے مجھے ان جوانوں سے ملوایا جو میرے ساتھ جنگل میں دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے والے تھے۔ ان جوانوں کا سرغنہ سپاہی یوسف حسین تھا۔ اس نے سب سے زیادہ دہشت گرد مارے تھے۔ یوسف حسین کے کارنامے میں نے سنگاپور میں بھی سُنے تھے، کیوں کہ اس وقت تک وہ ایک مشہور ہیرو بن چکا تھا۔ ملایا کے لوگ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں میں یوسف حسین ایک دوسری وجہ سے بھی مشہور تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ وہ "کین میرا" حاصل کر چکا تھا۔ یہ عطیہ خاص خاص مسلمانوں کو ملتا تھا جو نہایت پاک باز اور دین دار ہوتے تھے۔ "کین میرا" دراصل ایک سرخ کپڑا ہوتا تھا جس پر مذہبی تحریر ہوتی تھی۔ اسے تہ کر کے تعویذ کے طور پر بائیں بازو پر باندھ لیا جاتا تھا۔ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کی بہ دولت آدمی خنجر اور بندوق کی گولی سے محفوظ رہتا تھا۔ خود مجھ کو اس پر یقین نہ تھا، لیکن یوسف حسین کا سرخ کپڑا اس کو کئی معرکوں میں صحیح سلامت نکال لایا تھا۔

حاجی صاحب نے جب تعارف کروایا تو مجھے یوسف کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ انتیس برس کا خوبرو جوان تھا۔ اس کو اپنے آپ پر بڑا اعتماد تھا۔ میں نے اس سے ملایا کی زبان میں کہا، "ادا بائک"، یعنی کیا تم اچھے ہو؟ "نہیں تو آن"۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا، یعنی "میں بائیسکل پر سوار نہیں ہوں، میں تو پیدل چل رہا ہوں"۔ یہ مذاق لفظ "بائک" یعنی بائیسکل کی بنا پر کیا گیا تھا۔ مجھے یہ ناگوار گزرا۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کی نگرانی کرنا پڑے گی۔ چناں چہ دو دن کے بعد ہی میں نے یوسف کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ لیا۔

میں یوسف اور پانچ سپاہیوں کو لے کر جیپ میں روانہ ہوا۔ ہم پندرہ میل دُور ایک جگہ کا دورہ کرنے روانہ ہوئے تھے۔ جوں ہی ہم ایک جگہ گھومے تو گھنی جھاڑیوں سے ہمارے اوپر گولیاں چلنے لگیں، جس کی وجہ سے انجن خراب ہو گیا۔ ہم ٹوٹی ہوئی گاڑی کو بڑی مشکل سے گھماتے ہوئے آگے گئے، پھر چھلانگ مار کر گاڑی کے باہر آئے اور سڑک کے کنارے زمین پر لیٹ گئے۔ جب گولیاں

بند ہوئیں تو دہشت گرد ایک دوسرے کو پکارنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ دو گروہوں نے ہمارے اوپر حملہ کیا تھا اور ہم کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔ ہماری تعداد ان کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اچانک دُور سے آواز آئی، "اُو ملایا والوں، اس سفید آدمی کو ہمارے حوالے کر دو اور اپنے ہتھیار پھینک دو۔ تم محفوظ رہو گے۔ ہم کو صرف یہ سفید آدمی درکار ہے۔" ہر طرف سناٹا چھا گیا اور پھر "اچھا میں ہتھیار ڈالے دیتا ہوں۔ یہ ہے میری بندوق۔" یہ یوسف حسین کی آواز تھی۔ اتنے میں اس کی بندوق سورج کی روشنی میں چمکی جسے اس نے پھینک دیا تھا۔

تو کارپورل یوسف نے میرے ساتھ غدّاری کی تھی۔ اب تو باقی پانچ سپاہیوں پر بھی مجھے بھروسا نہیں رہا اور میں نے اپنی بندوق اُس جانب گھمائی، جہاں میرے خیال میں یوسف تھا اور انگلی لبلبی پر رکھ کر انتظار کرنے لگا۔ پھر دُور کچھ حرکت سُنائی دی۔ تین دہشت گرد یوسف کی بندوق اُٹھانے کے لیے رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ بندوق تک پہنچ گئے تھے کہ اتنے میں یوسف چلّایا، "اور یہ بھی لیتے جاؤ۔"

خطرناک لمحوں میں چھوٹی باتیں بھی بڑی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ آج بھی مجھے وہ کان پھاڑنے والا دھماکا سنائی دے رہا ہے اور انسانی گوشت مٹّی میں اُڑتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ یوسف حسین کا دستی بم ان تینوں دہشت گردوں پر پھٹ چکا تھا۔ مٹی اور پتھروں کی بوچھار مجھ پر بھی پڑی۔ شاید یہ یوسف حسین پر شک کرنے کی سزا ہو۔ مُردہ دہشت گردوں کے اوپر ابھی دُھواں چھایا ہوا تھا کہ اتنے میں یوسف حسین کُود کر آگے آیا اور اس نے اپنی بندوق اُٹھالی، پھر چاروں طرف گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔

"اِدھر آؤ!" میں چلّایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور میرے قریب جھاڑیوں میں گُھس گیا۔ "معاف کیجیے گا۔ آپ کو ذرا دیر کے لیے میری وجہ سے پریشانی ہوئی۔" اس نے کہا اور مسکرانے لگا۔ پھر میں نے اور یوسف نے اپنے آدمیوں کو اکھٹا کیا۔ اور ہم لوگ چپکے سے وہاں سے کھسک گئے۔ دشمن خالی جھاڑیوں پر گولیاں برساتے رہے۔ یوسف میرے برابر چل رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا، "تم نے تو بڑا عمدہ چکما دیا۔ ذرا دیر کے لیے میں پریشان ہو گیا تھا۔ بہرحال ہم لوگ زندہ آ گئے!"

"جی ہاں۔" یوسف نے کہا۔ اس کے چہرے سے شرارت غائب ہو گئی اور اس نے بڑے احترام سے اپنے بائیں بازو پر سرخ کپڑے کو چُھوا۔

جنگل میں دہشت گردوں سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے میں یوسف کو اچھی طرح سمجھنے لگا اور اس پر پورا بھروسا کرنے لگا۔ وہ وفادار، بہادر اور سمجھ دار تھا۔ میں اس کی شجاعت کی قدر کرنے لگا اور اس کی پارسائی کا احترام کرنے لگا۔ وہ نماز بڑی پابندی سے پڑھتا تھا۔ بیرک میں ہو یا جنگل میں نماز ناغہ نہیں کرتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا اپنا سرخ کپڑا ساتھ رکھتا تھا۔ میں اس کپڑے کو یوسف کے ایمان اور ہمت کی علامت سمجھنے لگا۔

اس کے سرخ کپڑے کے لیے ایک کٹھن آزمائش اسی سال گرمیوں کے دنوں میں ہو گئی۔ ہم لوگ ایک جیپ میں جا رہے تھے کہ اتنے میں سامنے سڑک کے بیچ میں ایک درخت آڑا پڑا ہوا ملا۔ دہشت گردوں نے یہ درخت کاٹ کر ہمارا راستہ بند کر دیا تھا۔ گاڑی روکنے کا وقت ہی نہیں ملا، لہٰذا جیپ اس درخت سے ٹکرا کر اُلٹ گئی اور ہم لوگ سڑک پر جا گرے۔ ہم لوگ جلدی سے اُٹھ کر بھاگے، کیوں کہ دہشت گردوں نے گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ سڑک سے سو گز دُور ہم اکھٹے ہوئے تو میں نے دیکھا کہ یوسف نہیں ہے۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وہ اُلٹی ہوئی جیپ کے قریب ساکت پڑا ہوا تھا۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ گولیاں چلا کر میرے راستے کو محفوظ رکھیں۔ اور میں دوڑ کر یوسف کے پاس پہنچا اور اسے ایک محفوظ کھائی میں گھسیٹ لایا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کے سَر کے پچھلے حصّے میں ایک زخم تھا۔ خوش قسمتی سے اسی وقت رینگم پولیس اسٹیشن سے کچھ اور سپاہی آگئے اور ہم نے صورتِ حال پر قابو پا لیا۔ اسی وقت ایک جوان نے مجھ سے کہا، "آپ کی پیٹھ سے خون نکل رہا ہے۔" میرے کندھے میں ایک گولی لگی تھی۔ خوش قسمتی سے گولی پھیپھڑے کے اندر نہیں گئی، لیکن اس کی وجہ سے دو ہفتے تک مجھے ہسپتال میں رہنا پڑا۔

میں ہسپتال سے رخصت ہونے والا تھا کہ یوسف میرے پاس آگیا۔ اس کے سَر کا زخم اچھا ہو چکا تھا۔ وہ بڑا عمدہ لباس پہنے ہوئے تھا، مگر وہ کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "کیا میں آسکتا ہوں۔" میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا، مگر وہ بیٹھا نہیں۔ آخرکار بولا، "میں آپ کا احسان مند ہوں۔ آپ نے میری جان بچائی۔"

"نہیں، موقع ہوتا تو تم بھی میرے لیے یہی کرتے۔"

"جناب، آپ نے میری جان بچائی۔" اس نے پھر کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر لکڑی کی ایک چوڑی نلکی نکالی۔ اس پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے، "اگر آپ اس کتار کو قبول

کرلیں تو میری بڑی عزت افزائی ہو گی۔ یہ میری احسان مندی کا ایک نشان ہے۔" یوسف نے نلکی کو کھول کر اس میں سے ملایا کی بنی ہوئی ایک نہایت خوب صورت دو دھاری کٹار نکالی۔ دستے کے آخری سرے پر ایک نُکیلا حصّہ ہوتا ہے۔ جب کٹار کسی دشمن کے جسم میں پیوست کی جاتی ہے تو دستے کو ذرا سا گھُمانے سے یہ نکیلا حصّہ ٹوٹ کر دشمن کے جسم میں رہ جاتا ہے۔ یوسف نے کہا، "آج کل بہت کم لوگ اچھی کٹار بنا سکتے ہیں۔ میں نے اسے آپ کے لیے ایک بوڑھے کاری گر سے بنوایا ہے۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کٹار پر اُس نے گاؤں کے مولوی صاحب سے دُعا بھی پڑھوا دی ہے۔ اس طرح یہ کٹار اور بھی قیمتی ہو گئی۔ اب میں سمجھ گیا کہ یوسف اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے۔ وہ یہ کٹار مجھے دینا بھی چاہتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس سے جُدا ہونا بھی نہیں چاہتا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا،

"صاحب، اس کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیے گا۔ آپ ہمیشہ کام یاب رہیں گے۔" پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وہ چلا گیا۔

ایک دن صبح میں اپنے بنگلے میں سو رہا تھا کہ ٹیلے فون کی گھنٹی بجی۔ ہیڈ کوارٹر کے سپاہی نے اطلاع دی کہ گولیاں چلنے کی آواز سُنائی دے رہی ہے۔ پھر کسی اور نے اطلاع دی کہ سمبرونگ ربر اسٹیٹ کی جانب سے گولیوں کی آوازیں سنائی دی ہیں۔ سپاہی نے ربر اسٹیٹ ٹیلے فون کیا، مگر لائن بند تھی۔ اس ربر اسٹیٹ کے مینیجر کا نام سینڈی گرانٹ تھا۔ وہ اور اس کی بیوی اور دو سالہ بچّی میرے پرانے دوست تھے۔ میں نے جلدی سے تیاری کی اور روانہ ہو گیا۔ میں ہمیشہ ایک دستہ سپاہیوں کا تیار رکھتا تھا۔ اس بار یوسف حسین کا دستہ تھا۔ میں کُود کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ یوسف ہمیشہ میرے پیچھے بیٹھتا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "جناب، کیا وہ کٹار آپ کے پاس ہے؟" میں نے کارتوس والے تھیلے پر ہاتھ مار کر کہا، "ہاں۔" ہم لوگ دو میل لمبی سڑک پر گھوم گئے۔ یہ مناسب نہ تھا۔ عام طور پر ہم لوگ چاروں طرف سے اس جگہ کو گھیرنے کی کوشش کرتے تھے جہاں حملہ ہوتا تھا، لیکن ایک عورت اور بچّی کا خیال کر کے ہم لوگ سیدھے چل پڑے۔

ہم لوگ وہاں پہنچے تو اسٹیٹ کی عمارت سے مشین گن کی گولیاں برسنے لگیں۔ بائیں جانب دُھواں اُٹھ رہا تھا، جہاں دہشت گردوں نے آگ لگا دی تھی۔ گرانٹ کا بنگلہ دو سو گز آگے تھا۔

"ان بندوقوں کو بند کرنا ہو گا ـــــ" ابھی یہ الفاظ میرے منھ سے نکلے ہی تھے کہ یوسف دستی

بم لے کر کھلے میدان میں چلا گیا۔ اس نے آفس کا دروازہ کھولا، مگر اسی کے ساتھ گولیاں برسنے لگیں۔ یوسف بُری طرح زخمی ہو کر دروازے پر گر پڑا۔ اس کے بھائی عبدل نے دوڑ کر یوسف کا دستی بم اُٹھا لیا اور اسے آگے پھینک دیا۔ پھر یوسف عمارت کے کونے کی طرف کھسک گیا اور عبدل کے ساتھ دہشت گردوں پر گولیاں چلانے لگا۔ وہ بھاگنے لگے۔

اچانک میرے بائیں جانب سے گولیاں آنے لگیں۔ کچھ دہشت گرد اس طرف سے جوابی حملہ کرنا چاہتے تھے۔ میں ادھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک دہشت گرد بنگلے سے نکل کر سڑک پر بھاگنے لگا۔ اگر وہ نکل گیا تو ہمارے ان ساتھیوں پر پیچھے سے حملہ کر دے گا جو نالے میں ہیں۔ میں نے تین بار گولی چلا دی۔ دہشت گرد ان گولیوں سے لٹو بن گیا۔ گولیاں چلتی رہیں۔ میں دوڑ کر گرانٹ کے بنگلے پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سینڈی گرانٹ، اس کی بیوی اور بچّے غسل خانے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ہمارے اور سپاہی آگئے اور دہشت گرد بھاگ گئے۔

اب ہم نے اپنے نقصانات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یوسف کے دستے میں پندرہ آدمی تھے۔ ان میں سے صرف عبدل اور ایک سپاہی زندہ بچا تھا۔ عبدل اپنے بھائی یوسف کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یوسف ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر بندوق پر تھا۔ جوں ہی میں نے اس کے ہاتھ سے بندوق اُٹھائی میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ میں خود زندہ کیسے بچا، یہ بھی ایک معجزہ تھا۔

جب میں رینگم پہنچا تو حاجی میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے لڑائی کا سارا حال سُنایا اور کہا، "افسوس، اس بار سرخ کپڑا یوسف کے کام نہ آیا۔"

اس نے کہا، "اس میں حیرت کی بات نہیں، کیوں کہ وہ تو آپ کے پاس تھا۔"

میں حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟" حاجی نے کہا، "جناب، یوسف نے آپ کو جو کٹار دی تھی کیا آپ نے اسے کبھی کھولا نہیں؟ سُرخ کپڑا اسی کے دستے میں ہے۔"

اب تو میں اور بھی حیرت میں پڑ گیا۔ میں نے کٹار نکالی اور دیکھا کہ دستہ آسانی سے الگ ہو گیا اور اس کے اندر وہی سرخ کپڑا لپٹا ہوا رکھا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یوسف نے مجھے کس قسم کا تحفہ دیا تھا۔ میں عیسائی تھا۔ مجھے اس قسم کی چیزوں پر یقین نہ تھا۔ یوسف مسلمان تھا۔ اس نے سرخ کپڑا مجھے دے کر میری جان کی حفاظت کی اور خود اپنی جان قربان کر دی۔ اس سے بڑھ کر محبت کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے کی خاطر اپنی جان قربان کر دے۔

ہماری پیاری زمین

رُخسانہ اسرائیل

زمین ہمارے اور آپ کے لیے ایک جانا پہچانا لفظ ہے۔ اسی زمین پر ہم سب رہتے بستے اور چلتے پھرتے ہیں۔ اسی زمین سے ہمیں اناج کا خزانہ حاصل ہوتا ہے جس کو کھا کر ہم زندہ رہتے ہیں۔ اسی زمین سے پیڑ، پودے اور درخت اُگتے ہیں جن پر مزے دار پھل اور رنگ برنگے پھول لگتے ہیں اور اسی کی بدولت دنیا ہمیں خوب صورت معلوم ہوتی ہے۔ اپنی اس پیاری زمین کے بارے میں آپ سب نے بہت کچھ سنا ہوگا لیکن ہم آپ کو اس مضمون میں یہ بتائیں گے کہ زمین کی سطح کس طرح بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کبھی پرانی عمارتوں کو یا ان کے کھنڈرات کو دیکھنے گئے ہوں گے تو آپ نے سوچا ہوگا کہ یہ تباہی اور بربادی کیسے واقع ہوئی۔ اگرچہ یہ ٹوٹ پھوٹ کا عمل ایک دو دن میں نہیں بلکہ کئی سو سالوں میں واقع ہوا ہے۔ مگر زمین کی اس ٹوٹ پھوٹ کے دو بڑے اسباب ہوا اور بارش ہیں۔ ہوا پانی اور سورج کی گرمی کے عمل سے جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس کو موسمی عمل کہتے ہیں۔

ہوا کے عمل میں تیز رفتار ہوائیں چٹانوں کو اور پہاڑی مٹی کو کاٹتی رہتی ہیں اور چٹانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ریت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سمندر کی طاقت ور موجیں اور بارش کا پانی بھی چٹانوں کی توڑ پھوڑ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ بارش کا پانی چٹانوں کی دَرزوں میں جمع ہو کر سردی کے موسم میں برف بن جاتا ہے اور یہی برف پھیل کر چٹانوں کو توڑ دیتی ہے۔ دریاؤں کے تیز دھارے کنارے کی مٹی اور چٹانوں کے پتھروں کو بہا لے جاتے ہیں۔

سورج کی حرارت اور دن بھر کی تپش سے چٹانیں گرم ہو کر پھیل جاتی ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں رات کے وقت سردی کی وجہ سے یہ چٹانیں اچانک سُکڑ جاتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں۔ اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ہوا، پانی اور سورج کی حرارت موسمی عمل کے اسباب ہیں۔

اب ہم آپ کو عمل فرسودگی کے متعلق بتاتے ہیں ۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ زمین کی اوپری سطح کی مٹی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے، کیوں کہ اسی مٹی پر ہم فصلیں اگاتے اور اناج پیدا کرتے ہیں ۔ اس مٹی کو چند قدرتی ذریعوں سے نقصان پہنچتا ہے ۔ یہ عمل فرسودگی کہلاتا ہے ۔ مثلاً تیز ہوائیں زمین کی سطح پر سے مٹی اور ریت اُڑا کر لے جاتی ہیں اور زمین بنجر ہو جاتی ہے ۔ بارش کا پانی بھی زمین کی سطح سے قیمتی مٹی بہا کر لے جاتا ہے اور یہ مٹی سمندروں میں گر جاتی ہے اور زمین خراب ہو جاتی ہے ۔ برف کے بڑے بڑے تودے پہاڑوں سے پھسل کر وادیوں میں پہنچتے ہیں ۔ یہ برف آہستہ آہستہ پگھلتی رہتی ہے اور اپنے ساتھ مٹی اور پتھر بھی بہا کر لے جاتی ہے ۔

مٹی کو فرسودگی سے بچانا بہت ضروری ہے ۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پودے اور درخت لگا کر مٹی کو فرسودگی سے بچایا جاسکتا ہے، کیوں کہ پودوں کی جڑیں مٹی کو پکڑ لیتی ہیں، ڈھلوان پر سے مٹی کو بہنے سے روکنے کے لیے آڑی کیاریوں میں کاشت کی جاتی ہے ۔ آڑی کیاریوں کی وجہ سے بھی پانی کا بہاؤ سست ہو جاتا ہے اور مٹی بہنے نہیں پاتی ۔ اسی طرح مویشی اگر چراگاہ کی ساری گھاس چر جائیں تو مٹی کھلی رہ جاتی ہے اور فرسودگی کا خطرہ رہتا ہے ۔ چناں چہ اپنی پیاری اور قیمتی مٹی کو بچانے کے لیے مختلف احتیاطیں بہت ضروری ہیں ۔ (پندرہ روزہ آہنگ کا شکریہ)

ملکوں کے سرکاری نام اور عام نام

سرکاری نام	عام نام	سرکاری نام	عام نام
عوامی جمہوریۂ چین	چین	جمہوریۂ چین	تیوان یا فارموسا
ڈیموکریٹک ری پبلک اوف جرمنی ۔	مشرقی جرمنی	فیڈرل ری پبلک اوف جرمنی	مغربی جرمنی
عوامی جمہوریۂ کوریا	شمالی کوریا	جمہوریۂ کوریا	جنوبی کوریا
جمہوریہ مالاگاسی	مدغاسکر	نیدر لینڈز	ہالینڈ

چہرے پر چھائیاں

س : میرے چہرے پر بڑی بڑی چھائیاں ہیں۔ کوئی علاج بتائیے جس سے میرا چہرہ صاف ہو جائے۔ میری عمر ۱۸ سال ہے۔
صائمہ، دوبئی متحدہ عرب امارات

ج : دوبئی میں سونف تو مل ہی جائے گی۔ ۹ گرام کُٹی ہوئی سونف رات کو گرم گرم پانی میں بھگودیں۔ صبح ہلا کر چھان کر اس میں شہد ملا کر پینا شروع کر دیجیے۔ مہینے دو مہینے۔ اِس سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ لگانے کے لیے کیلے کا چھلکا لیں اور اِس کا گودا چمچے سے نکال کر چھائیوں پر رات کو لگائیے۔ صبح صاف کر دیجیے۔

ہاں ذرا اپنی صحّت کا بھی خیال رکھیے۔ گوشت کم، سبزیاں زیادہ کھائیے۔ پھلوں کے رس تو دوبئی میں خوب آتے ہیں۔ ان کا استعمال کیا کیجیے۔

کیلشئم کی کمی

س : چند ماہ سے میرے ناخن خراب ہونا شروع ہو گئے ہیں اور ناخن اُتر گئے ہیں۔ یہ بیماری بڑھ رہی ہے اور ناخن بدنما ہوتے جا رہے ہیں۔ بہت پریشان ہوں۔ کوئی مشورہ دیجیے۔ میری عمر ۱۲ سال ہے۔
عدنان، کراچی

ج : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناخنوں میں جراثیم داخل ہو گئے ہیں اور یہ حالت فنگس کی وجہ سے ہے۔ واقعی یہ ٹیڑھا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ آپ ہمدرد کے کسی دواخانے سے مرہم الف خرید لیجیے اور پوری احتیاط کے ساتھ رات کو سوتے وقت ناخنوں پر یہ مرہم الف لگائیے۔ صبح بہت احتیاط سے ناخنوں کو صاف کر لیجیے۔ یہ مرہم ذرا تیز ہے۔ اور خیال رکھنا چاہیے کہ ناخنوں کے ذریعے سے یہ کھانے میں

نہ ہل جائے۔ اس مرہم سے ممکن ہے کہ ناخنوں کا یہ فساد ختم ہوجائے۔

اکیلے میں باتیں کرنا

س: مجھے اکیلے میں باتیں کرنے کی عادت ہے۔ مہربانی فرماکر اس کا کوئی علاج بتائیے؟

محمد بشیر تبسم، پتوکی

ج: یہ خالص نفسیاتی مسئلہ ہے اور اس کا حل صرف آپ کے پاس ہے۔ جب آپ خود ہی اس کو مسئلہ اور مرض قرار دیتے ہیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے خیالات اور اپنی عادتوں پر قابو حاصل کریں۔ آپ غور کیجیے کہ انسان زبان اس لیے استعمال کرتا ہے کہ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچائے۔ اگر کوئی دوسرا سامنے موجود نہیں ہے کہ زبان کا استعمال جائز اور صحیح کیسے ہوسکتا ہے؟ شاید آپ کو کسی کم زوری کی وجہ سے اپنے اعصاب پر قابو حاصل نہیں رہا ہے۔ ان پر قابو پانے کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ آپ یہ فیصلہ ضرور کرسکتے ہیں اور آپ کو کرنا چاہیے۔

نمک زیادہ کھانا

س: زیادہ مقدار میں نمک استعمال کرنے کے کیا نقصانات ہوتے ہیں اور کم مقدار میں استعمال کرنے سے کیا فوائد ہوتے ہیں؟ میں نے سُنا ہے کہ نمک زیادہ استعمال کرنے سے گھٹنے کی ہڈی گل جاتی ہے۔

محمد سمیع، کراچی

ج: اعتدال بڑی اچھی چیز ہے۔ زیادتی ہر چیز کی نقصان دیتی ہے۔ پانی زندگی کا سرچشمہ ہے اور ذریعۂ زندگی ہے، مگر یہی پانی اگر ضرورت سے زیادہ پیا جائے تو مضر ہے۔ غذا بہر حال غذا ہے۔ اگر اسے اعتدال سے کھائیے تو جسم تروتازہ رہتا ہے۔ زیادہ کھائیے تو بدہضمی سے لے کر مُٹاپے تک نہ جانے کتنے امراض لیتے ہیں۔ نمک جسم انسانی کی حقیقی ضرورت ہے مگر زیادہ کھائیں تو گُردوں کو نقصان دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے جسم میں پانی رُک جاتا ہے اور ورم آجاتا ہے۔ زیادہ نمک سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ نمک کم کھانے سے صحت اعتدال پر رہتی ہے۔ خون میں معدنیات کا توازن برقرار رہتا ہے۔

ٹافیاں اور چھالیا

س: بچّے ٹافیاں، چیونگم اور چھالیا عام طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چیونگم اور چھالیا صحت کے لیے مُضر ہیں، کیا واقعی یہ درست ہے؟

غزالہ منیر شیخ، لاڑکانہ

ج: چیونگم اور ببل گم بلاشک وشبہ یہ صحت کے لیے مُضر ہیں۔ چھالیا کا حال بھی یہی ہے۔ اس سے

نقصانات کا صریح خطرہ موجود ہے۔ ان سب چیزوں میں سے کوئی ایک چیز جسم کے لیے ضروری نہیں ہے۔ یہ سب قطعی غیر ضروری اور قطعی مُضر ہیں۔ ٹافی کا میں مخالف نہیں ہوں، مگر زیادتی اس کی بھی بُری ہے۔ ٹافی کھانے کے بعد اگر دانت صاف نہ کیے جائیں اور رات سوتے میں مٹھاس کا اثر رہ جائے تو ضرور دانتوں میں خرابی ہو جائے گی۔

جوئیں بہت ہیں

س: میرے سَر میں بہت جوئیں ہیں۔ میں آٹھویں جماعت میں ہوں۔ میں ان سے بہت پریشان ہوں۔ کوئی ایسی دوا اور مشورہ دیں جس سے میری جوئیں ختم ہو جائیں؟

ف۔ک۔ش۔ظ، اسلام آباد

ج: جوئیں اکثر و بیشتر حالات میں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ صفائی سے غفلت برتی جاتی ہے یا ایسے حالات میں رہا جاتا ہے کہ جہاں صفائی نہ ہونے کی وجہ سے جوئیں پیدا ہو کر سَر میں داخل ہو جاتی ہیں اور گھنے بالوں میں اپنا گھر بنا لیتی ہیں۔ ہمدرد سے آپ دوائے خارش سفید ۱۲ گرام اور ۶۰ گرام روغن کمیلہ لے لیجیے اور اِن دونوں کو ملا کر رکھ لیجیے۔ رات کو یہ مرکب سَر میں لگائیے اور بالوں میں جڑوں تک جذب کر دیجیے۔ صبح سَر دھو لیجیے۔ ۱۲۔۱۵ دن اس طرح کرنے سے جوئیں مَر جائیں گی اور سَر صاف ہو جائے گا۔

پانچ سال سے دردِ سر

س: میرے سَر میں گزشتہ پانچ سال سے مسلسل درد ہو رہا ہے۔ پہلے پندرہ سولہ دن ہوتا تھا۔ پھر کچھ دن کے لیے آرام ہو جاتا ہے، مگر گزشتہ تین سال سے اتنا سخت درد ہو رہا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہر وقت درد رہتا ہے۔ دوپٹّا بھی سَر پر نہیں رکھ سکتی۔ سَر کے اوپر سے لے کر آنکھوں کے نیچے تک درد ہوتا ہے۔ بعض اوقات جب درد زیادہ ہوتا ہے تو غُنودگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ براہِ مہربانی جواب دیجیے۔ میری نظر کمزور نہیں ہے۔ اس وقت میری عمر سولہ سال ہے۔

سعدیہ ہاشمی، اسلام آباد

ج: صبح اور رات سوتے وقت چاے کے ایک ایک چمچے کے برابر "سومینا" لے کر پانی یا دودھ کے ساتھ کھائیے اور کھانا کھانے کے بعد جوارشِ انارین ۶۔۶ گرام دونوں وقت استعمال کیجیے۔ اس سے دردِ سر رفع ہو جائے گا۔

ہضم خراب ہے

س: میری عمر ۱۶ سال ہے۔ میرا ہاضمہ خراب ہے اور نگاہ کا نمبر بھی ۵ء۴ ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں ہے، لیکن میں دیکھنے میں بہت صحت مند ہوں۔ ازرہِ کرم بتائیے مجھے کیا کھانا چاہیے۔ خاص طور سے آنکھوں کے لیے۔ سید سہیل حفیظ، کراچی

ج: ہضم کا نظام اکثر اس طرح خراب ہوتا ہے کہ انسان اناڑی کی بندوق کی طرح معدے کو غذاؤں سے بھرلے اور یہ توقع کرے کہ نظامِ ہضم کا یہ فرض ہے کہ وہ جو کچھ بھی انسان کھائے اُسے ہضم کر ڈالے، لیکن یہ توقع کرنا غلط ہے۔ معدہ، جگر اور آنتیں بھی آپ کے جسم کا نازک حصّہ ہیں۔ ان کی نزاکت اور اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر ضرورت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ غذا اعتدال سے کھانی چاہیے اور سادگی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ حلوائیوں کی مٹھائیاں، پراٹھے، لال روٹی، قورما، بریانی۔ یہ چیزیں مزے دار ضرور ہوتی ہیں، مگر روزانہ اُن کا کھانا کسی طرح بھی اچھا نہیں ہے۔ آپ مناسب ورزش کریں۔ اس سے ہضم کے نظام کو طاقت ملے گی۔ آنکھوں کے لیے آپ مغز بادام کھائیے۔ اس میں حیاتین ب ۱۸ دریافت ہوا ہے جو ذہن کو طاقت اور جِلا دیتا ہے۔

سیاہ حلقے

س: میں سیکنڈ ایر کا طالبِ علم ہوں، میری آنکھوں کے نیچے کالے اور نیلے حلقے پڑ گئے ہیں، جس سے چہرہ بدنما نظر آتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے معائنہ بھی کروایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جسم میں خون کی کمی کی وجہ سے یہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر کا یہ بھی کہنا ہے کہ جسم میں خون پیدا ہونے سے ہی سیاہ حلقے ختم ہوں گے۔ ویسے میں صحت مند ہوں۔ اعجاز احمد مغل، حیدر آباد

ج: اس قسم کے حلقہ ہائے سیاہ بلاشبہ فقر الدم (اینیمیا۔ خون کی کمی) کی علامت ہوا کرتے ہیں، مگر یہ اس حقیقت کے بھی غماز ہوتے ہیں کہ انسان نے اپنی قوتوں کا بے جا استعمال کیا ہے۔ یاد رکھیے انسانی جسم کی ہر قوت اہمیت رکھتی ہے اور اس کا بے جا استعمال نادانی ہے اور صحیح استعمال دانائی ہے۔

سانس پھولنا

س: میں دوڑتا ہوں تو میرا سانس پھول جاتا ہے اور میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ ازراہِ نوازش آپ کوئی علاج بتائیے۔ محمد خالد اعوان، حیدر آباد

ج: جب انسان دوڑ لگاتا ہے تو فطری طور پر اُس کا سانس پھولتا ہے۔ یہ تو کوئی مرض نہیں ہے۔

ہاں بھاگنے کے بعد دردِ سر ہو جانا ضرور غور طلب ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ ضرورت سے زیادہ دوڑتے ہیں اور اس وجہ سے تکان ہو جاتی ہے۔ تھکن سے بہر حال بچنا چاہیے۔

سر میں درد

س: میری عمر ۱۳ سال ہے، میں جب بھی کوئی جسمانی یا ذہنی کام کرتا ہوں تو میرے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا ہے اور دونوں کنپٹیوں کی رگیں پھڑکنے لگتی ہیں۔ دائیں آنکھ کی بھووں کے اوپر درد کی شدید ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔ جب میں مطالعہ کرتا ہوں تو بھی دائیں آنکھ میں درد ہوتا ہے اور اس سے پانی بہتا ہے۔

س۔گ۔ج، کراچی

ج: آپ کو کسی ماہرِ چشم سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرانا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی نگاہ کم زور ہو گئی ہے۔ مطالعے سے آنکھوں پر دباؤ پڑتا ہے اور پھر اس سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور ان میں درد ہو جاتا ہے۔

کیا دمے کا علاج ہو سکتا ہے

س: دمے کا مکمل علاج ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاج کے بارے میں تفصیل سے بتائیے؟

حامد فضل، کراچی

ج: اگر مرض بڑھ جائے تو واقعی مستقل علاج اکثر حالات میں ممکن نہیں ہوتا، مگر بعض کیفیات آب و ہوا کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں، مثلاً ایک انسان کو کراچی میں دمے کے دورے پڑتے ہیں مگر وہ کراچی سے باہر قدم رکھتا ہے تو دمہ ختم ہو جاتا ہے۔ طبِ مشرق میں آب و ہوا کو زبردست اہمیت حاصل ہے، جس کی تائید زمانہ حاضر میں بھی ہوتی رہتی ہے۔

نظر کم زور ہے

س: میری عمر ۱۳ سال ہے، دور کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، براہ مہربانی کوئی علاج بتا کر شکریہ کا موقع دیں۔

طفیل احمد، کراچی

ج: مناسب ہے کہ آپ پہلے اپنی آنکھ کا امتحان کرائیں۔ اگر ماہرِ چشم عینک تجویز کرے تو عینک لگا لیجیے۔ اس کے بعد آپ احتیاط کیجیے کہ جب پڑھیں، مطالعہ کریں تو روشنی کافی ہونی چاہیے۔ مصنوعی روشنی بہر حال نقصان دہ ہے۔ اگر لیمپ استعمال کرنا ہے تو روشنی بائیں طرف سے آنی چاہیے۔ کتاب دُور رہنی چاہیے۔ جُھک کر پڑھنا اچھی عادت نہیں ہے۔

الائیڈ بینک : پہلا پاکستانی بینک

ہمیں فخر ہے کہ الائیڈ بینک سرزمینِ پاکستان پر
قائم ہونے والا پہلا بینک ہے۔

۱۹۴۲ء میں قائم شدہ الائیڈ بینک کو چالیس برس
کا پیشہ ورانہ تجربہ اور بینکاری کی وسیع مہارت
حاصل ہے۔

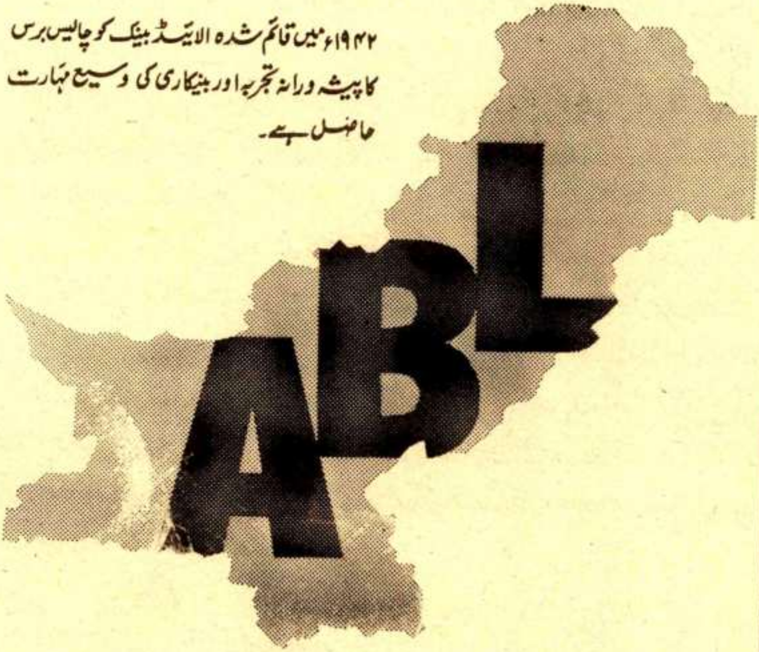

اپنی ۶۹۹ اندرون ملک اور بیرونی شاخوں کے ساتھ
الائیڈ بینک حقیقی معنوں میں ایک قومی بینک ہے۔

ان شاخوں کی مدد سے الائیڈ بینک آپ کی بھیجی ہوئی
رقوم کو پاکستان کے گوشے گوشے میں جلد از جلد
پہونچاتا ہے۔

ABL

الائیڈ بینک
آف پاکستان لمیٹڈ
- خدمت کے ایک نئے جذبے کے ساتھ

PID (Islamabad)

Paragon ● ABL- 27 R

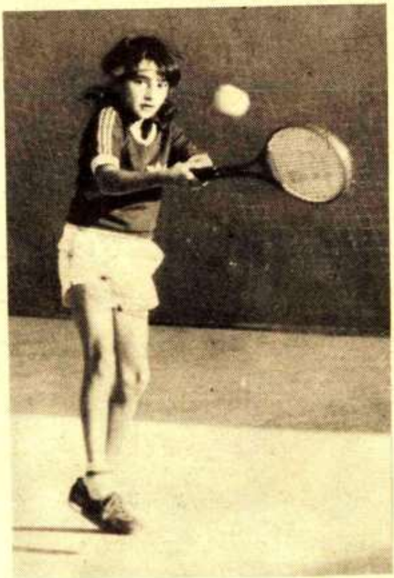

چھوٹی لڑکی بڑی کام یابی

کھیلوں کی دنیا میں کبھی کبھار کوئی چھوٹی لڑکی بھی بڑی کام یابی حاصل کر لیتی ہے۔ بارہ سالہ فرح رشید نے بھی ایک اچھا کارنامہ کر دکھایا ہے۔ کچھ عرصے پہلے انھوں نے گورنر کپ ٹینس فائنل میں خود سے دوگنی عمر کی کھلاڑی فاطمہ گاباجی کو ہرایا اور اچھی خاصی دھوم مچادی۔ فرح اپنی اسی کام یابی پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گئیں بلکہ وہ ایشیائی جونیئر ٹینس چیمپین شپ میں حصہ لینے ٹوکیو گئیں وہاں انھیں اس ایشیائی زون کی ٹیم میں چُن لیا گیا جو عالمی جونیئر ٹینس چیمپین شپ میں حصہ لے گی۔

فرح کے والدین ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان سے کراچی آئے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں فرح کراچی میں پیدا ہوئیں۔ گھر میں تقریباً سب ہی کو کھیلوں سے لگاؤ ہے۔ اس لیے فرح چھوٹی ہی تھیں کہ کے ایم سی ٹینس کورٹ جانے لگیں۔ سات سال کی عمر میں انھوں نے ٹینس شروع کی اور دس گیارہ سال کی عمر میں ہی وہ ٹینس ٹورنامنٹس میں حصہ لینے لگیں۔ انھوں نے اسی عمر میں سیمی فائنل اور فائنل میں پہنچنا شروع کر دیا۔ فائنل میں اگر اُن سے بہت زیادہ سینیر کھلاڑی ہوتا تو اس سے ہار جاتی تھیں، پھر بھی لوگ انھیں بہت شاباش دیتے تھے کہ اتنی چھوٹی سی لڑکی اتنا اچھا کھیل رہی ہے۔

لیکن اس مرتبہ تو فرح نے کمال کر دیا۔ گورنر کپ ٹینس ٹورنامنٹ میں کوارٹر فائنل میں شمع خان کو، سیمی فائنل میں ناہید صدیقی کو اور فائنل میں فاطمہ آپا جی کو شکست دی، جن کی عمر اُن سے تقریباً دُگنی ہے۔

فرح سے آپ ملیں تو دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ لڑکی واقعی اتنی چھوٹی اور پیاری سی ہے اور وہ آپ کی توقع سے زیادہ اعتماد سے بولتی ہے۔ مثلاً جب ہم نے فرح سے گورنر کپ فائنل میں جیتنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا:

"فاطمہ باجی نے اُس دن اتفاق سے کئی غلطیاں کیں۔ میں جب بھی ریلیاں چلاتی تھی فاطمہ غلطی کر جاتی تھیں۔ (ٹینس میں جب دونوں کھلاڑی کافی دیر تک گیند ایک دوسرے کی طرف پھینکتے رہیں، ان میں سے کوئی غلطی نہ کرے اور کھیل کا تسلسل برقرار رہے تو اسے "ریلی" کہتے ہیں) میں نے اس دن سروس بھی اچھی کی۔ پھر میرا خیال ہے پچھلے دنوں میں جونیئر ٹینس ٹیم کے ساتھ فلپینز اور سنگاپور گئی تھی۔ اس دورے میں بھی میرا کھیل خاصا بہتر ہوا۔

آپ کون سے اسکول میں پڑھتی ہیں؟

"کراچی گرامر اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔ ٹینس کے علاوہ ٹیبل ٹینس کی بھی چیمپین ہوں۔ اس کے علاوہ تیراکی اور کرکٹ میں بھی حصّہ لیتی ہوں۔ بیس بال بھی کھیلتی ہوں۔"

حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بہت سارے کھیل کھیلنے کے باوجود فرح پڑھائی پر بھی پورا دھیان دیتی ہیں۔ کلاس کی اچھی طالبات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سائنس اور حساب اُن کے مضامین میں شامل ہیں۔ فرح کے والدین نے بتایا کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ فرح کے کھیل سے اس کی پڑھائی متاثر نہ ہو۔ کبھی ایسا وقت آیا تو وہ پڑھائی پر فرح کے کھیل کو قربان کر دیں گے۔ فرح کے والد پروفیسر خورشید صدیقی این ای ڈی انجینئرنگ یونی ورسٹی میں پروفیسر رہے ہیں اور آج کل اپنا انجینئرنگ کا ایک ادارہ چلا رہے ہیں۔

فرح ننھی سی ہے، لیکن نہ صرف پسندیدہ کھلاڑیوں کے نام بتاتی ہے بلکہ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ کھلاڑی اسے کیوں پسند ہیں:

"مجھے پاکستانی کھلاڑیوں میں عالیہ ناصر پسند ہیں، کیوں کہ وہ بڑے اچھے شاٹس کھیلتی ہے۔ خاص طور پر جب اُسے بیس لائن پر گیند ملتی ہے تو وہ بڑا اچھا جوابی شاٹ کھیلتی ہے۔ (ٹینس میں بیس لائن کورٹ کی پچھلی لائن کہلاتی ہے۔) غیر ملکی کھلاڑیوں میں مارٹینا نبور تلووا بہت اچھی لگتی ہیں، کیوں کہ

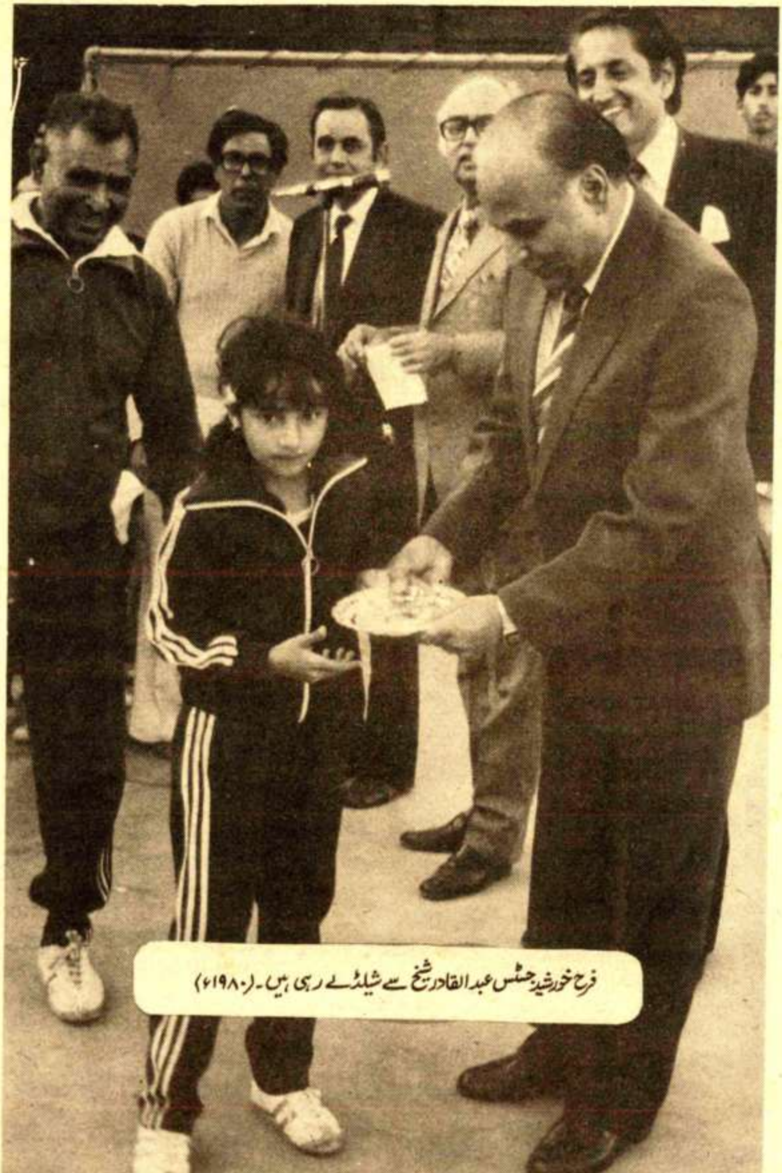

فرح خورشید جسٹس عبدالقادر شیخ سے شیلڈ لے رہی ہیں۔ (۱۹۸۰ء)

وہ بڑے طاقت ور شاٹس کھیلتی ہیں۔ ان کی پلیسنگ (PLACING). بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔"

اب فرح خورشید کے سامنے پہلی منزل ورلڈ جونیئر ٹینس چیمپین شپ ہے، جو ستمبر میں فلوریڈا (امریکا) میں کھیلی جائے گی۔ وہ چھے رُکنی ایشیائی ٹیم کی طرف سے کھیلیں گی۔ یہ ٹیم ایشیا کی تیرہ کھلاڑیوں میں سے منتخب کی گئی ہے، جس میں شمولیت خود فرح اور پاکستان کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔

فرح خورشید ٹینس کی عالمی معیار کی کھلاڑی بننا چاہتی ہیں۔ یہ منزل اُن سے ابھی بہت دُور ہے، لیکن چوں کہ انھوں نے چھوٹی سی عمر میں یہ سفر شروع کر دیا ہے، اس لیے امید ہے ایک دن ان کا وہ خواب پورا ہو جائے گا جو انھوں نے چھُٹپن میں دیکھ لیا ہے۔

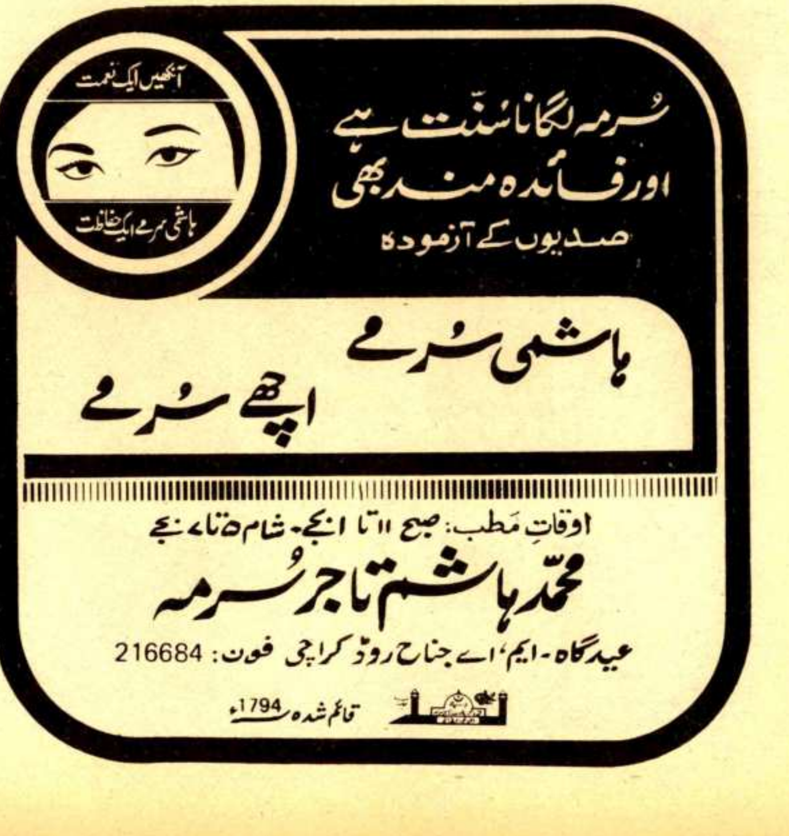

تحفے

مُسکراتے جُملے — عظیم اقوال — انوکھے نکتے — دل چسپ تحریریں

ارشاداتِ علیؓ

مرسلہ: ملک نور محمد، میانوالی

● سب سے زیادہ سخت وہ گناہ ہے جو کرنے والے کی نظر میں چھوٹا ہو۔

● جب کسی احسان کا بدلہ ادا کرنے سے تیرے ہاتھ قاصر ہوں تو زبان سے شکریہ ادا کر۔

● جب تو کمزوروں کو کچھ دے نہیں سکتا تو ان سے مہربانی سے پیش آ۔

● بوڑھے کی رائے جوان کی طاقت و زور سے زیادہ اچھی ہے۔

● آدمی کے چہرے کا حُسن خدا تعالیٰ کی عمدہ امانت ہے۔

ایک شعر

مرسلہ: گل رعنا منگی، لاڑکانہ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

—— علامہ اقبالؒ

گناہ کا ازالہ

مرسلہ: گل خان نیازی، کراچی

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، "یا رسول اللہ میں ایک بڑا گناہ کر بیٹھا ہوں۔ کیا کفّارے کی کوئی صورت ہے؟" آپؐ نے پوچھا، "تیری ماں ہے؟" اس نے جواب دیا، "جی نہیں۔" آپؐ نے پوچھا، "تیری خالہ ہے؟" اس نے جواب دیا، "جی ہاں۔" آپؐ نے فرمایا، "تُو ان کے ساتھ اچھا سلوک کر۔"

گِدھ اور چیل کا مکالمہ

مرسلہ: محمد جاوید شفیع، کراچی

ایک گِدھ نے ایک چیل سے کہا، "دنیا میں مجھ سے زیادہ کسی کی نظر تیز نہیں ہوگی۔" چیل نے کہا، "ایسی ڈینگیں نہیں مارنی چاہییں، مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تیری نظر مجھ سے بھی زیادہ تیز ہوگی۔"

گِدھ اترا کر بولا، "دیکھو، گندم کا ایک دانہ زمین پر پڑا ہے۔ کیا تم اُسے دیکھ سکتی ہو؟" چیل حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی اور پھر بولی "اس کا کیا ثبوت ہے کہ تُو سچ کہہ رہا ہے۔"

گِدھ نے جھلّا کر کہا، "اس کا ثبوت پیش کرنا کون سا مشکل کام ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی اُڑان اور نظر کی تیزی کے گھمنڈ میں گندم کے دانے پر جھپٹا۔ وہاں کسی شکاری نے جال بچھا رکھا تھا، گدھ اس میں پھنس گیا اور اس کی ساری

شیخی دھری رہ گئی۔

چیل نے چلا کر کہا، "کم بخت، گندم کے اس دانے کو دیکھنے سے کیا فائدہ جب تجھے اتنا بڑا جال نظر نہ آیا۔"

یتیم کا درد

مرسلہ: شبانہ پروین، کراچی

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا اور اپنا سر باپ کی گود میں رکھتا تھا تو میری قدر و منزلت بادشاہوں جیسی ہوتی تھی۔ اگر میرے جسم پر ایک مکھی تک بیٹھ جاتی تھی تو سب گھر والے پریشان ہو جاتے تھے۔ جب بچپن ہی میں میرے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا تو مجھے بچّوں کے درد کی خبر ہوئی۔ یہ درد وہی جان سکتا ہے جس کو یتیمی کا داغ لگا ہو۔ اے دوست، جس بچّے کا باپ مر گیا ہو اُس کے سر پر ہاتھ رکھ، اُس کے چہرے سے گرد پونچھ اور اس کے پاؤں سے کانٹا نکال۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس پر کیسی بپتا پڑی ہے۔ بے جڑ کا درخت ہرگز تازہ نہیں ہوتا۔ جب تو کسی یتیم کو اپنے سامنے سر ڈالے دیکھے تو اپنے فرزند کے رخسار پر بوسہ نہ دے۔ یتیم اگر روتا ہے تو اس کا ناز کون اُٹھاتا ہے۔ اگر وہ غصہ کرتا ہے تو اس کو کون برداشت کرتا ہے۔ خبردار یتیم رونہ پڑے کہ اُس کے رونے سے عرشِ الٰہی کانپ جاتا ہے۔ محبّت سے اُس کی آنکھ کے آنسو پونچھ دے اور مہربانی سے اس کے چہرے سے خاک جھاڑ دے۔ اگر اس کے سر سے سایہ اُٹھ گیا ہے تو تُو اپنے سائے میں اس کی پرورش کر۔

یاد داشت

مرسلہ: سید آصف مصطفٰے، کراچی

ہمیں ذاتی طور پر ان آزادیوں کو برتنے کا شوق وہاں تو کیا ہوتا یہاں بھی کبھی نہیں ہوا۔ بس ایک دو بے ضرر سی رعایتیں معاشرے سے لے رکھی ہیں جنھیں وقتاً فوقتاً استعمال کر لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھول جانے اور اپنی چیزیں کھو بیٹھنے یا چوری کرنے کی بھی ہے۔ عادت سے مجبور چین میں بھی ہم نے اسے بے دریغ استعمال کیا۔ پکنک سے چلتے وقت ہم اپنا ایک پاجامہ غسل خانے میں لٹکا چھوڑ آئے تھے، اس کی ہمیں ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے پاس اور پاجامے بھی تھے، لیکن بہرحال ہماری روایتی بھول سے ایسا ہوا۔ وہاں سے دوہان پہنچ کر ابھی ہم دَم بھی نہ لینے پائے تھے کہ ہوٹل والوں نے ایک پیکٹ دیا جس میں ہمارا پاجامہ دُھلا دھلایا، استری شدہ اور ایک عدد چپل پالش اور مرمت شدہ نفاست سے لپٹی ہوئی پائی گئی۔ پاجامہ ہمارا تھا اور چپل ہمارے دوست ڈاکٹر انعام الحق کی تھی۔ —— ابنِ انشا

انسان

مرسلہ: شکیل احمد جمیل، کراچی

انسان اس جہاں میں اپنی مرضی کے بغیر آتا ہے اور اپنی خواہش کے بغیر چلا جاتا ہے۔ اتنی مختصر مدت میں اس کو نہ کوئی سمجھتا ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بچپن میں فرشتہ، جوانی میں شیطان اور بڑھاپے میں احمق سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد ہر شخص اسے

چومتا ہے، دنیا سے جانے سے پہلے اُسے ٹھوکریں مارتا ہے، لیکن اگر وہ جوانی میں مرجائے تو دنیا کہتی ہے کہ ہونہار تھا۔

سبق

مرسلہ: محسن رجب علی، نواب شاہ

ترقی یافتہ ممالک میں یہ رجحان عام ہے کہ تعلیم نہایت آسان اور تفریح روز بہ روز مشکل ہوتی جارہی ہے۔ (مثلاً بی اے کرنا آسان ہے بہ نسبت برج اور فٹ بال سیکھنے کے)۔ ریڈیو، ٹیلے وژن، سینما اور باتصویر کتابوں نے اب تعلیم کو بالکل آسان اور عام کر دیا ہے، لیکن کھیل دن بہ دن گراں اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں لہٰذا بعض غبی لڑکے کھیل سے جی چُرا کر تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔ اس سے جو سبق آموز نتائج رونما ہوئے وہ سیاست دانوں کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہیں۔ ——— مشتاق احمد یوسفی

لاہور ایک صوبہ

مرسلہ: نازیہ رمضان، کراچی

لاہور پنجاب میں واقع ہے، لیکن پنجاب اب "پنج آب" نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پُل بنے ہوئے ہیں، ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ لاہور شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حُدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا، لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بہ روز واقع تر ہورہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔

——— پطرس شاہ بخاری

فضول خرچ

مرسلہ: لبنیٰ شاہین، اسلام آباد

ماہر تحریر کے پاس ایک بوڑھی عورت کسی بچے کی تحریر لائی۔ ماہرِ تحریر نے غور سے اس تحریر کو دیکھنے کے بعد کہا: "محترمہ! شاید آپ اس بچے کی ماں ہیں، مگر میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ بچّہ انتہائی فضول خرچ اور بدتمیز ہے۔ بڑا ہو کر یہ کوئی اچھا کام نہ کر سکے گا۔" اس پر بوڑھی عورت بولی: "مگر یہ تو تمھاری بچپن کی تحریر ہے اور شاید تم بھول گئے کہ میں تمھیں پڑھایا کرتی تھی۔"

قیمتی مشورہ

مرسلہ: ریشماں امیر غوری

ایک سارجنٹ نے پُل سے دریا میں کود کر خودکشی کرتے ہوئے شخص کو پکڑ لیا اور بولا،

"اگر تم نے دریا میں چھلانگ لگائی تو مجبوراً تمھیں بچانے کے لیے مجھے بھی پانی میں کودنا پڑے گا۔ سردی کا موسم ہے اور دریا کا پانی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ جب میں تمھیں باہر نکال کر لاؤں گا اور ایمبولینس

کی آمد کا تمھارے ساتھ کنارے پر لیٹ کر آدھے گھنٹے انتظار کروں گا تو ہم دونوں کو ڈبل نمونیا ہو چکا ہو گا۔ ہسپتال تک پہنچنے سے پہلے ہم دونوں دم توڑ چکے ہوں گے۔ مجھے تمھاری بدقسمتی کا یقین ہے، مگر میں نے کیا قصور کیا ہے۔ اچھے اور شریف آدمی بنو، گھر جاؤ اور پنکھے میں رسّی ڈال کر لٹک جاؤ، شاباش۔"

غدّار

مرسلہ: سیف الرحمٰن کلسی، شاہ پور چاکر

گزشتہ آٹھ صدیوں سے کروڑوں چینی ایک ایسی شخصیت کے نام پر تھوک رہے ہیں جو غدّار ثابت ہوا۔ چن کوئی (۱۰۹۰ء تا ۱۱۵۵ء) شہنشاہ کاؤسو کا وزیر دربار تھا۔ اس نے چین کا ایک حصّہ بیرونی دشمن کے حوالے کر دیا تھا۔ چناں چہ قوم نے نفرت کے اظہار کے طور پر اُگال دان کا نام "چن کوئی" رکھ دیا۔ تاکہ آنے والی نسلیں نہ صرف اس غدار کو یاد رکھیں بلکہ اس کے نام پر تھوکیں۔

بازی

مرسلہ: سید فرحت حسین جیلانی، کراچی

ہم بُری طرح جنگ ہار رہے تھے۔ ہمارا بادشاہ بوڑھا اور کم زور تھا۔ وہ بہ مشکل حرکت کر سکتا تھا۔ وہ قلعے کی فصیل میں پناہ لیتے ہوئے بے بسی سے جنگ دیکھ رہا تھا اور ہم آخری تین سپاہی اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ہم لوگ جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے میدانِ جنگ صاف نظر آ رہا تھا، جہاں ہماری ملکہ دو درباریوں کے ساتھ دشمنوں کی یلغار روکے ہوئے تھی۔ ملکہ تھی تو سیاہ فام مگر بے حد خوب رو اور بہادر تھی۔ وہ دشمن کے نرغے میں بھی باوقار لگ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دشمن کے دو اور سردار ڈھیر کر دیے، مگر جلد دشمن کے ایک لیم شیم سپاہی نے قریب آ کر ہماری ملکہ اور اس کے ساتھیوں پر بڑا شدید حملہ کیا، جس کی تاب نہ لاتے ہوئے ملکہ کے دو آخری درباری بھی جان سے گئے۔

اب وہ غریب تنہا دشمن کے نرغے میں تھی۔ وہ جلد ہی پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سرتاج پر قربان ہو گئی۔ دشمن کے چند سپاہی اور افسر ہمارے سروں پر آ پہنچے اور جلد ہی ہم میں سے دو سپاہی اور کم ہو گئے۔ اب میں اور میرا بادشاہ تنہا تھے۔ شکست ہمارے سامنے موت کی صورت میں ناچ رہی تھی۔ میں نے بادشاہ کو لے کر فرار ہونے کی کوشش کی، مگر جیسے ہی بادشاہ نے ایک قدم میرے پیچھے بڑھایا میں نے دشمن کا فاتحانہ نعرہ سُنا: "شہ مات" شطرنج کی ایک بازی ختم ہو چکی تھی۔

سائنس دانوں کی بھول

مرسلہ: نگہت رسول، راول پنڈی

● ایڈیسن ایک بہت مشہور سائنس داں تھا۔ مکان کا ٹیکس جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی، لیکن وہ ایک سائنسی تجربے میں الجھا ہوا تھا۔ اسی حالت میں ٹیکس جمع کروانے چل دیا۔ راستے میں اسی تجربے کے متعلق سوچتا رہا، یہاں تک کہ قطار میں بھی کھڑا سوچتا رہا اور جب اس کی باری آئی تو کلرک نے اس کا نام پوچھا تو کچھ

دیر وہ کھڑکی کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ آخر ٹیکس جمع کروائے بغیر وہ قطار سے نکل آیا۔ اس کو اپنا نام یاد ہی نہیں آیا۔

آئزک نیوٹن ایک بہت بڑا سائنس داں تھا۔ وہ ہر وقت اپنے سائنسی تجربوں میں منہمک رہتا تھا۔ ایک بار اُس نے ایک دوست کو کھانے کی دعوت دی۔ اُس کا دوست مقررہ وقت پر پہنچ گیا، مگر نیوٹن اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا کام کرتا رہا۔ نیوٹن کے دوست نے اُس کا خاصی دیر انتظار کیا، پھر تنگ آکر ڈرائنگ روم میں جاکر خود ہی کھانا کھانے لگا اور سارا کھانا کھا گیا۔ نیوٹن کے لیے کچھ نہ بچایا۔

بہت دیر کے بعد نیوٹن کو کھانے اور مہمان کا خیال آیا وہ دسترخوان پر پہنچا۔ اُس کے دوست نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا اور نہ یہ بتایا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے۔ نیوٹن نے قاب سے ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا تو صرف بچی کھچی ہڈیاں پڑی تھیں۔ نیوٹن نے شرمندگی سے اپنے دوست سے کہا:

"ارے میں تو کھانا کھا چکا ہوں۔ دوست معاف کرنا تمھیں بھول ہی گیا تھا۔"

شاعر کی صفائی

مرسلہ: اسد رحمان، ساہیوال

ایک شاعر کو کسی جرم میں پولیس نے گرفتار کرلیا۔ عدالت میں مقدمہ چلا۔ جب پولیس اپنے گواہ پیش کرچکی تو جج صاحب نے شاعر سے پوچھا:

"آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟"

شاعر نے جواب دیا:

"جی ہاں، اپنی تازہ غزل سنانا پسند کروں گا۔"

اردو

مرسلہ: عظمیٰ رؤف، کراچی

ایک یونی ورسٹی کے کسی سُوٹ پوش سے
میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ؟
کہنے لگے، جناب سے مس ٹیک ہوگئی
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈپارٹمنٹ

——— دلاور فگار

گاجر

مرسلہ: حافظ احمد ولی اللہ، سکھر

گاجر سب سے بہتر جڑ والی سبزی ہوتی ہے اور سب سے زیادہ مزے دار ہوتی ہے۔ اندرونِ سندھ میں اسے "سندھی گجر" کہتے ہیں جب کہ شکر قندی کو "لاہوری گجر" کہا جاتا ہے۔ گاجر کا کچا کھانا یا اس کا رَس نکال کر پینا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ گاجر وٹامن اے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کی ایک سو گرام مقدار میں وٹامن اے کے دس سے بیس ہزار تک یونٹ ہوتے ہیں۔ وٹامن اے کے علاوہ گاجر میں کیلشیم، فاسفورس، سوڈیم، بی گروپ کے وٹامن اور کچھ وٹامن سی، آئرن اور تانبا بھی ہوتا ہے۔ نارنجی رنگ کی نرم و تازہ گاجر سب سے زیادہ صحت بخش

ہوتی ہے۔

اس کی ایک سو گرام مقدار میں پچاس حرارے (کیلوریز) ہوتے ہیں۔

نصیحت

مرسلہ: سہیل احمد، دولت نگر

علامہ اقبال ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تو علامہ کے صاحب زادے جاوید اقبال نے جن کی عمر اس وقت سات برس تھی اور جن کو موسیقی سے لگاؤ تھا، اپنے والد کو ایک خط میں لکھا کہ جب آپ انگلستان سے واپس آئیں تو میرے لیے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ علامہ اقبال گراموفون تو نہ لا سکے، لیکن انھوں نے جاوید اقبال کے خط کا جواب مندرجہ ذیل نظم کی صورت میں ارسال کیا:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

عقل و دانش

مرسلہ: انعام الحق اشرف، کراچی

کہتے ہیں کہ عقل جب حکیم لقمان کے پاس آئی تو انھوں نے پوچھا، "تُو کون ہے، کہاں رہتی ہے؟" اس نے جواب دیا، "میں عقل ہوں، انسان کے سَر میں رہتی ہوں۔"

پھر شرم ان کے پاس آئی، اس سے بھی پوچھا، "تُو کون ہے، کہاں رہتی ہے؟" اس نے کہا، "میں شرم ہوں، زیرِ چشم رہتی ہوں۔" اسی طرح محبت آئی اس سے بھی لقمان نے پوچھا، "تُو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟" اس نے کہا، "میں محبت ہوں، انسان کا دل میرا مَسکن ہے۔" اب تقدیر آئی، اس سے پوچھا، "تُو کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟" اس نے جواب دیا، "میں تقدیر ہوں سَر میں رہتی ہوں۔" لقمان نے کہا، "وہ تو عقل کا نشیمن ہے۔" عقل بولی، "جب تقدیر آتی ہے تو میں رخصت ہو جاتی ہوں۔" اب عشق آیا، اس سے بھی دریافت کیا، "تُو کون ہے، کہاں رہتا ہے؟" جواب ملا، "میں عشق ہوں، آنکھ میں رہتا ہوں۔" لقمان نے کہا، "وہاں تو شرم رہتی ہے۔" اس نے جواب دیا، "جب عشق آتا ہے تو شرم اُٹھ جاتی ہے۔" بالکل آخر میں طمع آئی اس سے پوچھا، "تُو کون ہے، کہاں رہتی ہے؟" کہا، "میں طمع ہوں دل میں رہتی ہوں۔" لقمان نے کہا، "اس جگہ تو محبت رہتی ہے۔" جواب دیا، "جب طمع آتی ہے تو محبت اُٹھ جاتی ہے۔"

اتحاد و اتفاق کا دوسرا نام امن و راحت ہے

مسعود احمد برکاتی

آپ کو کوئی کام ہو، آپ خود وہ کام نہیں کر سکتے، کسی دوسرے کی مدد چاہیے۔ آپ اُس سے کہتے ہیں، وہ فوراً کر دیتا ہے۔ آپ کو کتنا سکون ملتا ہے۔ کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے کا کام آپ نے کر دیا تو اس کو کتنا اطمینان ہوا۔ ایسا سکون اور اطمینان جس قوم میں ہو، جس ملک اور جس معاشرے میں ہو وہ کتنی اچھی قوم اور کتنا اچھا معاشرہ ہو گا۔

آپ کسی خاندان کو دیکھتے ہیں کہ اس کے سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، ایک دوسرے کی بھلائی سے خوش ہوتے ہیں تو وہ خاندان کتنا خوش قسمت اور خوش حال معلوم ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اسی قسم کا ایک بڑا خاندان ہو، بہت بڑا، تو اس کو معاشرہ یا سوسائٹی یا سماج کہتے ہیں۔ جس طرح کسی خاندان کے لوگ آپس میں پیار محبّت سے رہ سکتے ہیں، میل ملاپ سے کام کر سکتے ہیں، اسی طرح کسی معاشرے یا سماج کے افراد بھی اتحاد و اتفاق سے رہ سکتے ہیں اور اسی خلوص اور اُنس سے دوسروں کے کام آسکتے ہیں۔

میں یہاں چند اصول لکھتا ہوں۔ اگر ہم ان اصولوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں تو ہمارے سماج میں بھی سکون و راحت کی چاندنی چھٹک سکتی ہے اور امن چین کا دَور دورہ ہو سکتا ہے۔

کسی معاشرے کی بھلائی، خوشی، خوش حالی کا بنیادی نکتہ یہ سمجھنا ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اسی نکتے پر تمام اصولوں کی بُنیاد ہے۔

۱۔ ایک بھائی درد میں مبتلا ہو تو دوسرا بھائی بھی تڑپے۔

۲۔ ایک بھائی کے فائدے کو دوسرا بھائی اپنا فائدہ سمجھے، جلے کُڑھے نہیں بلکہ خوش ہو۔

۳۔ اپنے بھائی کی ترقی دیکھ کر اس کو گرانے کی کوشش کے بجائے اپنے آپ کو اس کے برابر اونچا لے جانے کی کوشش ہو۔

۴۔ دو بھائیوں میں لڑائی ہو تو تیسرا بھائی اس کو بڑھانے کے بجائے روکنے اور ختم کرنے کی

کوشش اور صلح صفائی کے لیے ہر تدبیر کرے۔

۵۔ دو بھائیوں میں غلط فہمی ہو تو کوئی تیسرا بھائی اس کو دُور کرنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کرے۔

۶۔ ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے کسی بات پر اختلاف ہو یا اس کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو وہ اس کو بُرا نہ سمجھے۔ اپنی رائے کو صحیح سمجھتا ہو تو بے شک اس پر قائم رہے، لیکن اپنے بھائی کو بھی اس کی رائے پر قائم رہنے کا حق دے۔ الگ الگ رائے رکھنے کے باوجود دو آدمی بھائی اور دوست رہ سکتے ہیں۔

۷۔ اگر کسی بھائی سے لڑائی ہو جائے تو اس کو مستقل دشمنی نہ بنائے بلکہ ہر ایک اپنی طرف سے کوشش کرے کہ لڑائی بھول کر دوبارہ دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔

۸۔ اگر اپنے کسی بھائی میں کوئی خامی، عیب یا کم زوری دیکھے تو اس پر ہنسنے یا دوسروں کے سامنے اس کا مذاق اُڑانے یا ذکر کرنے کے بجائے دل اور زبان دونوں سے ہمدردی کا اظہار کرے۔

۹۔ کسی بھائی سے کوئی غلطی ہو جائے یا دُکھ پہنچ جائے تو اس کو معاف کر دے۔ بدلا لینے یا سزا دینے کی خواہش بھی نہ کرے۔

۱۰۔ تعریف سے ہر انسان خوش ہوتا ہے۔ اپنے بھائی میں جو خوبی دیکھے اس کی تعریف ضرور کرے۔

۱۱۔ کسی بھائی کی کوئی مدد کی ہو یا قرض دیا ہو یا اس پر کوئی احسان کیا ہو تو اس کو نہ جتائے۔

۱۲۔ کسی بھائی نے کوئی مدد کی ہو یا قرض دیا ہو یا احسان کیا ہو تو اس کو نہ بھولے۔

۱۳۔ اچھا کام کرنے والا کوئی بھی ہو اس کی تعریف کرے اور مدد کرے۔

۱۴۔ بُرائی کو مٹانے میں ایک دوسرے کی مدد کرے۔ بُرے کاموں میں مدد نہ کرنا بھی بُرائی مٹانے کا ایک ذریعہ اور ایک طریقہ ہے۔ مثلاً رشوت مانگنے والے کو رشوت نہ دیں تو یہ بھی بُرے کاموں میں مدد نہ کرنا یا عدم تعاون ہے، اور ایسا عدم تعاون نیکی میں شامل ہے۔

۱۵۔ صحیح اور اچھا مشورہ دینا بھی اپنے بھائی کی مدد کرنا ہے اور بہت بڑی نیکی ہے۔ اپنے بھائی کو بہترین مشورہ دو۔

۱۶۔ اپنے بھائی کی بھلائی چاہو اور اس کو بھلائی کا راستہ بتاؤ۔ خیر خواہی کا جذبہ اعلا اخلاق کی نشانی ہے۔

۱۷۔ پڑوسی کی تکلیف اور راحت کو اپنی تکلیف اور راحت سے زیادہ سمجھو۔

۱۸۔ اپنے بھائی کو کسی عیب یا بدی میں مبتلا دیکھو تو اس سے نفرت نہ کرو۔ ایک بیمار آدمی نفرت کا نہیں ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔ بدی کرنے والا بھی بیمار ہے۔ محبّت سے اس کو سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کرو۔

۱۹۔ مال اور دولت خوشی کا ذریعہ ہیں۔ خوشی میں اپنے بھائی بھی شریک ہوں تو خوشی دُگنی ہو جاتی ہے۔ اپنے مال میں اُن کو شریک کر کے اپنی خوشی بڑھاؤ۔

۲۰۔ اپنے بھائی کی بُرائی سُننے سے خوشی کے بجائے رنج ہونا چاہیے۔

۲۱۔ کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت، اس کی تیمار داری اور خدمت بھائی کا فرض ہے۔

۲۲۔ کسی نے کوئی چیز رکھوائی ہو تو اس کی حفاظت اپنی چیز سے زیادہ کرو۔

۲۳۔ اپنے بھائی کے راز کی حفاظت بھی امانت سمجھ کر کرو۔ اس نے تم پر بھروسا کر کے اپنا راز بتایا ہے۔ تم اس بھروسے کا حق ادا کرو۔

۲۴۔ ہر بھائی عزت اور احترام کا مستحق ہے۔ سب بھائی اس بات کو سمجھنے اور ماننے لگیں تو سب کی عزت ہونے لگے۔

۲۵۔ اپنے کو بڑا سمجھنا چھوٹا پن ہے۔ جو اپنے کو بڑا سمجھتا ہے وہ بڑا نہیں، جو دوسروں کو بڑا سمجھے وہ بڑا ہے۔

۲۶۔ سب برابر ہیں۔ فرق ہے تو اخلاق اور علم کی وجہ سے۔ صرف وہ بڑا ہے جس کے اخلاق اعلا ہیں اور جس کا علم زیادہ ہے۔

۲۷۔ اچھے کردار اور بلند اخلاق والے بھائیوں کو بڑا بھائی سمجھو۔ ان کی سب سے زیادہ عزت کرو۔

۲۸۔ مال و دولت کی زیادتی سے کوئی بڑا نہیں ہوتا، لیکن جو لوگ اپنا مال اپنے بھائیوں کی بھلائی اور خدمت کے لیے صرف کرتے ہیں، وہ عزت کے مستحق ہیں۔

۲۹۔ اپنے بھائی کے ساتھ انصاف کرو۔ انصاف امن کی بنیاد ہے۔ ناانصافی سے بے اطمینانی پھیلتی ہے۔

۳۰۔ سچّی بات کہو اور سچّی بات سُننے کا حوصلہ پیدا کرو۔

۳۱۔ کوئی تمھاری غلطی بتائے تو اس کا شکریہ ادا کرو، کیوں کہ اس نے تمھاری مدد کی ہے اور تمھیں سنبھلنے کا موقع دیا ہے۔

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۴ء

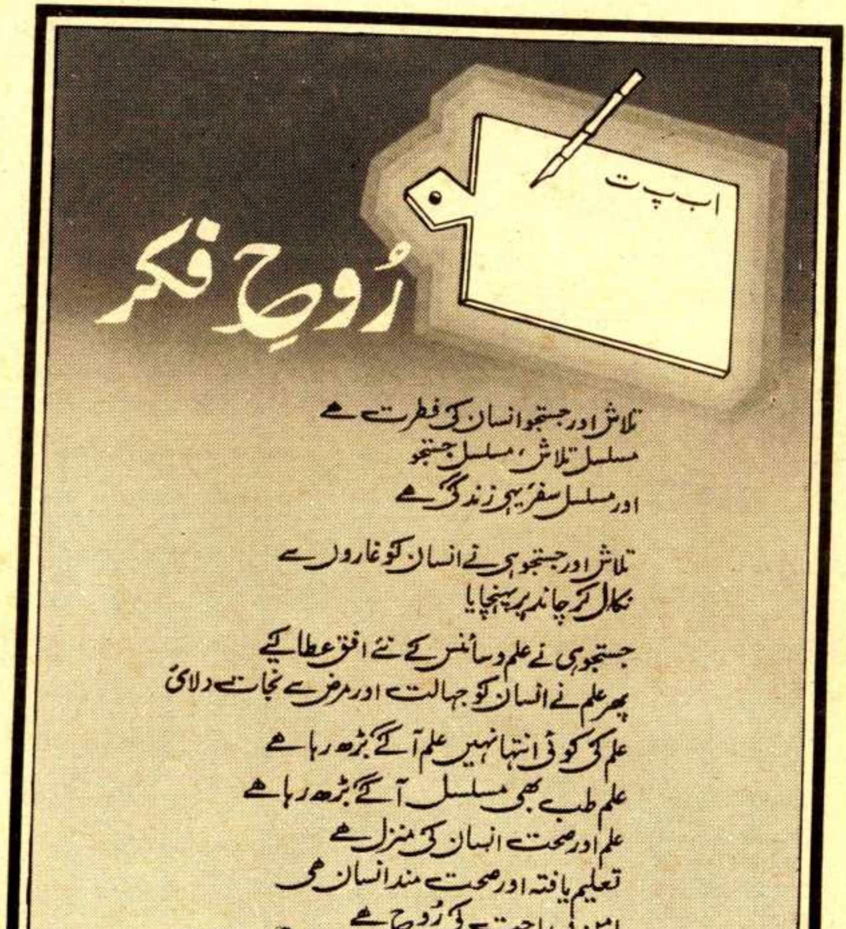

Adarts

HRA-3/84

یہ نہیں ہوگا

میرزا ادیب

کھیل میں کام کرنے والے

شاہدہ
سمیعہ
بشریٰ
غزالہ
عابدہ
سلیمہ
خالہ جان
شاہدہ کی امّی

اسٹیج پر شاہدہ کا کمرا۔

اس کمرے میں صوفے، کرسیاں ہیں اور فرش پر قالین بھی بچھا ہے۔ درمیان میں میز جس پر تازہ پھولوں کا گل دستہ خاصا نمایاں ہے۔ ایک کُرسی پر شاہدہ بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے میز کے اوپر ایک صندوقچہ پڑا ہے جس میں شاہدہ کی گڑیا نیلم کے کپڑے سلے سِلے ہوئے رکھے ہیں۔

شاہدہ نے اپنی بنی سجائی گڑیا نیلم کو دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے اور اس انداز سے اسے دیکھ رہی ہے جیسے اس کے لباس کو پرکھ رہی ہو۔ نیلم نے سُرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا ہے۔

شاہدہ: واہ وا۔ میری نیلم تو سچ مچ دلہن لگ رہی ہے سارے شرمانے لگیں۔ ٹھیک ہے دلہن شرمایا ہی کرتی ہے۔ اچھا دلہن رانی! تمھارا لباس تو بڑا ہی پیارا ہے پر دوپٹّا نہیں ہے۔ دوپٹّے بغیر دلہن کیسے بن سکتی ہے۔ تو بتاؤ نا کون سا دوپٹّا نکالیں تمھارے لیے۔ بھئی بتا بھی دو۔

(شاہدہ صندوقچے کا ڈھکنا اُٹھا کر اس میں سے نیلے رنگ کا چھوٹا سا دوپٹّا نکالتی ہے۔)

"یہ کیسا رہے گا؟"

(گڑیا کو دوپٹّا اوڑھاتی ہے اور ناپسندیدگی کے انداز میں اپنا سَر ہلانے لگتی ہے)

نہیں بھئی، یہ اتنا اچھا نہیں ہے۔ سرخ لباس پر سرخ دوپٹا ہی ہونا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔

کچھ تم بھی بولو دلھنیاں بی بی!

(شاہدہ گڑیا کا نیلا دوپٹا الگ کر کے تہ کر کے صندوقچے میں ڈالتی ہے اور ساتھ ساتھ بولتی بھی جاتی ہے)

"نیلم بی بی! تمھارے لیے درجنوں جوڑے اور درجنوں دوپٹے ہیں۔"

(صندوقچے میں سے سرخ دوپٹا نکالتی ہے اور گڑیا کو اوڑھاتی ہے)

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لو دلھنیاں تو بن گئی ہو، کچھ باتیں بھی سُن لو اور گرہ میں باندھ لو۔ دیکھو جس گھر میں جا رہی ہو، وہاں بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں کو پیار کرنا۔ کوئی بزرگ سامنے آئے تو یوں جھک کر سلام کرنا۔"

(شاہدہ بڑے ادب سے سَر جُھکا کر ہاتھ سے سلام کرتی ہے۔)

"یوں۔ سمجھ لیا نا؟"

(شاہدہ گڑیا کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ یکایک اس کا موڈ بدل جاتا ہے)

"میری نیلم! آج تُو اس گھر سے چلی جائے گی۔ تیری جُدائی کا دکھ تو ہے پر کیا کیا جائے بیٹیوں کی یہی قسمت ہے۔"

(شاہدہ خود شرما جاتی ہے)

"پال پوس کر بڑا کرو اور دوسروں کے حوالے کر دو۔"

(شاہدہ گاتی ہے۔ ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے بابلا)

"پر رونا دھونا کیا۔ یہ تو ہوتا رہا ہے۔ اللہ تیری قسمت نیک کرے۔ دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو۔ ہائے اللہ۔ میں کیسی باتیں کر رہی ہوں شرم آتی ہے۔ بھلا لڑکیاں بھی ایسی باتیں کرتی ہیں۔"

(دروازے کے باہر سے آواز آتی ہے۔)

"شاہدہ!"

(شاہدہ گڑیا صندوقچے کے اوپر رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے)

شاہدہ: آؤ سمیعہ!

(سمیعہ آتی ہے۔)

سمیعہ: واہ وا۔ (گڑیا پر نظر ڈال کر) دلھن تو سچ مچ دلھن لگتی ہے۔

شاہدہ: تو کیا جھوٹ موٹ دلھن لگے؟

سمیعہ: شاہدہ! تم تو یونہی خفا ہو جاتی ہو۔

شاہدہ: تم نے جو کہا ہے کہ دلھن سچ مچ دلھن لگتی ہے۔ دلھن ہے تو اسے دلھن ہی ہونا چاہیے۔ کیا میں ٹھیک نہیں کہتی؟

سمیعہ: بالکل ٹھیک کہتی ہے۔

شاہدہ: ذرا دیکھو تو۔

سمیعہ: دیکھ رہی ہوں۔

شاہدہ: خدا لگتی کہنا۔ ایسی خوب صورت دلھن دیکھی ہے کبھی۔

سمیعہ : ویسے تو غزالہ کی گڑیا بھی بڑی خوب صورت دلھن لگتی تھی، مگر تمھاری نیلم کا تو جواب ہی نہیں۔

(شاہدہ مسکراتی ہے)

شاہدہ : شان دار دلھن ہے اور شادی بھی شان دار ہوگی۔

سمیعہ بڑی تیاریاں کی ہوئی ہیں ؟

شاہدہ : اور کیا؟ ارے تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا۔

(سمیعہ شاہدہ کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

سمیعہ : شادی بھی شان دار۔ براتی بھی شان دار اور.... سب کچھ شان دار۔

شاہدہ : ارے تم اسے بھول ہی گئی ہو۔

سمیعہ : کسے شاہدہ ؟

شاہدہ : دلھن کا بیاہ کس سے ہوتا ہے ؟

سمیعہ : دلھن کا بیاہ کس سے ہوتا ہے؟ دلھا سے اور کس سے !

شاہدہ : تو تم میری نیلم کا شان دار دلھا کیوں بھول گئیں ؟

(سمیعہ خاموش رہتی ہے۔)

شاہدہ : تم نے دیکھا نہیں اسے بشریٰ کے گھر نہیں گئی تھیں ؟

(سمیعہ ہاں میں سر ہلا دیتی ہے۔)

شاہدہ : پھر کیا کہتی ہو ؟

سمیعہ : میں نے کہا شاہدہ بہن !

شاہدہ : ہوں !

سمیعہ : برات کب آئے گی ؟

شاہدہ : بھول گئی ہو۔ برات آئے گی شام پانچ بجے۔ سات بجے کھانا ہوگا۔ آٹھ بجے رخصتی۔

سمیعہ : شان دار پروگرام ہے۔

(شاہدہ سمیعہ کو غور سے دیکھتی ہے)

شاہدہ : تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا سمیعہ !

سمیعہ : کون سی بات کا ؟

شاہدہ : تم نے میری نیلم کے خوب صورت اور پیارے دلھا کا ذکر نہیں کیا۔

سمیعہ : اللہ مبارک کرے۔

شاہدہ : شکریہ۔ ہیں نا دلھا دلھن دونوں بڑے شان دار۔

سمیعہ : شان دار تو.... دونوں کے دونوں ہیں پر....

شاہدہ : پر کیا ؟

سمیعہ : میرا منھ نہ کھلواؤ شاہدہ بہن۔ مجھے اپنی دو سہیلیوں میں بد مزگی کچھ اچھی نہیں لگتی۔

شاہدہ : بدمزگی ؟ کیسی بدمزگی ؟

سمیعہ : سچّی بات سُن کر بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ میں چاہتی نہیں ہوں۔

شاہدہ : مگر بدمزگی ہوگی کیوں ؟
سمیعہ : خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تو یہ پوچھنے آئی تھی کہ کوئی کام ہو تو مجھے بتادو۔ بڑی خوشی سے کروں گی۔ آخر میری شاہدہ کی گڑیا کا بیاہ ہے۔
شاہدہ : شکریہ کام کیا ہوگا۔ سب تیاری ہو چکی ہے۔
سمیعہ : اچھا شام کو ملاقات ہو گی۔
(سمیعہ اُٹھنے لگتی ہے)
شاہدہ : سمیعہ بہن تم یوں نہیں جاؤ گی۔
سمیعہ : (مسکرا کر) پھر کس طرح جاؤں گی۔
شاہدہ : مجھے وہ بدمزگی والی بات بتا کر جاؤ۔
سمیعہ : شاہدہ بہن! تم تو میری عادت سے واقف ہو۔ سہیلیوں کو بہت عزیز سمجھتی ہوں۔ نہ کسی کا شکوہ کرتی ہوں نہ کسی سے شکایت سنتی ہوں۔ تم نے میرے گڈّے سے نیلم کا بیاہ پسند نہ کیا۔
شاہدہ : وہ تو اس لیے کہ میں نے سُنا تھا غزالہ اپنی گڑیا کا تمھارے گڈّے سے بیاہ کرنا چاہتی ہے۔ بس یہ بات تھی۔
سمیعہ : تم نے افواہ پر یقین کر لیا۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔
(شاہدہ کچھ کہنا چاہتی ہے کہ سمیعہ ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیتی ہے)
سمیعہ : میں نے کہا نا، مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ تم اپنے گھر میں خوش، میں اپنے گھر میں خوش۔
شاہدہ : وہ بات ؟
سمیعہ : ضرور سنوں گی ؟
شاہدہ : میری پکّی سہیلی نہیں ہو ؟
سمیعہ : اسی کا تو خیال آتا ہے جو بات چھپاتی نہیں ہوں۔ جس کا دکھا ہے وہ کہتی ہے.....
شاہدہ : (جلدی سے) کیا کہتی ہے ؟
سمیعہ : میں اپنی بات نہیں کہہ رہی اُس کی بات کہہ رہی ہوں۔
شاہدہ : ہاں، ہاں، بشریٰ کی بات کہہ رہی ہو۔
سمیعہ کہتی ہے مجھے تو شاہدہ کی گڑیا ایک آنکھ نہیں بھاتی .... میرا گڈّا ..... ہزاروں میں ایک ہے۔
شاہدہ : اس کا گڈّا ہزاروں میں ایک ہے اور میری نیلم ......
سمیعہ : نہیں پسند اُسے۔
شاہدہ : پر وہ تو اس کی تعریفیں کرتی پھرتی تھی۔
سمیعہ : کرتی پھرتی ہو گی۔ اس سے کیا ہوتا ہے بھلا۔ دل سے پسند نہیں کرتی۔
شاہدہ : ہیں میری اتنی خوب صورت نیلم اور کیڑے نکالتی ہے اس میں۔
سمیعہ : دیکھ لو۔

شاہدہ : کوئی خرابی دیکھتی ہو میری نیلم میں؟
(سمیعہ گڑیا صندوقچے سے اُٹھا کر اُسے دیکھتی ہے)
سمیعہ : میں نے تو ایسی خوب صورت گڑیا آج تک دیکھی ہی نہیں۔
شاہدہ : میں کہتی ہوں میری گڑیا اس کے گڈّے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔
سمیعہ : یہ تو بشریٰ کی خوش نصیبی ہے کہ تم نے اس کے گڈّے کو پسند کر کے اپنی نیلم کا بیاہ اس سے کرنا منظور کر لیا ہے۔
شاہدہ : اور یہ انعام ملا ہے مجھے۔
سمیعہ : دنیا میں انصاف تو رہا ہی نہیں۔ ایک تو احسان کرو اور پھر بُرے بنو۔
(شاہدہ سمیعہ کے ہاتھ سے گڑیا لے لیتی ہے۔)
سمیعہ : اب میں چلتی ہوں۔
شاہدہ : اچھا۔
سمیعہ : شاہدہ بہن!
شاہدہ : کہو!
سمیعہ : تم جانتی ہو مجھے تم سے کتنی محبّت ہے۔ اس محبّت کی وجہ سے میں نے تمھیں یہ بات بتا دی ہے۔
شاہدہ : مہربانی تمھاری۔
سمیعہ : میرا نام کہیں نہ آئے۔

شاہدہ : میں کسی سے کیوں کہنے لگی۔
سمیعہ : جو دل میں آئے کرو۔ یہ نہ کسی کو معلوم ہو کہ میں نے تم سے یہ کہا ہے۔ تم پر پورا پورا اعتماد کر کے یہ کہا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔
شاہدہ : ہرگز نہیں کہوں گی۔
(سمیعہ جانے لگتی ہے۔ شاہدہ اپنی گڑیا سے مخاطب ہوتی ہے۔)
شاہدہ : میری نیلم! اس کا خیال بالکل نہ کرنا۔ اس کا دل چھوٹا ہے جو اس نے کہا ہے مجھے نیلم پسند نہیں.... میری نیلم! تم تو بے مثال گڑیا ہو۔ یہ بشریٰ سمجھتی کیا ہے اپنے گڈّے کو، کہیں نظر آئے تو مجھے۔ وہ خبر لوں گی.... وہ خبر لوں گی......
(دروازے پر دستک)
کون ہے آجایئے۔
(بشریٰ آتی ہے۔ لگتا ہے غصّے میں ہے)
شاہدہ : بڑے اچھے موقع پر آئی ہو بشریٰ۔
بشریٰ : اور میری بھی بڑے اچھے موقع پر ملاقات ہو گئی ہے تم سے۔ میں کچھ پوچھنے آئی ہوں۔
شاہدہ : مجھے بھی تم سے کچھ پوچھنا ہے۔
بشریٰ : پوچھو!
شاہدہ : پہلے تم پوچھو!
بشریٰ : نہیں پہلے تم پوچھو۔
(دونوں ایک دم بول پڑتی ہیں۔)

شاہدہ: بشریٰ! میں کہتی ہوں۔
(دونوں خاموش ہو جاتی ہیں۔)
بشریٰ: کہو نا!
شاہدہ: تم کو میری نیلم پسند نہیں تھی تو کہہ دیتیں کہ میں اس سے اپنے گڈّے کا بیاہ نہیں کروں گی۔
بشریٰ: اور تمھیں میرا گڈّا کانا نظر آتا تھا تو.....
شاہدہ: میں نے کب کہا تھا کہ وہ کانا ہے؟
بشریٰ: تم نے کہا تھا، اب جھوٹ نہ بولو۔
شاہدہ: تم ہوتی کون ہو میری نیلم کو ناپسند کرنے والی؟
بشریٰ: اور تم کون ہوتی ہو میرے گڈّے کا عیب ڈھونڈنے والی؟
شاہدہ: میں کہتی ہوں رکھو اپنے گڈّے کو گھر میں۔
بشریٰ: اور تم بھی اپنی نیلم کو اپنے گھر میں رکھو۔
شاہدہ: وہ تو رہے گی اپنے گھر میں۔
بشریٰ: اور میرا گڈّا بھی اپنے گھر میں رہے گا۔
شاہدہ: رہتا ہے تو رہے۔
بشریٰ: اور نیلم بھی رہتی ہے تو رہے۔
شاہدہ: بشریٰ تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔
بشریٰ: اور تم سے بھی یہ اُمید نہیں تھی شاہدہ!
شاہدہ: تمھاری اپنی آنکھ میں کوئی نقص ہے جو میری نیلم میں عیب ڈھونڈتی ہو۔
بشریٰ: کیا کہا میں کانی ہوں؟ کانی تم ہو... بلکہ اندھی ہو۔
شاہدہ: خبردار! اپنی زبان کو قابو میں رکھو، ورنہ ایک کہو گی تو دس سنو گی۔
بشریٰ: میں ایک نہیں بیس سناؤں گی دس کے جواب میں۔
شاہدہ: سُنا کر دیکھو تو سہی۔ میرے گھر آئی ہو۔ بڑا لحاظ کر رہی ہوں۔
بشریٰ: ابھی لحاظ کرنا باقی رہ گیا ہے۔
شاہدہ: ہاں بڑا لحاظ کر رہی ہوں۔ میری نیلم کو کوئی اندھا ہی ناپسند کرے گا۔
بشریٰ: میں کہتی ہوں۔ بڑھ چڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔
شاہدہ: باتیں تم بنا رہی ہو کہ میں؟
بشریٰ: تم تو گونگی ہو نا؟
شاہدہ: میں کہتی ہوں.....
بشریٰ: میں کہتی ہوں .....
شاہدہ: کہہ لو جو کہنا ہے۔
بشریٰ: تم بھی جو کہنا چاہتی ہو کہہ لو۔
شاہدہ: کہے میری جوتی۔
بشریٰ: جوتی مارو اپنے سَر پر.....

(غزالہ آتی ہے)

غزالہ: ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟

شاہدہ: پوچھو اس سے۔

غزالہ: بشریٰ! تمھیں کیا ہو گیا ہے۔

شاہدہ: یہ پوچھو اسے کیا ہو گیا ہے۔

غزالہ: میں تو کہتی ہوں تم دونوں کو کچھ ہو گیا ہے۔ بس خاموش ہو جاؤ۔

بشریٰ: میں جا رہی ہوں۔ آئندہ اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گی۔

شاہدہ: تمھیں بُلائے گا کون؟

غزالہ: شاہدہ!

شاہدہ: کیا ہے؟

غزالہ: خاموش ہو جاؤ۔

شاہدہ: میں خاموش ہوں۔ کیا کہتی ہوں کسی سے؟

بشریٰ: ابھی کچھ کہتی ہی نہیں ہو بی بی رانی۔

غزالہ: بشریٰ! اگر اب تم میں سے کوئی بولی تو میں تم دونوں سے ناراض ہو جاؤں گی اور ابھی جاکر خالہ جان سے کہتی ہوں کہ تم دونوں بُری طرح لڑ رہی ہو۔

(شاہدہ اور بشریٰ خاموش ہو جاتی ہیں۔)

غزالہ: شاہدہ! تم کہو۔

شاہدہ: اس نے میری نیلم میں کیڑے نکالے ہیں۔ لاکھوں میں ایک ہے میری گڑیا اور یہ کہتی ہے مجھے تو یہ اپنے گڈّے کے لیے پسند ہی نہیں۔

(بشریٰ کچھ کہنے لگتی ہے کہ غزالہ اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیتی ہے۔)

غزالہ: شاہدہ، یہ کب کہا ہے بشریٰ نے؟

شاہدہ: پتا نہیں کب کہا ہے۔

غزالہ: تم نے اسے کہتے سُنا ہے؟

شاہدہ: نہیں۔

غزالہ: تم نے اسے اپنے کان سے کچھ کہتے ہوئے نہیں سُنا؟

(شاہدہ خاموش رہتی ہے۔)

غزالہ: اور بشریٰ! تم کیا کہتی ہو؟ کیا شکایت ہے تمھیں؟

بشریٰ: اس نے میرے گڈّے کو کانا کہا ہے۔

غزالہ: شاہدہ نے تمھارے گڈّے کو کانا کہا ہے۔ تمھارے سامنے؟

بشریٰ: نہیں۔

غزالہ: تم نے یہ الفاظ چُھپ کر سُنے ہیں؟

بشریٰ: نہیں۔

غزالہ: اس کا مطلب یہ ہے بشریٰ! کہ تم سے کسی نے کہا اور شاہدہ! تم سے بھی کسی نے کہا۔

(دونوں خاموش رہتی ہیں)

غزالہ: میں معاملہ سمجھ گئی ہوں...... ہم خالہ جان سے بات کرتے ہیں۔ وہ جو کہیں گی وہ

کریں گے۔

(پہلے منظر کا پردہ گرتا ہے۔ شام کے وقت دوسرے منظر کا پردہ اُٹھتا ہے۔

اسٹیج پر روشنی کمرا۔ کمرے کے بلب روشن ہیں۔ صوفوں پر بشریٰ، شاہدہ، غزالہ، عابدہ اور سلیمہ اور سمیعہ ہیں۔

میز کے اوپر پھل، مٹھائیوں کی پلیٹیں رکھی ہیں۔ پردہ اُٹھنے کے دو تین لمحوں کے بعد غزالہ صوفے سے اُٹھتی ہے اور کہتی ہے۔

غزالہ: میں ایک تجویز پیش کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔

عابدہ: تجویز؟ شادی کے موقع پر تجویز کیسی؟

غزالہ: تجویز کا تعلق شادی ہی سے ہے۔

(سب کہتی ہیں، "ہاں ہاں، ضرور کرو۔")

غزالہ: میں ساری بہنوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج شاہدہ کی گڑیا کا بیاہ بشریٰ کے گڈّے سے ہو رہا ہے۔

(سب کی آواز "معلوم ہے")

غزالہ: میں تجویز کرتی ہوں کہ شاہدہ کی گڑیا کا بیاہ سمیعہ کے گڈّے سے ہو۔

(سب "یہ کیوں" کہتی ہیں۔)

غزالہ: سمیعہ بہن! میں ٹھیک کہتی ہوں نا؟

سمیعہ: تم نے مجھ سے یہی بات کہی تھی، اسی لیے میں آگئی ہوں، ورنہ میرا یہاں کیا کام؟

غزالہ: تمھاری بڑی مہربانی۔

عابدہ: مگر ایسا کیوں ہو؟ ہم تو شاہدہ کی گڑیا نیلم کا بیاہ بشریٰ کے گڈّے سے رچانے کے لیے آئے ہیں۔ یہ نئی تجویز کیسے آٹپکی۔

سلیمہ: یہ تو عجیب ہی تجویز ہے۔

عابدہ: پہلے یہ بتاؤ کہ اس کی وجہ کیا ہے۔

غزالہ: وجہ بتانے کے لیے تیار ہوں۔

سلیمہ: تو بتاؤ۔

غزالہ: وجہ یہی ہے کہ ہماری سمیعہ بہن یہ چاہتی ہیں۔

سلیمہ: یہ کیا بات ہوئی ہماری سمیعہ بہن یہ چاہتی ہیں۔

غزالہ: اور اس کے لیے ہماری بہن سمیعہ نے کوشش بھی بہت کی ہے۔

عابدہ: کیا کوشش؟

غزالہ: کوشش یہ کی کہ اپنی طرف سے شاہدہ کو بتایا کہ بشریٰ کو تمھاری گڑیا پسند نہیں ہے اور اِدھر بشریٰ سے جا کر یہ کہا کہ شاہدہ کہتی ہے تمھارا گڈّا کانا ہے۔ کیا آپ سمجھی نہیں ہیں یہ کتنی بڑی کوشش ہے؟

("ہیں ہیں" کی آوازیں)

غزالہ: شاہدہ بہن نے سچ کہا ہے نا؟

شاہدہ: بالکل سچ کہا ہے۔

غزالہ: بشریٰ؛ تمھاری کیا رائے ہے؟
بشریٰ: بات وہی ہے جو تم نے کہی ہے۔
غزالہ: گویا ہماری پیاری سہیلی سمیعہ نے لگائی بجھائی کر کے شاہدہ کو بشریٰ سے اور بشریٰ کو شاہدہ سے بدظن کر دیا ہے۔
(سمیعہ کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے)
سلیمہ: یہ تو بڑی بڑی حرکت ہے۔
عابدہ: لگائی بجھائی کرنی بڑی خطرناک حرکت ہے۔
سلیمہ: اور کیا؟
(سمیعہ کھڑی ہو جاتی ہے)
سمیعہ: میں نہیں جانتی تھی یہاں یہ سب کچھ ہوگا۔ یہ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔
شاہدہ: یہ تو ہونا ہی تھا۔
بشریٰ: تم نے جو کچھ کیا ہے وہی غزالہ نے بیان کر دیا ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ ہے تو بتا دو۔ کیا تم نے یہ من گھڑت باتیں نہیں کہی ہیں؟
سمیعہ: تم میری بے عزتی کر رہی ہو میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔
بشریٰ: نہ کرو۔ ہم تو وہی کہیں گے جو ہوا ہے۔
سمیعہ: میں جا رہی ہوں۔
(سمیعہ جانے لگتی ہے۔)

غزالہ: تم چلی گئیں تو شاہدہ کی گڑیا کی شادی کس کے گڈّے سے ہوگی سمیعہ
سمیعہ: میں یہاں نہیں ٹھیروں گی۔
غزالہ: تمھیں ٹھیرنا پڑے گا۔
(سب "ہاں ہاں" کہتی ہیں۔)
سمیعہ: یہ کوئی زبردستی ہے۔ نہیں ٹھیرتی میں۔
غزالہ: میں نہیں سب سہیلیاں تمھیں روک رہی ہیں۔ کیا ان کا خیال نہیں کرو گی؟
سمیعہ: یہ زبردستی روک لیں گی مجھے؟
(ہاں ہاں کی آوازیں)
غزالہ: سمیعہ بہن! تم نے دو عزیز سہیلیوں کو آپس میں لڑا کر تو تماشا دیکھ ہی لیا ہے۔ اب ذرا یہ تماشا بھی دیکھ لو۔
سمیعہ: کون سا تماشا؟
غزالہ: تمھارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔
عابدہ: لگائی بجھائی کرتے ہوئے تمھیں خیال نہ آیا کہ تم کیا کر رہی ہو؟
سلیمہ: اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟
عابدہ: تم نے دو سہیلیوں میں لڑائی کرا دی۔
بشریٰ: بڑی آئی تھی میری ہمدرد بن کر۔
شاہدہ: مجھے کیا معلوم تھا کہ محترمہ چاہتی کیا ہیں۔
عابدہ: ویسے بڑی عقل مندی کی تھی انھوں نے

سلیمہ: اس سے بڑی عقل مندی کیا ہوگی کہ دو سہیلیوں کے دلوں میں زہر بھر دیا اور وہ آپس میں لڑنے لگیں۔

(سمیعہ جانے لگتی ہے۔)

سمیعہ: میں ایک لمحہ بھی نہیں رُک سکتی تم لوگوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

شاہدہ: ہمارا بھی کوئی واسطہ نہیں ہوگا تم سے۔

بشریٰ: ہم نے تمھیں سمجھ لیا ہے کہ تم کیا ہو۔

عابدہ: تم ہو ....

سلیمہ: لگائی بجھائی کرنے والی۔

(سب ہنستی ہیں۔ سمیعہ دروازے کی طرف جارہی ہے۔ دوسرے دروازے سے خالہ جان آتی ہیں۔

سب لڑکیاں احترام سے کھڑی ہوجاتی ہیں۔

خالہ جان سمیعہ کی طرف جاتی ہیں۔

سمیعہ رُک جاتی ہے۔ خالہ جان اُس کے پاس جاکر محبت اور شفقت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہیں۔)

خالہ جان: نہیں بیٹی! تم نہیں جاؤ گی۔

سمیعہ: خالہ جان.... انھوں نے .... میری بے عزتی کی ہے۔

خالہ جان: بیٹی! یہ بھی ذرا سوچو تم نے کیا کیا ہے۔ بہت بڑی حرکت ہے جو تم نے کی ہے۔ تمھیں اس پر شرمسار ہونا چاہیے۔

(خالہ جان سمیعہ کی طرف دیکھنے لگتی ہیں۔)

معافی مانگ لو بیٹی! وعدہ کرو آئندہ کبھی ایسا نہیں کرو گی۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

(سمیعہ رونے لگتی ہے۔)

خالہ جان: سمیعہ بیٹی! آئندہ ایسا نہیں کرو گی نا؟

(سمیعہ نفی میں سر ہلا دیتی ہے۔)

خالہ جان: بس! یہ معاملہ ختم۔

(خالہ جان سب سے مخاطب ہوتی ہیں۔)

خالہ جان: اب اس کا ذکر بالکل نہیں ہونا چاہیے۔

(سب "نہیں نہیں" کہتی ہیں اور خالہ جان سمیعہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھا دیتی ہیں۔ سب تالیاں بجاتی ہیں۔

اور پردہ گرتا ہے۔)

حکیم محمد سعید کے بچپن کی شرارتیں
خود اُن کی زبانی

میرے بہت بچپن میں ایک کھیل ہوتا تھا۔ نام تھا اُس کا "کیل کِیل کانٹیاں"۔ یہ کوئی ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔ میں اُس وقت سات سال کا تھا۔ میں نے پہلا حج ۱۹۲۷ء ہی میں کیا تھا۔ قرآن حکیم حفظ کرتا ہوا حج کو گیا تھا۔ پھر واپس ۶ ماہ بعد آکر نو سال کی عمر میں پورا قرآنِ حکیم حِفظ کر لیا تھا، الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ حافظ سید عمر دراز علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ بہت خوب انسان تھے۔ میرے اُستاد تھے۔

ہمارا محلہ کوچۂ کاشغری کہلاتا تھا۔ بہت اچھا نام تھا۔ اس میں پرانے زمانے کی ایک بہت ہی بڑی حویلی تھی۔ کوچہ بھی بہت بڑا تھا۔ یہاں ہمارا پورا خاندان آباد تھا۔ باقی سب ہندو تھے۔ بڑے اطمینان سے رہا کرتے تھے۔ کیل کیل کانٹیاں کے لیے یہ محلّہ خاصی شہرت رکھتا تھا۔ کھیل یہ تھا کہ دو ٹیمیں بن جاتی تھیں۔ شاید ہر ٹیم میں تین بچے ہوتے تھے۔ کوچہ دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا تھا اور ہر ٹیم کیل کیل کانٹیوں میں مصروف ہو جاتی تھی اور اپنے حصّے میں پوشیدہ تر مقامات، در دیوار پر باریک پنسل سے نشانات لگاتی تھی۔ جتنے چاہے نشانات لگا دو، کوئی پابندی نہ تھی۔ ہاں وقت آدھے گھنٹے کا مقرر تھا۔ پھر اعلان ہو جاتا کہ نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ اب پہلی ٹیم دوسری ٹیم کے علاقے میں جاتی اور نشانات تلاش کرتی اور اُن کو کاٹتی جاتی۔ حتیٰ کہ اعلان کر دیتی کہ تلاش اور کاٹ کا سلسلہ ختم ہوا۔ اعلان کے بعد پہلی ٹیم اُن نشانات کی نشان دہی کرتی تھی کہ جو تلاش سے رہ گئے۔ ان نشانات کو گنا جاتا تھا اور نوٹ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پہلی ٹیم دوسری ٹیم کے علاقے میں جا کر نشانات تلاش کرتی اور کاٹتی اور اعلان کے بعد کٹنے سے جو نشانات بچ رہتے اُن کو گِنا جاتا تھا۔ اس گنتی پر فتح کا دار و مدار تھا۔ جس ٹیم کے نشانات کی تعداد زیادہ ہوتی، یعنی تلاش میں ناکامی کے بعد بچے ہوئے نشانات کی تعداد جس ٹیم کی زیادہ ہوتی وہی جیتا کرتی اور جس کے نشانات کم ہوتے وہ ہارتی تھی۔

اب جناب کوچہ تو محدود تھا اور کھیل روز کا معمول۔ در و دیوار اور دوسرے مقامات کیلوں اور کانٹیوں سے سیاہ ہو چکے تھے اور کھیل مشکل ہوا جا رہا تھا۔ مجھے اس کھیل سے دل چسپی تھی۔ تلاش اور

جستجو کا جذبہ مجھے اس کھیل سے ملا ہے۔ اس کھیل کو میں نے شرارت کے طور پر ایک نیا رُخ دیا۔ ایک دن ذہن میں بجلی سی کوندی اور میں ماموں عبدالعزیز صاحب کی دُکان پر پہنچ گیا۔ کاغذ بہت سا میرے پاس تھا۔ دُکان گلی مُرغاں میں تھی۔ بازار سیتارام تھا۔ منھ بولے ماموں عبدالعزیز کپڑوں پر چھپائی کا کام کرتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد بھی تھے۔ ان کے پاس بُندکیوں کے چھاپے تھے۔ میں نے ان چھاپوں سے کاغذ پر بُندکیاں (ٹکیلیں) چھاپیں اور اپنے ساتھ لے آیا۔ دوسرے دن کیل کیل کانٹیاں کھیل میں، میں نے یہ کاغذات اپنے علاقے میں ایک پوسٹ بکس نمبر ۷ میں ڈال دیے۔ یہ پوسٹ بکس نمبر میرے حقیقی ماموں نور محمد اور ماموں عنایت الٰہی صاحب کے ہمدم دواخانے کا تھا۔ جب نشانات کی تلاش ہوئی اور کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی نے اس پوسٹ بکس کو نہ دیکھا جس میں ہزارہا بُندکیوں (نشانوں) والے کاغذ تھے۔ یہ تلاش میں نہ آئی اور اعلان کے بعد جب گنتی شروع ہوئی تو میں نے پوسٹ بکس سے یہ کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیے اور مطالبہ کیا کہ ان کو گنا جائے۔ دوسری ٹیم نے سخت احتجاج کیا کہ یہ نشانات نہیں ہو سکتے۔ میں نے بحث کی اور دلیل دی کہ یہ بُندکیاں بہر حال نشانات ہیں اور میں بحث میں جیت گیا اور کھیل میں جیت گیا۔ اس کے بعد ایک حربہ میں نے یہ استعمال کیا کہ میں نے ایسا کُرتا پہن لیا جس پر بُندکیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اعلان کے بعد جب گنتی ختم ہوئی تو میں نے خود کو پیش کر دیا کہ میرے کُرتے کی بُندکیاں گنی جائیں۔

ایک شور مچ گیا! مگر میں نے اُن ہی دلائل پر "مقدمہ" اور کھیل جیت لیا جن پر میں نے پوسٹ بکس والے کاغذات کا مقدمہ جیتا تھا۔ اس طرح کیل کیل کانٹیاں ایک "سائنٹی فک" کھیل بن گیا۔ مگر بچّوں نے اسے شرارت قرار دیا۔ اب نونہال فیصلہ کریں کہ یہ شرارت تھی یا ذہانت۔

میں جب طبیّہ کالج دہلی میں داخلے کے لیے لے جایا گیا تو جناب رجسٹرار (حکیم مولوی عبدالحفیظ صاحب) نے صاف انکار کر دیا کہ کالج میں داخلے کی یہ عمر نہیں، مگر جب اصرار بڑھا اور درخواست موثر ہوئی تو ٹیسٹ ہوا۔ عربی بھی کافی اچھی تھی اور فارسی بھی خوب تھی اور اردو تو خیر اچھی تھی ہی۔ داخلہ ہو گیا۔ طبیہ کالج میں دو دوست بنے۔ محمد احسن عباسی (جو بعد میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے میئر ہوئے اور پاکستان کے سفیر)۔ دوسرے دوست جناب پیر غلام محی الدین مجددی۔ یہ دوست سے زیادہ بزرگ محسوس ہوا کرتے۔ (ان کے ہزارہا مرید ہیں سندھ میں) پیر صاحب کے پاس ایک

ناخن تراش تھا۔ خوب تھا۔ بڑا انوکھا۔ کسی مرید نے نذر کیا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ جناب غلام محی الدین صاحب یہ ناخن تراش میری نذر کر دیں، مگر پیر صاحب بھلا کب ماننے والے تھے۔ جب میں اصرار کرتا، بچہ سمجھ کر ٹال دیتے۔ ٹالتے رہے، ٹالتے رہے۔ میں ان کو نوٹس دیتا رہا کہ دیکھیے اگر مجھے آپ نے نہ دیا تو میں اسے چرالوں گا، مگر مولانا تالے قفل سے چوکنا رہتے تھے۔ آخر ایک دن میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ محمد احسن عباسی صاحب کو ہم راز بنایا اور ایک دن جب کہ پیر صاحب کلاس میں تھے ہم ان کے کمرے میں گئے الماری کی کنڈی کے اسکرو کھولے، الماری کھولی نا خن تراش چُرا لیا۔ الماری کا چھپکا دوبارہ فِٹ کر دیا۔

چوری کا بڑا چرچا ہوا۔ نہ میں نے بتا کر دیا اور نہ بھائی احسن نے راز افشا کیا، حتیٰ کہ طبیہ کالج کی تعلیم ختم ہوئی۔ بھائی احسن اور پیر غلام محی الدین کراچی اور ٹنڈو جام سدھارے۔ پاکستان بنا میں بھی پاکستان آیا۔ ان دوستوں سے ملاقاتیں بھی رہیں، مگر ناخن تراش کا راز راز ہی رہا۔

حادثہ یہ پیش آیا کہ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں نمبر ۱ دریا گنج لوٹ لی گئی۔ مکان کے ساتھ میرا سامان بھی سب کا سب شرنارتھی (علاقہ پاکستان سے ہندستان جانے والے لوگ) اُٹھا کر لے گئے اور اس میں وہ چوری کیا ہوا ناخن تراش لُٹ گیا۔

۱۹۵۶ء میں، مَیں جب یورپ کا دورہ کر رہا تھا تو روم (اٹلی) میں ایک دُکان پر دیکھا کہ بالکل ویسا ہی ہے۔ عَین مَین وہی۔ ناخن تراش رکھا ہے۔ میں نے فوراً خرید لیا اور پاکستان لے آیا۔ یہ میں نے ایک خط کے ساتھ عالی مرتبت جناب حکیم پیر غلام محی الدین مجدّدی سرہندی کی خدمتِ اقدس میں بھجوا دیا۔ اس خط میں، میں نے اپنی شرارت اور اپنی ۱۹۳۶ء کی چوری کا اعلان کیا اور بڑے ادب کے ساتھ معذرت بھی چاہی۔ نکتہ یہ ہے کہ جناب حکیم محمد احسن صاحب نے راز افشا نہیں کیا اور جناب محترم حکیم پیر غلام محی الدین صاحب نے میری شرارت کو معاف کر دیا، مگر میں جب غور کرتا ہوں تو ایسا شرمندہ ہوتا ہوں اور نادم ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر، چوری واقعی بُرائی ہے۔ ایسی شرارت کسی طرح بھی اچھی نہیں ہو سکتی۔ اب جب بھی اس شرارت پر غور کرتا ہوں تو پانی پانی ہو جاتا ہوں اور ساری عمر میں اپنی اس غلطی کو یاد رکھوں گا اور شرمسار رہوں گا۔

بچّوں کے پسندیدہ رسالے

ہمدرد نونہال

کے خاص نمبر کی اشاعت پر

ہم

پاکستانی بچّوں کو

دِلی مُبارک باد پیش کرتے ہیں

حاجی باغ علی حسن علی اینڈ کمپنی

ماھرین تعمیرات

آجا ماؤجی اسٹریٹ، رنچھوڑ لائن، کراچی

اپنا پیشہ

غنی دہلوی

اپنی کاوش اپنی طاقت
اپنی کوشش اپنی محنت
کرتے رہیں گے قوم کی خدمت

خدمت کرنا اپنا پیشہ
اپنے بازو اپنا تیشہ

باغوں کو شاداب کریں گے
نہروں کی تعمیر کریں گے
قوموں کی تقدیر بنیں گے

خدمت کرنا اپنا پیشہ
اپنے بازو اپنا تیشہ

رحمت کے وہ بادل گرجیں
ڈالی ڈالی چڑیاں چہکیں
کونپل کونپل موتی برسیں

خدمت کرنا اپنا پیشہ
اپنے بازو اپنا تیشہ

عزمِ سفر اب تیز کریں گے
مٹی کو زرخیز کریں گے
صحرا کو گُل ریز کریں گے

خدمت کرنا اپنا پیشہ
اپنے بازو اپنا تیشہ

خوشحالی
آپ کی منتظر ہے

نیشنل بینک آف پاکستان
میں
شراکتی کھاتہ
کھولیئے
منافع میں ہمارے حصہ دار بن جائیے

شراکتی بچت کھاتہ
کم از کم ۱۰۰ روپے سے کھل سکتا ہے

شراکتی میعادی کھاتہ
کم از کم ایک ہزار روپے سے کھل سکتا ہے

نیشنل بینک آف پاکستان کو آپ کی ۳۰ سالہ خدمت کا فخر حاصل ہے۔ اسی تجربے کی بدولت
ہم آپ کی بچت کے بہترین امین ہیں اور آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع
کا حصول ہمارا نصب العین ہے۔
شراکتی کھاتے کے منافع پر ۱۵۰۰۰ روپے تک انکم ٹیکس نہیں لگتا۔ شراکتی بچت کھاتے
سے روپیہ چیک کے ذریعہ نکلوانے کی سہولت بھی ہے۔

بچت آپ کی۔ محنت ہماری

تفصیلات کے لئے نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رجوع فرمائیں

نیشنل بینک آف پاکستان قومی ترقی قومی بینک

United
PID-1-4/82

گھنگرو والے بڑے میاں

احمد جمال پاشا

کسی زمانے میں کسی جھونپڑی میں رہنے والے دو غریب آدمی روزی کی تلاش میں ایک قصبے میں پہنچے اور محنت مزدوری کر کے تین سو رُپے پس انداز کر لیے۔

انھوں نے سوچا کہ اگر وہ اتنی بڑی رقم کے ساتھ پردیس گئے تو ضرور لُٹ جائیں گے۔ اس لیے کسی ایمان دار آدمی کے پاس ہمیں یہ رقم امانت کے طور پر جمع کروا دینا چاہیے۔

وہ کئی دن تک سوچتے رہے کہ کس کے پاس امانت رکھوائیں۔ آخر انھیں قصبے کے اُن بڑے میاں کا خیال آیا جن کی انگوٹھیوں میں گھنگرو بجتے تھے۔ وہ بڑے میاں کے پاس گئے اور پوچھا:

"آپ نے اپنی انگلیوں میں اتنے گھنگرو کیوں باندھ رکھے ہیں؟"

بڑے میاں بولے:

"میاں! بات یہ ہے کہ ہر طرف بہت سے مچھر اور تتلیاں اُڑتی رہتی ہیں۔ میرے ہاتھ سے ان کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ گھنگرو کی آواز سے وہ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور میرے ہاتھ سے بچ جاتے ہیں۔"

دونوں غریب آدمیوں نے سوچا کہ بڑے میاں سے بڑھ کر کون امین ہو سکتا ہے۔ جو اتنا خدا ترس ہے وہ ایمان دار بھی ضرور ہو گا۔ انھوں نے اپنی رقم گھنگرو والے بڑے میاں کے پاس امانتاً رکھوا دی۔

کچھ زمانے کے بعد جب دونوں نے پردیس سے کافی رقم کما لی اور گاؤں واپس جا کر یہودی سے کھیت چھڑا کر کھیتی باڑی کرنے اور وطن میں رہنے کا ارادہ کیا تو بڑے میاں سے اپنی رقم واپس لینے گئے۔

بڑے میاں دونوں کو دیکھ کر بہت بگڑے اور غصّے میں گرج کر بولے:

"بے ایمانو! تم دونوں جیسے بھکیچروں کے پاس تین سو رُپے کہاں سے آ سکتے ہیں! اپنے ہوش میں ہو؟ میں نے تو اس سے پہلے کبھی تم دونوں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔"

بڑے میاں بہت چیخے چلّائے اور دھکّے دے کر دونوں غریبوں کو گھر سے نکال دیا۔ غصہ ہوتے اور نکالتے میں ان کے دونوں ہاتھ ان کی زبان سے بھی زیادہ تیز چل رہے تھے۔ ان کی انگلیوں کے گھنگرو جھن، جھن، جھن بج رہے تھے۔ دونوں غریب آدمی جا کر سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنی بے بسی پر رونے لگے۔ اُدھر سے ایک چالاک، مگر رحم دل عورت گزری۔ اس نے رونے کی وجہ پوچھی۔ دونوں نے رو رو کر بڑے میاں کی بے ایمانی کا قصہ بتایا۔ چالاک عورت نے بہت غور سے دونوں کی باتیں سُنیں۔ کچھ دیر سوچتی رہی، اس کے بعد بولی:

"تم دونوں کل بڑے میاں کے پاس صبح چھے بجے جانا۔ وہ تمھاری امانت واپس کر دے گا، لیکن آیندہ بڑے میاں کی میٹھی باتوں اور گھنگروؤں کے جال میں نہ پھنسنا۔"

دوسرے دن صبح ساڑھے پانچ بجے چالاک عورت بڑے میاں کے پاس گئی اور بولی:

"میرا شوہر کاروباری آدمی ہے۔ ہزاروں رُپے میرے پاس چھوڑ کر کاروبار کے سلسلے میں پردیس چلا گیا ہے۔ گھر میں اکیلی ہوں۔ چور ڈاکوؤں کا بہت خطرہ ہے۔ اس لیے براہ مہربانی یہ رُپیہ آپ میرے شوہر

کے آنے تک اپنے پاس امانتاً رکھ لیں۔"

بڑے میاں خوش ہو کر بولے:

"بیٹا، تم بالکل صحیح جگہ پر آئی ہو۔ مجھ سے بہتر اور محفوظ جگہ تمھیں کہاں ملتی۔ میرے پاس سب ہی امانت رکھواتے ہیں۔"

ابھی دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ دونوں غریب آدمی آکر اپنی رقم مانگنے لگے۔ بڑے میاں نے سوچا اگر اس آدمی کے رُپے دے دوں تب بھی اس عورت کے رُپے ان سے بہت زیادہ ہوں گے ورنہ وہ بھی ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس نے فوراً دونوں غریب آدمیوں کے رُپے واپس کر دیے۔ دونوں خوشی خوشی چلے گئے۔ اتنے میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور بولا:

"ابا پردیس سے واپس آگئے۔"

یہ سُن کر چالاک عورت لڑکے کے ساتھ گھر چل دی اور لالچی بوڑھا کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

(پیامِ تعلیم کا شکریہ)

آپ اور آپ کا دوست

اچھے بچے کوئی اچھی چیز پا لیتے ہیں تو اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو بھی بتاتے ہیں۔ ہمدرد نونہال اچھے بچّوں کا رسالہ ہے۔ آپ اچھے بچّے ہیں۔ آپ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بھی ہمدرد نونہال کا تعارف کرائیے۔ آپ اُن کو بتائیے کہ وہ خوب صورت رسالہ ہمدرد نونہال خریدا کریں اور پڑھا کریں۔ اس طرح اچھی اچھی باتیں پھیلیں گی۔ اگر آپ کے کہنے سے کوئی ایک دوست بھی ہمدرد نونہال خریدے تو ہمیں اس کا اور اپنا نام اور پتا لکھ دیجیے تاکہ ہم اس خوشی میں آپ کو اور آپ کے دوست کو "خبر نامہ ہمدرد" بلا قیمت بھیج سکیں جو ایک باتصویر معلوماتی رسالہ ہے۔

خط میں صرف یہ لکھیے کہ میرے جس دوست نے ہمدرد نونہال بازار سے خریدا اس کا اور اپنا پتا لکھ رہا ہوں۔ ہم دونوں کو "خبر نامہ ہمدرد" بھیج دیجیے۔ اس خط میں کوئی اور بات نہ لکھیے۔ آپ کارڈ بھی لکھ سکتے ہیں، لیکن پتے صاف لکھیے۔ شکریہ

ہمدرد گھٹی
بچوں کے نظامِ ہضم کے لئے ایک قدرتی دوا
چنیدہ نباتات سے صدیوں پرانے اصولوں پر تیار کردہ ہمدرد گھٹی نومولود بچوں کا پیٹ صاف کرنے کے لئے ایک قدرتی دوا ہے۔ انتہائی خوش ذائقہ ہمدرد گھٹی بچوں کو گیس، قبض اور پیٹ کی بہت سی دوسری تکلیفوں سے محفوظ رکھتی ہے۔
خوش ذائقہ
ہمدرد گھٹی
ہمدرد
ہمدرد گھٹی

تلّا دیس کا آدم خور

جم کاربٹ

ضلع تلّا دیس کے ایک وسیع علاقے میں ایک آدم خور چیتے نے آٹھ برسوں سے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ ڈیڑھ سو آدمیوں کو مار چکا تھا۔ اور میں بہت سے آدم خوروں سے نمٹ چکا تھا اس لیے ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے کہا کہ اس درندے کو بھی مارنے کی کوشش کروں۔

اس چیتے کی شکار گاہ ہمالیہ کے شمالی حصّے میں چار ہزار فیٹ کی بلندی پر تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے تیس میل دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرنا تھا، لیکن جوں ہی میں تلّا کوٹ کے گاؤں کے قریب پہنچا لوگ چلّانے لگے، "صاحب آگئے! صاحب آگئے!" ابھی میں آبادی تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ گھبرائے ہوئے مردوں اور بچّوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ پہاڑی لوگ آدم خور کے خوف سے بے حد پریشان تھے، کیوں کہ یہ درندہ ان کے گاؤں کے قریب ہی رہتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ صرف دو روز پہلے اس چیتے

نے ایک عورت کو مار ڈالا تھا۔ وہ بے چاری گھاس کاٹ رہی تھی۔

میں نے جب اس جگہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک سترہ سالہ لڑکا ڈونگر سنگھ بڑھ کر آگیا۔ گاؤں کے تمام لوگ ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ یہ لڑکا مجھے گاؤں سے لے کر آگے چلا اور ایک زین نما پہاڑی پر چڑھ گیا جو دو پہاڑوں کو جوڑتی تھی۔ یہاں رُک کر اس لڑکے نے داہنی جانب والی وادی کی طرف اشارہ کیا۔ ڈونگر سنگھ اور کچھ دوسرے لوگوں نے صبح کو یہاں تلاش کیا تھا مگر چیتے کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ بہرحال جب یہ لوگ واپس جا رہے تھے تو انھوں نے ایک گھورل (ایک قسم کا ہرن) کی آواز سُنی تھی اور کچھ دیر بعد ایک لنگور کو چیختے سُنا تھا۔ گھورل تو آدمیوں کو دیکھ کر کبھی کبھی آواز دیتا ہے، لیکن لنگور ایسا نہیں کرتا۔ بہرحال دونوں چیتے کو دیکھ کر شور مچاتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا چیتا ابھی تک اسی جگہ پر ہے جہاں اس نے شکار کیا تھا؟ میں نے طے کر لیا کہ میں فوراً جا کر اس جگہ کو دیکھوں۔ اس مرتبہ بھی ڈونگر سنگھ بہادری سے آگے بڑھ آیا اور بولا "صاحب! میں آپ کو راستہ بتاؤں گا۔"

چناں چہ ہم دونوں ڈھلوان پہاڑی سے اُترنے لگے۔ یہاں گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ ہم لوگ تقریباً آٹھ سو گز گئے ہوں گے اور ایک کُھلی ہوئی جگہ پر پہنچے تھے کہ ڈونگر سنگھ رُک گیا۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا جہاں گاؤں کے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ہاتھ کانوں پر رکھ کر سننے کی کوشش کی اور مجھ سے آہستہ سے کہا، "وہ کہتے ہیں کہ نیچے کھیت پر کوئی لال لال سی چیز پڑی ہوئی ہے۔" لال چیز محض سوکھی ہوئی جھاڑی بھی ہو سکتی تھی یا پھر ہرن ہو سکتا تھا اور ممکن ہے کہ وہ چیتا ہی ہو۔ اگر یہ بات ہے تو پھر نہایت اچھا موقع ہے۔

ہم لوگ اپنے داہنی طرف ایک کھیت میں چلے گئے اور جُھک کر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ پھر ہم دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل رینگنے لگے اور اس پہاڑی کے سرے پر پہنچ گئے۔ پھر موٹی موٹی گھاس کو چیر کر ہم نے نیچے کھیت میں دیکھا۔ وہاں ہری ہری گھاس پر دو چیتے پڑے سو رہے تھے۔ چیتے تقریباً ایک سو بیس گز دُور تھے۔ جو قریب تھا اس کا نشانہ لیا جا سکتا تھا۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ گولی کی آواز سُن کر دُور والا چیتا سیدھا گھنی جھاڑیوں میں چلا جائے گا اور اگر میں دُور والے پر گولی چلاتا تو گولی کی آواز سُن کر قریب والا میری طرف بھاگتا۔ چناں چہ میں نے ہاتھ کی پشت کو کھیت کی منڈیر پر رکھ کر رائفل کو مضبوطی سے پکڑا اور دُور والے جانور کے دل کا نشانہ

لیا۔ پھر میں نے آہستہ سے لبلبی دبا دی۔ وہ چیتا ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن دوسرا بجلی کی طرح لپک کر اس پانچ فیٹ کے چبوترے پر پہنچ گیا جو کھیت کو برساتی پانی سے علاحدہ کر رہا تھا۔ وہاں وہ کھڑا رہا اور اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا۔ میری دوسری گولی پر وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور برساتی پانی کی نہر میں جا کر غائب ہو گیا۔ اس دوسری گولی کے بعد میں نے اونچی گھاس میں جہاں پہلا چیتا مرا پڑا ہوا تھا کچھ حرکت دیکھی۔ ایک بڑا سا جانور بڑی تیزی سے کھیت میں چلا جا رہا تھا۔ میں اس جانور کو دیکھ نہیں سکتا تھا، مگر گھاس کے ہلنے سے میں اس کی حرکات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ کُھلی ہوئی جگہ پر نکلے۔ چناں چہ فوراً ہی ایک تیسرا چیتا دو سو گز کے فاصلے پر گھاس کی ڈھلوان میں جھپٹ کر چلا گیا۔ میں نے گولی چلا دی۔ چیتا دوہرا ہو کر گر پڑا۔ چند لمحات تک وہ ساکت رہا۔ پھر وہ پہاڑی پر کھسکنے لگا۔ اسی جگہ کے بالکل نیچے اسّی فیٹ پہاڑی کے کنارے ایک شاہ بلوط کا چھوٹا سا درخت تھا۔ چیتا پیٹ کے بل اس درخت سے ٹکرایا اور وہیں رُک گیا۔ اس کا سَر اور اگلی ٹانگیں درخت کے ایک جانب تھیں اور دُم اور پچھلی ٹانگیں دوسری جانب۔

میں انتظار کرتا رہا، مگر چیتا بالکل ساکت پڑا رہا۔ مجھے وہ بالکل مُردہ معلوم ہوا۔ یوں تو تینوں چیتے ایک ہی جسامت کے تھے، مگر میں سمجھ گیا کہ مجھے ایک مادہ چیتے اور اس کے دو بچّوں سے سابقہ پڑا ہے اور اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ان ہی تینوں میں سے کوئی تلّا دیس کا آدم خور ہے، غالباً مادہ چیتا ہو گی۔ ڈونگر سنگھ میرے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔ اب وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور خوشی سے ناچنے لگا۔ اب وہ گاؤں والوں کو کئی راتوں تک یہ قصّہ سُناتا رہے گا۔ آٹھ برسوں سے اس آدم خور نے سیکڑوں میل کے علاقے میں تباہی مچا رکھی تھی اور اب میں نے دو ایک گھنٹے کے اندر اسے تلاش کر لیا تھا اور مار ڈالا تھا۔ مجھے یہ خیال کر کے بھی خوشی ہو رہی تھی کہ زخمی جانور کا پیچھا کرنے کی بھی اب ضرورت نہ پڑے گی۔ بات یہ ہے کہ زخمی چیتے کا پیچھا کرنا بڑا خطرناک کام ہے۔ کھیت کے کنارے بیٹھے میں نے دیکھا کہ درخت پر لیٹا ہوا چیتا کچھ حرکت کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ خون جانور کے اگلے جسم میں اُتر آیا ہو گا جس کی وجہ سے وہ حصّہ بوجھل ہو گیا ہو گا اور اسی لیے اس کا جسم سَر کے بل آہستہ آہستہ نیچے کو گر رہا ہے، لیکن جب چیتا درخت سے نیچے آ گیا تو وہ چند فیٹ گھاس پر کھسکا اور پھر پہاڑی پر سے نیچے گر پڑا۔ جوں ہی وہ نیچے گرا میں نے گولی چلا دی۔ میں نے محض شکار کی کامیابی کی خوشی میں اچانک گولی چلا دی تھی۔ جب چیتے کا جسم

نیچے درختوں میں غائب ہو گیا تو شاخوں کے ٹوٹنے اور اس کے بعد کسی بھاری چیز کے گرنے کی "دھد" سی آواز آئی۔ گولی چیتے کے لگی یا نہیں لگی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

میں نیچے برساتی پانی میں جا کر چیتے کو تلاش کرنے چلا ہی تھا کہ ڈونگر سنگھ چلایا، "صاحب، وہ دیکھو چیتا چلا جا رہا ہے۔"

میں جلدی سے بیٹھ گیا اور رائفل اٹھا کر نیچے سے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اتنے میں وہ لڑکا چلایا، "وہاں نہیں صاحب، اُدھر!" وہ وادی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ آخر کار سامنے کی پہاڑی پر میں نے دیکھا کہ ایک چیتا ایک پہاڑ پر چڑھ رہا ہے۔ چیتا بے حد لنگڑا رہا تھا۔ یہ یک وقت صرف تین چار قدم چل پا رہا تھا۔ اس کے داہنے کندھے پر خون کا دھبّا تھا۔ یہ وہی چیتا تھا جو پہاڑی پر سے گرا تھا۔

میرے قریب ہی ایک چھوٹا سا درخت تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور کلائی پر رائفل کو ٹکا کر احتیاط سے نشانہ لیا اور چیتا جب ایک جگہ کھڑا ہو گیا تو میں نے آہستہ سے لبلبی دبا دی۔ فاصلہ تقریباً چار سو گز تھا۔ گولی کو وہاں تک پہنچنے میں بہت وقت لگا، لیکن آخر مجھے مٹی اُڑتی دکھائی دے گئی۔ عین اسی وقت چیتا لڑکھڑا کر آگے بڑھا اور آہستہ آہستہ آگے چلا گیا۔ میرا نشانہ بہت اُونچا ہو گیا۔ لہٰذا گولی نشانے کے اوپر سے نکل گئی۔ اب فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ مجھے صرف ایک گولی کی ضرورت تھی، لیکن اب میرے پاس گولی نہ تھی۔ میں صبح کو اپنے آدمیوں سے پہلے چل پڑا تھا اور میرے پاس صرف رائفل میں گولیاں بھری تھیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ چناں چہ خالی رائفل لیے میں نے چیتے کو آہستہ آہستہ چٹان پر چڑھتے دیکھا پھر وہ غائب ہو گیا۔ اس عرصے میں میرے آدمی گاؤں سے آگئے تھے اور پہاڑی پر ہجوم کے ساتھ کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ میری پانچویں گولی کے بعد ایک آدمی پہاڑی پر سے دوڑتا ہوا آیا اور اپنے ساتھ کارتوس لے آیا۔ میں نے دیکھا کہ دو چیتے اسی جگہ پر مرے پڑے ہیں جہاں پر وہ گرے تھے۔ یہ دونوں بہت بڑے نہ تھے۔ لہٰذا زخمی ہو کر بھاگ جانے والی ماں ہو گی اور وہی تلّا دیس کی آدم خور ہے۔ دونوں بچّوں کو اپنی ماں کے گناہوں کا کفّارہ ادا کرنے میں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

میں اپنی رائفل میں گولی بھر کر زخمی مادہ چیتے کے پیچھے چل پڑا۔ پہاڑی کے دامن میں مجھے وہ جھاڑی ملی جس پر وہ درخت سے گری تھی۔ وہاں سے میں خون کے نشانات دیکھتا ہوا اس جگہ تک پہنچا، جہاں

پر وہ کھڑی ہوئی تھی اور میں نے اپنی آخری گولی چلائی تھی۔ یہاں میں نے اس کے جسم کے کچھ بال پڑے دیکھے جو میری گولی لگنے سے اس کی پیٹھ پر سے گرے تھے۔ اس مقام سے پہاڑی کی لگر تک صرف چند قطرے خون کے دکھائی دیے۔ اس کے آگے سخت گھاس میں اس کا سراغ نہیں ملا چوں کہ رات ہونے والی تھی لہٰذا میں نے گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کر لیا اور یہ سوچا کہ اب کل دیکھوں گا۔

دوسرے دن میں اس پہاڑی پر پہنچا جہاں چیتا غائب ہو گیا تھا۔ یہاں جھاڑیوں میں شاید اس نے پناہ لی ہو، لیکن تلاش کے باوجود کوئی پتا نہ چل سکا۔ میں بیٹھ کر سوچنے لگا اور حسب ذیل نتائج اخذ کیے:

(ا) چوں کہ چیتے کے صرف اوپری زخم لگا تھا اس لیے میں سمجھ نہ سکا کہ وہ میری گولی پر اس طرح کیوں گرا کہ جیسے مر گیا ہو۔

(ب) پہاڑی پر سے جب وہ گرا تو درخت کی شاخوں نے اسے سہارا دے دیا، مگر گرنے کی وجہ سے وہ چکرا گیا۔

(ج) جوں ہی اسے ہوش آیا ہو گا وہ جھاڑیوں میں چھپ کر اپنے زخم کو چاٹنے لگا ہو گا۔

جس وادی میں یہ آدم خور چلا گیا تھا وہاں گھاس تھی اور کھلا ہوا میدان تھا۔ لہٰذا اس کا پتا چلانا ناممکن تھا، لیکن چھپنے کی جگہ تلاش کرنے کے لیے اس کو پھر پہاڑی کو پار کرنا تھا۔ پہاڑی پر جانوروں کے چلنے سے ایک پگڈنڈی سی بن گئی تھی۔ چوں کہ یہاں پیروں کے نشانات ملنے کی اُمید تھی اس لیے میں اُدھر چل پڑا۔ پگڈنڈی پر مجھے بکری، ہرن اور دوسرے جانوروں کے پیروں کے نشانات دکھائی دیے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ جتنا جتنا میں آگے بڑھتا گیا اتنا ہی مایوسی کا سامنا ہوتا گیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر مجھ کو یہاں چیتے کے پیروں کے نشانات نہیں ملے تو پھر اس کا پتا چلانا بڑا دشوار ہو گا۔ آخر پہاڑی سے ایک میل کے فاصلے پر مجھے چیتے کے پیروں کے نشانات مل ہی گئے۔

پگڈنڈی کے ایک جانب ایک ڈھلوان تھی جس پر چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ اور اس کے آگے ستّر فیٹ نیچے ایک ندی تھی۔ میں پیروں کے نشانات دیکھتا ہوا اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں چیتے نے پگڈنڈی چھوڑ کر نیچے جانا شروع کیا تھا۔ غالباً وہ زخمی ٹانگ کی وجہ سے جا بجا لڑھکتا ہوا گیا تھا۔ پھر گھوم کر اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر پگڈنڈی پر واپس آنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکا اور لڑھک کر پتھریلی ندی میں جا گرا تھا۔ آگے چل کر مجھے ایک جگہ ایسی مل گئی جہاں سے میں نیچے ندی تک پہنچ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ستّر فیٹ کی بلندی سے اگر کوئی جانور پتھروں پر گرے گا تو وہ زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ چناں چہ جوں ہی میں اس جگہ پہنچا تو ایک

بڑے سے جانور کا پیٹ دکھائی دیا، مگر یہ چیتا نہیں تھا بلکہ ایک بکرا تھا۔ غالباً وہ سو رہا ہو گا اور اوپر چیتے کی آہٹ پر بھاگا ہو گا اور نیچے چٹان پر کود پڑا ہو گا۔ قریب ہی تھوڑی سی ریتیلی جگہ تھی جس پر چیتا گرا۔ گرنے کی وجہ سے اس کے کندھے کا زخم اور کھل گیا، مگر اور نقصان نہیں ہوا۔ چیتا بکرے کو نظر انداز کرتا ہوا ندی کو پار کر گیا اور جنگل کی طرف چلا گیا۔ ندی کے اس کنارے پر اس نے چڑھنے کی بار بار کوشش کی، مگر کام یاب نہ ہو سکا۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے آس پاس کی جھاڑیوں میں ضرور مل جائے گا۔

لیکن قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ بادل کچھ عرصے سے اکٹھا ہو رہے تھے اور اب بڑے زور کی بارش شروع ہو گئی۔ جس کی وجہ سے خون کے نشانات صاف ہو گئے۔ رات بھی ہونے والی تھی اور مجھے بڑی دُور جانا تھا، اس لیے میں اپنے کیمپ واپس ہوا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد دو روز اور میں چیتے کے پیروں کے نشانات کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ یوں تو میں اس کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر خود چیتے کی دُم بھی نظر نہ آئی۔ یہ بات اب صاف ظاہر تھی کہ چیتا بلا مقصد نہیں گھوم رہا ہے بلکہ وہ شکار کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ گھنی جھاڑیوں میں نہیں جا رہا تھا بلکہ کھلی ہوئی ان پگڈنڈیوں پر چل رہا تھا جن پر جانور چلتے رہتے تھے۔ چناں چہ اس کو ایک سوتا ہوا ہرن مل گیا۔ یہ بچّہ تھا۔ چیتے نے اسے مار ڈالا۔ اب میں اس کے بہت قریب تھا اور یہ جانتا تھا کہ ہرن کے بچّے سے اس کا پیٹ تو ہرگز بھرا نہ ہو گا بلکہ اور بھوک بڑھی ہو گی۔ لہٰذا میں زیادہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔

اگر میں پوری طرح صحت یاب ہوتا تو شاید میں اس کو پکڑ لیتا مگر چند روز قبل اتفاق سے کسی نے میرے کان کے بالکل قریب بندوق چلا دی تھی جس کی وجہ سے میرے کان کا پردہ پھٹ گیا تھا اور کان پک گیا تھا۔ اب میرے لیے سَر ہلانا بھی دشوار تھا۔ لہٰذا میں نے چیتے کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ اس وقت چیتا گاؤں کی جانب جا رہا تھا۔

اپنے کیمپ پہنچنے پر مجھے احساس ہوا کہ میں سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میرے سَر میں بجلی کے جھٹکے لگ رہے ہوں۔ رات رات بھر جاگنے اور غذا کی کمی کے سبب میں بہت کم زور ہو گیا تھا۔ میں تلادیس اس لیے آیا تھا کہ یہاں کے رہنے والوں کو اس چیتے کے عذاب سے نجات دلاؤں، لیکن اب تک میں نے ان کی تکلیف کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا تھا۔ چیتا زخمی ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ معمول کے مطابق شکار کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے بجائے اب وہ انسانوں کا شکار

کرے گا۔ اس لیے اب مجھے اس چیتے کو ٹھکانے لگانا انتہائی ضروری ہو گیا تھا۔

چناں چہ میں نے اپنے آدمیوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ وہ گاؤں جائیں اور میرا انتظار کریں۔ پھر میں اپنی رائفل اُٹھا کر چاندنی رات میں چل پڑا۔ میرے آدمی چُپ چاپ مجھ کو دیکھتے رہے۔ میں نے جب مُڑ کر دیکھا تو ایک آدمی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔

زندگی بھر جنگلی جانوروں کا مقابلہ کرنے کے بعد بھی مجھے چیتے کے دانتوں اور پنجوں سے آج بھی اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا کہ پہلے لگتا تھا۔ بہرحال برسوں تک ان کا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے ان کی عادات سے خوب واقف ہو گیا تھا اور رات کو گولی چلانے میں بھی مشاق ہو گیا تھا۔ یوں تو قریب قریب میں بہرہ ہو چکا تھا پھر بھی مجھے یقین تھا کہ میں اس سے نمٹ لوں گا۔ مجھے صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤں اور بالکل یہی ہو بھی گیا۔ میں چیتے کے پیروں کے نشانات دیکھتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ یک بارگی مجھے بڑے زور سے چکّر آ گیا۔ میں بڑی مشکل سے ایک درخت کی شاخ کا سہارا لینے پایا تھا کہ میرے کان کا پھوڑا پھوٹ گیا اور پھر مجھے خبر نہیں رہی کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن آدھی رات کے قریب میری حالت کچھ سنبھلی۔ میں نے سَر اُٹھا کر دیکھا تو مشرق میں کچھ روشنی ہو رہی تھی۔ میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں، لیکن میرے سَر کا درد غائب ہو گیا تھا۔ چیتے کو مارنے کا ایک موقع تو نکل گیا تھا، مگر میری حالت اب بہتر ہو گئی تھی۔ لہٰذا بعد کو پھر موقع ملنے کی امید تھی۔

میں درخت سے نیچے اُترا اور رائفل لے کر تلّا کوٹ کی جانب چل پڑا۔ میرے آدمیوں نے جب مجھے آتے ہوئے دیکھا تو وہ خوشی سے چلّائے، "صاحب آ گئے!" میں نے کہا، "ہاں، میں آ گیا ہوں اور اب بہتر ہوں۔" ان لوگوں کو خطرے کا اچھی طرح احساس تھا۔ اس لیے رات بھر یہ آگ جلا کر انتظار کرتے رہے تاکہ میری مدد کر سکیں۔

میں کئی گھنٹے سوتا رہا۔ پھر کسی کی آواز سُن کر جاگ پڑا۔ بہت سے لڑکے اور آدمی مجھے یہ بتانے آئے تھے کہ آدم خور نے گاؤں کی دوسری جانب چھے بکریوں کو مار ڈالا ہے۔ چناں چہ میں جلدی سے جوتے پہن کر اور رائفل لے کر چل پڑا۔ اس بار بھی ڈونگر سنگھ میرے ساتھ ہو گیا۔ بکریاں وادی کے ایک گڑھے میں پڑی تھیں۔ پیروں کے نشانات دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ان بکریوں کو چیتے نے مارا ہے۔ چیتا گاؤں آدمیوں کی تلاش میں گیا تھا۔ اس میں وہ کام یاب نہیں ہوا تو اس نے بکریوں کو مار ڈالا۔ میں ابھی وہاں کھڑا ہوا تھا کہ ایک پرندہ پہاڑی پر زور زور سے چلّانے لگا۔ اس پرندے

کے چیخنے کا سبب صرف چیتا ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے ڈونگر سنگھ کو گاؤں واپس بھیج دیا اور رائفل لے کر اس کے راستے کی حفاظت کرنے لگا۔ پھر میں ایک بڑی سی چٹان کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ میں شاید ایک گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ اس کے بعد پھر وہی پرندہ چیخنے لگا اور دو دو سری چڑیاں چیختی ہوئی اُڑ گئیں۔ عین اسی وقت میں نے دیکھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر جھاڑیوں کے اندر سے چیتا چلا آرہا ہے۔ آخر وہ اس گڑھے کے کنارے آ کر بالکل میرے مقابل بکریوں کو دیکھنے لگا۔ فاصلہ صرف ساٹھ گز کا تھا۔ میں نے نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ چیتے کے قریب کچھ مٹی اُڑی۔ میری گولی چیتے کے دل کے قریب سے گزرتی ہوئی آر پار ہو گئی قبل اس کے کہ میں دوسری گولی چلاتا چیتے نے چھلانگ ماری اور غائب ہو گیا۔

مجھے اپنے اوپر بڑا غصّہ آیا کہ میں نے اتنا عمدہ موقع ضائع کر دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ اب چیتا مجھ سے بچ کر نہ جانے پائے۔ چناں چہ میں نے کُود کر گڑھے کو پار کیا۔ دوسرے کنارے پر خون کے داغ تھے۔ میں کئی گز تک ان نشانات کو دیکھ کر چلتا رہا۔ پھر میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ چیتا اچانک حملہ کر بیٹھے گا۔

یہ پگڈنڈی ایک ایسی جگہ تک جاتی تھی جہاں پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ وہیں کہیں چیتا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سامنے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ میں جھاڑیوں سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر تھا کہ پگڈنڈی کے بائیں جانب مجھے کچھ حرکت دکھائی دی۔ وہ چیتا تھا جو چھلانگ مارنے کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ حال آنکہ وہ زخمی تھا اور بھوکا بھی تھا پھر بھی وہ مقابلہ کرنے پر تُلا ہوا تھا، مگر وہ چھلانگ لگا نہ سکا۔ میں نے گولی چلا دی اور گولی نے اس کی گردن توڑ دی۔

تلّاکوٹ میں ہر شخص نے یہ شکار ایک اونچی سی پہاڑی پر سے دیکھا۔ میں نے ابھی اپنی ٹوپی اُتاری ہی تھی کہ اسے ہلاؤں کہ لڑکوں اور آدمیوں نے بڑے زور سے شور مچانا شروع کر دیا اور دوڑتے ہوئے نیچے چلے آئے۔ مادہ چیتے کو ایک بانس میں باندھ لیا گیا اور چھے آدمی اسے اُٹھا کر فاتحانہ انداز میں گاؤں کے اندر داخل ہوئے۔ بعد میں جب لوگ مجھے گھیرے ہوئے تھے میں نے چیتے کی کھال اُتاری۔ میں نے دیکھا کہ میری پہلی گولی چیتے کے داہنے کندھے میں لگی تھی۔

تین روز بعد میں نینی تال واپس آ گیا اور بعد میں ہسپتال میں داخل ہو گیا جہاں میرے کان کا علاج کیا گیا اور میں اس قابل ہوا کہ پھر سے چڑیوں کا گانا سُن سکوں۔

خوش رہنا سیکھو

ریحانہ زماں

تم نے پھولوں کو ضرور دیکھا ہوگا۔ شگفتہ، تر و تازہ جھکتے ہوئے پھول دل و دماغ کو کتنی فرحت و راحت بخشتے ہیں۔ حال آنکہ ڈالیوں پر کانٹے بھی ہوتے ہیں، مگر وہ پھر بھی مسکرانا نہیں بھولتے۔ زندگی خداوندِ عظیم کا بیش بہا عطیہ ہے، جس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ زندگی میں پھولوں کی طرح خوش گوار اور دل کش نظارے بھی ہیں اور کانٹوں کی سختی اور کھٹک بھی۔ اس میں مسرت و غم دونوں کا حصّہ ہے۔ جہاں غم نہ ہوں، حادثات نہ ہوں، وہاں خوشی کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ انسان اسی وقت دل کی گہرائیوں سے خوش ہوتا ہے جب اپنے غموں کی گھٹا ٹوپ سیاہی میں اُمید کی کوئی کرن جگمگا جائے۔ اگر صرف خوشی ہی خوشی ہوتی تو انسان کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ ایک چینی فلسفی لاؤتزے کہتا ہے: "کائنات میں خوب صورتی صرف اس وجہ سے ہے کہ بد صورتی بھی موجود ہے۔" گویا زندگی کا یہ تضاد ہی انسان کو حُسن کی طرف مائل کرتا ہے، دل کش بناتا ہے۔

اب یہ تمھاری اور ہماری ذمّے داری ہے کہ خوشی کے لمحات کو حاصل کیا جائے۔ بعض لوگ آپ نے دیکھے ہوں گے انھیں کتنی ہی بڑی خوشی کیوں نہ مل جائے منھ پُھلائے رکھتے ہیں اور ہمیشہ رنجیدہ اور افسردہ رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض بچّے اُداس اور تنہا رہتے ہیں۔ اس طرح وہ کسی اور کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ دوسرے انھیں دوست بنانا پسند نہیں کرتے۔ ان کی صحّت گری گری رہتی ہے اور وہ زندگی کی نعمت سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوتے۔ اب تم کہو گے کہ اگر کسی کو تقدیر کی طرف سے غم ہی غم ملے ہوں اور اس کے حالات اس طرح کے ہوں کہ مسکرانا بھی جبر ہو تو پھر کیا کیا جائے۔ یہ تو سب انسان پر منحصر ہے۔ باہر کے موسم اُسی وقت دل کش لگتے ہیں جب انسان اندر سے پُرسکون ہو۔ غموں سے کسی کو مُفر نہیں۔

وہی لوگ قابلِ فخر اور مثالی ہیں جو غموں سے جنگ کرنا سیکھیں۔ اپنے حالات سے سمجھوتا کریں۔ حوصلے اور توانائی سے حالات پر قابو پالیں اور پھر یقیناً جب زندگی میں وہ اپنی جد و جہد سے غموں

کو شکست دے دیں گے تو مسرتوں کا دور شروع ہو گا اور وہ حقیقی و روحانی مسرّت محسوس کریں گے۔

"خوشی" کوئی ایسی شے نہیں، جس کو دولت خرید سکے۔ بعض امیر لوگ، کام یاب لوگ بے سکونی کا شکار رہتے ہیں۔ خوشی اور مسرت کی کرنیں دل سے پھوٹتی ہیں اور سارے وجود کو منوّر کر دیتی ہیں۔ خوشی تو انسان اپنی ذات میں پیدا کرتا ہے۔ قدرت نے ہمارے لیے قدم قدم پر خوشی کا سامان پیدا کیا ہے۔ دل کش نظارے، دمکتی ہوئی دھوپ، پرندوں کی چہچہاہٹیں، تاروں کی چمک اور چاند کا خوب صورت سنہرا ہالہ۔ دل و ذہن اگر کھلے اور کشادہ ہوں تو یہ مناظر روح میں فرحت و انبساط پیدا کر دیتے ہیں۔ انسان توانائی محسوس کرتا ہے اور خود کو کائنات کا حصّہ سمجھنے لگتا ہے۔

سچّی خوشی کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جو زیادہ پائیدار اور عظیم ہے۔ وہ ہے دوسروں کو خوش رکھنا، دوسروں کی خدمت کرنا، محنت و لگن سے کوئی مقصد حاصل کرنا۔ تم نے دیکھا ہو گا جب تم اپنی ذاتی محنت سے کوئی کام یابی حاصل کرتے ہو تو دِل کے گوشے میں مسرّت جاگ اٹھتی ہے جو چہروں کو بھی روشنی بخشتی ہے۔ مایوسیاں، احساسِ کم تری، فکر، پریشانیاں انسان کو کم زور کر دیتی ہیں۔ نتیجے میں وہ مسرّتوں سے رُوٹھ جاتا ہے۔ اور زندگی بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے۔ فکر و پریشانیاں تو زندگی کا حصّہ ہیں۔ محرومیاں بھی قدرت کی عطا کردہ ہوتی ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص آنکھوں کے نُور سے محروم ہے، نابینا ہے، تو کیا وہ اپنی بقیہ زندگی افسوس و غم میں گزار دے۔ اس طرح تو وہ خود کو اور تباہ کرے گا۔ اگر وہ صحت مند سوچ کا مالک ہے تو زندہ رہنے کے لیے نئی راہیں پیدا کرے گا اور دنیا میں اپنا مقام بنائے گا اور اس طرح وہ خوشیوں سے محروم نہ رہے گا۔ خداوند تعالیٰ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی خوبی دیتا ہے۔ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کریں، انھیں پروان چڑھائیں تو نہ صرف ہم خوش رہیں گے بلکہ دوسرے بھی ہم سے ملنے میں مسرّت محسوس کریں گے اور ہمیں چاہیں گے۔ اگر ہم لوگوں کے ساتھ مِل جُل کر، محبّت اور خلوص سے رہیں تو زندگی خوب صورت لگنے لگتی ہے۔

عزیز نونہالو! مایوسی اور غم کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دو۔ اگر کبھی ناکامی یا پریشانی ہو تو اُسے فراخ دِلی اور کشادہ ذہن سے قبول کر لو اور اس سے نجات کی کوشش کرو، اور پہلے سے زیادہ توانائی اور لگن سے محنت کرو۔ زندگی کا ہر پَل جو بیت رہا ہے وہ ماضی بن جاتا ہے۔ ہم اُسے گزار رہے ہیں، مگر عقل مند لوگ ایک ایک پَل سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور شب و روز محنت و مشقّت سے دنیا میں اپنا اُونچا مقام بناتے ہیں۔ اگر تم بڑے آدمیوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرو تو اندازہ ہو گا کہ

ان میں سے اکثر کے بچپن محرومیوں سے عبارت تھے۔ کوئی لکڑہارا تھا، کوئی موچی تھا، کوئی کسان تھا، مگر وقت نے اور تاریخ نے دیکھا کہ وہ کیا سے کیا بن گئے، صرف اور صرف اپنی ذاتی کوششوں اور محنت سے۔

خوشیاں صحت مند ذہنوں میں قیام کرتی ہیں اور مایوس و نا اُمید لوگوں سے دُور بھاگتی ہیں۔ تم آج ہی سے، اِسی پل سے اپنا جائزہ لو کہ کہیں تمھاری زندگی مایوسیوں کا شکار تو نہیں۔ تم مسرتوں سے محروم تو نہیں اور پھر عہد کرو کہ میں آئندہ اپنی زندگی کو قیمتی جانوں گا اور سچی مسرتیں حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم دیکھو گے کہ کچھ ہی عرصے میں تم ذہنی اور جسمانی طور پر توانائیوں سے مالا مال ہو جاؤ گے۔ علم طب بھی یہی کہتا ہے کہ بہت ساری بیماریاں فکر، تشویش اور مایوسیوں کی پیداوار ہوتی ہیں مثلاً بلڈ پریشر، معدے کا زخم، ذہنی بیماریاں وغیرہ وغیرہ۔ میں اس اُمید پر کہ تم کوشش کرو گے تم سے اجازت چاہوں گی۔

الگ، الگ

بعض نونہال اپنے مضامین، کہانیاں، لطیفے، سوالات، خیال کے پھول، خبریں اور خط وغیرہ ایک ہی صفحے پر لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس طریقے سے ان کی چیزیں شائع نہیں ہو سکتیں اور ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے ہر چیز کو الگ کاغذ پر لکھنا چاہیے اور اس پر اپنا نام اور پتا بھی صاف لکھنا چاہیے تاکہ ہم ان کو علاحدہ علاحدہ فائلوں میں رکھ سکیں اور نمبر آنے پر شائع کر سکیں۔ ایک بچے نے خط لکھا اور اُسی کے پیچھے لطیفہ بھی لکھ دیا۔ وہ لطیفہ چھپ سکتا تھا، لیکن علاحدہ کاغذ پر نہ لکھا ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا اس لیے آپ جتنی چیزیں لکھیں الگ الگ کاغذوں پر لکھیں۔ ہاں ان کو ایک ہی لفافے میں رکھ کر بھیج سکتے ہیں، یعنی ہر چیز کے لیے علاحدہ لفافہ بھیجنا ضروری نہیں ہے۔

The Sensational gift for all occasions

BROCHE

NO. 51

Parfum Cologne Spray

ہر موقع کے لئے ایک منفرد خوشبو
ایک منفرد تحفہ

NO. 51 بروچ

پرفیوم کلون
اسپرے

R1/82

بصرہ کا سُنار

علی اسد

بہت دِنوں کی بات ہے کہ شہر بصرہ میں ایک نوجوان سُنار حَسن رہا کرتا تھا۔ ایک دن حسن اپنی دُکان میں بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا کہ ایک اجنبی داخل ہوا۔ حَسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اجنبی ایک جادوگر ہے اور ایک خاص مقصد کے لیے آیا ہے۔ اجنبی نے پہلے توحُسن کے زیورات کی تعریف کی پھر حَسن کی کتاب دیکھ کر بولا،"میرے پاس ایک کتاب ہے، سُنار کی حیثیت سے تمھارے لیے یہ کتاب بڑی دِل چسپ ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک نہایت پرانی کتاب نکالی۔ حَسن نے پوچھا، "اس کتاب میں کیا ہے؟" جادوگر بولا،" اس میں سونا بنانے کی ترکیب لکھی ہوئی ہے۔" حَسن

نے پوچھا، "کیا آپ مجھ کو سونا بنانا سکھا دیں گے؟" جادوگر نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر بولا "حَسن میں تم کو پسند کرتا ہوں اور میرا کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں تم کو ضرور سکھاؤں گا۔ میں کل آؤں گا پھر باتیں ہوں گی۔"

دوسرے دن حَسن جب دُکان کھولنے آیا تو دیکھا کہ وہ اجنبی پہلے ہی سے وہاں موجود ہے۔ حَسن نے اسے دُکان میں بٹھایا اور نوکر کو قہوہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ اب جادوگر نے حَسن سے کہا، "آگ جلاؤ، ہم اس پر سونا بنائیں گے۔" حَسن نے آگ جلائی۔ جادوگر نے تھوڑا سا تانبا مانگا۔ پھر اس نے تانبے کو خوب گرم کیا۔ جب وہ گل گیا تو اس نے اپنی پگڑی میں سے ایک سفوف نکالا اور اس پر چھڑک دیا۔ حَسن آگ کو خوب تیز کرتا رہا۔ تھوڑی دیر میں تانبا اپنی شکل تبدیل کرنے لگا اور سونا بن گیا۔ پھر جب وہ ٹھنڈا ہو گیا تو جادوگر بولا "اسے اب بازار لے جاؤ اور دیکھو دوسرے سُنار اس کے کیا دام دیتے ہیں۔ پھر تم کو معلوم ہو گا کہ میں صحیح کہتا ہوں یا غلط۔ اس سونے کو بیچ ڈالنا اور رُپیہ لے آنا۔"

حَسن اس سونے کو لے کر بازار گیا اور اسے اس کی قیمت بیس ہزار رُپے ملے۔ جادوگر نے کہا، "یہ رُپے تم رکھ لو۔" حَسن بے حد خوش ہو گیا اور رُپے لے کر اپنی ماں کے پاس گیا۔ ماں نے کہا:

"بے وقوف لڑکے، میں تجھ کو ہمیشہ سمجھاتی رہتی ہوں کہ لالچ میں نہ پڑنا اور اجنبی آدمی پر بھروسا نہ کرنا مگر تو نہیں مانتا۔" حسن نے ماں کی بات نہ سُنی اور دُکان پر چلا گیا، جہاں جادوگر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد حسن اور جادوگر میں گہری دوستی ہو گئی اور پھر جادوگر نے حَسن کے گھر میں سونا بنایا۔ جب حَسن نے جادوگر سے وہ سفوف مانگا تو وہ بولا "افسوس ہے کہ یہ سفوف اب ختم ہو گیا ہے، مگر میں تم کو اس کا نسخہ بتائے دیتا ہوں۔" پھر اس نے بہت سی جڑی بوٹیوں اور کیمیائی چیزوں کے نام بتائے، جن کو حسن نے یاد کر لیا۔ اس کے بعد جادوگر نے حسن کو ایسی مٹھائی کھلائی، جس میں نشہ آور چیز تھی۔ چناں چہ حسن بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی جادوگر نے بکسوں میں گھر کا سارا سامان بھر لیا اور مزدوروں کو بُلا کر تمام بکس اُٹھوا لے گیا۔ ایک بکس میں خود حَسن کو بھی لیتا گیا۔ جادوگر یہ سب لے کر سیدھا ایک جہاز پر سوار ہو گیا اور کپتان سے کہا، "فوراً لنگر اُٹھا دو۔" چناں چہ جہاز روانہ ہو گیا اور یہ لوگ بصرہ

سے بہت دُور نکل گئے۔

حَسن کی ماں جب گھر واپس آئی، تو اس نے دیکھا کہ گھر لُٹا پڑا ہے اور اس کا بیٹا بھی غائب ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ سب جادوگر کا کیا دھرا ہے۔ بے چاری رونے چلّانے لگی۔ پڑوسیوں نے تسلّی دی۔ ادھر جہاز پر حَسن کو آہستہ آہستہ ہوش آ گیا۔ جہاز کے ملّاح اس کو مارتے پیٹتے رہے۔ پھر جادوگر آ گیا اور بولا، "تمھارے لیے میں نے بڑا عمدہ کام سوچا ہے۔ گھبراؤ نہیں، کیوں کہ تم تو میرے لیے بیٹے کی طرح ہو۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" حَسن نے پوچھا، مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ بہرحال سفر جاری رہا اور کئی مہینوں کے بعد جہاز ایک جگہ لنگر انداز ہوا۔ جادوگر نے کہا، "معاف کرنا بیٹا، میں نے یہ تمھاری بھلائی کے لیے کیا ہے۔" پھر اس نے جہاز کے کپتان اور ملّاحوں کو رخصت کر دیا۔ صرف جادوگر اور حسن رہ گئے۔ جادوگر نے ایک چھوٹے سے ڈھول پر لکڑی ماری۔ فوراً تین اونٹ نمودار ہو گئے۔ "سوار ہو جاؤ، ہم کو بہت دُور جانا ہے۔" جادوگر بولا۔ چناں چہ ایک اونٹ پر حَسن، ایک پر جادوگر اور ایک پر سامان لاد دیا گیا۔ کئی دن کے سفر کے بعد یہ لوگ ایک چشمے پر رُکے تاکہ اونٹوں کو پانی پلایا جائے۔ حَسن کو سامنے ایک بڑا خوب صورت محل دکھائی دیا۔

"یہ محل کون سا ہے؟" حَسن نے پوچھا۔ "یہ میرے دشمن کا گھر ہے۔" جادوگر بولا اور تیزی سے آگے چل دیا۔

سات دن چلنے کے بعد یہ لوگ ایک پہاڑ کے پاس رُکے۔ پہاڑ پر برف جمی ہوئی تھی۔ جادوگر بولا، "یہ ہے وہ پہاڑ۔ اس پہاڑ پر ایک چیز اُگتی ہے، اسی سے میں سونا بناتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ تم جا کر لے آؤ۔ پھر ہم دونوں مل کر اتنا سونا بنائیں گے کہ کسی چیز کی ضرورت نہ رہے گی۔"

"اچھا۔" حَسن بولا، کیوں کہ اب وہ جادوگر کے نرغے میں پوری طرح آ چکا تھا۔ پہاڑ کے پاس ایک طرف اشارہ کر کے جادوگر بولا، "وہاں بھوت پریت رہتے ہیں!" پھر جادوگر نے ایک اونٹ کو مار ڈالا اور حَسن کو اس کی کھال میں لپیٹ دیا اور حَسن سے کہا کہ وہ پہاڑ پر کھڑا ہو جائے۔

"مگر میرا کیا حشر ہوگا؟" حَسن نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"رُخ آ کر تم کو اُٹھا لے جائیں گے پہاڑ کی چوٹی پر۔ وہاں ان کا بڑا سا گھونسلا ہے۔ تم

چاقو سے اونٹ کی کھال کاٹ ڈالنا اور باہر نکل آنا۔ پھر ان پرندوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دینا۔"

"یہ رُخ کیا ہوتے ہیں؟" حسن نے پوچھا۔

"یہ بہت بڑے پرندے ہوتے ہیں۔ وہ تم کو اونٹ سمجھ کر اُٹھالے جائیں گے اور تم کو کھانا چاہیں گے، مگر تم ان کو بھگا دینا اور تھوڑی سی وہ لکڑی نیچے پھینک دینا جو اس گھونسلے میں ہو گی۔"

یہ کہہ کر جادوگر ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے چھُپ گیا۔ حسن سہما ہوا انتظار کرتا رہا۔ پھر ایک بہت بڑا پرندہ اُڑتا ہوا آیا اور جھپٹا مار کر اس کو اُٹھالے گیا اور لے جا کر پہاڑ کی چوٹی پر اپنے گھونسلے میں رکھ دیا۔ حسن کو وہ پرندہ اس آسانی سے اُٹھالے گیا کہ جیسے وہ چھوٹا سا چوہا ہو۔ حسن نے چاقو سے اونٹ کی کھال کاٹ ڈالی اور باہر نکل آیا۔ پھر اس نے پرندے کو بھگا دیا۔ اتنے میں جادوگر کی آواز آئی،

"لکڑی نیچے پھینک دو۔" حسن کو جتنی لکڑی گھونسلے میں ملی وہ اس نے نیچے پھینک دی۔ جادوگر چلّایا، "ٹھیک ہے، مجھے جتنی درکار تھی وہ مِل گئی۔ اب میں جاتا ہوں اور تم اسی جگہ سڑتے رہو!"

اس کے بعد حسن کو جادوگر کے قہقہے کی آواز سُنائی دی۔ جادوگر اپنے اُونٹ پر سوار ہو کر چل دیا۔ دوسرے اُونٹ پر وہ قیمتی لکڑی لاد لی۔ حسن کا ڈر کے مارے دَم نکلا جا رہا تھا۔ اب پہاڑ سے نیچے کیسے اُترے گا؟ اور اگر اس پرندے نے حملہ کر دیا تو؟ بہر حال وہ نیچے اُتر آیا اور چلتے چلتے اس محل کے پاس پہنچ گیا جس کے بارے میں جادوگر نے کہا تھا کہ میرے دشمن کا گھر ہے۔ حسن سوچنے لگا کہ اگر یہ لوگ جادوگر کے دشمن ہیں تو پھر وہ میری مدد کریں گے۔ پھاٹک کھُلا ہوا تھا۔ حسن اندر داخل ہو گیا اور ایک کمرے میں پہنچ گیا، جہاں دو خوب صورت لڑکیاں شطرنج کھیل رہی تھیں۔ حسن کو دیکھ کر انھوں نے ذرا بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ "تم کون ہو؟" ایک لڑکی نے پوچھا اور دوسری لڑکی مُسکراتی رہی۔

"میں بصرہ کا سُنار ہوں، حسن میرا نام ہے۔" اس نے جواب دیا اور پھر اپنا سارا قصّہ سُنا دیا۔

دوسری لڑکی بولی، "تم ہمارے ساتھ رہو اور ہمارے بھائی بن جاؤ۔ تم کو صحیح سلامت دیکھ کر ہم کو خوشی ہوئی، کیوں کہ کچھ عرصے پہلے ہم نے تم کو اس خطرناک جادوگر کے ساتھ

جاتے دیکھا تھا۔"

حسن نے کہا، "ہاں، اس نے مجھے پہاڑ پر مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔" چھوٹی لڑکی بولی، "اب ہم تم کو اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ ہم لوگ ایک بادشاہ کی بیٹیاں ہیں۔ ہمارے باپ جنوں کے ایک بادشاہ ہیں۔ ہم سات بہنیں ہیں۔ پانچ بہنیں شکار کو گئی ہیں۔ ہمارے والد یہ نہیں چاہتے کہ ہم کسی سے ملیں۔" حسن نے پوچھا، "تمھارا دل یہاں نہیں گھبراتا؟" لڑکیوں نے کہا، "نہیں، ہم کو یہاں ہر طرح کا آرام میسّر ہے۔ جب کوئی شادی ہوتی ہے یا تہوار ہوتا ہے تو ہم کو بڑی شان کے ساتھ یہاں سے لے جایا جاتا ہے۔" اتنے میں دوسری لڑکیاں بھی آ گئیں۔ سب نے حسن کو بھائی کی طرح قبول کر لیا۔ اس کے بعد حسن بڑے آرام سے وہاں رہنے لگا۔ حسن کو ایک خفیہ کمرہ رہنے کو دے دیا گیا تھا۔ ایک دن حسن نے دیکھا کہ وہی جادوگر ایک نوجوان کو لیے چلا آ رہا ہے۔ ساتوں بہنوں نے حسن کو ہتھیاروں سے لیس کر دیا اور حسن جادوگر سے لڑنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جادوگر اونٹ کی کھال اُتارنے میں مشغول تھا۔ لہٰذا وہ دیکھ نہ سکا اور حسن اس کے سر پر آ پہنچا۔ حسن نے کہا، "او نابکار، میں زندہ ہوں اور تجھ کو موت کے گھاٹ اُتارنے آگیا ہوں!" یہ کہہ کر حسن نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ جادوگر کی گردن دُور جا گری۔ وہ نوجوان جو جادوگر کے اونٹ سے بندھا ہوا تھا۔ حیران رہ گیا۔ بولا، "میں تمھارا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

حسن نے کہا، "جاؤ، اب اپنے گھر جاؤ۔" پھر حسن نے اس نوجوان کو اونٹ دے دیے اور وہ روانہ ہو گیا۔ لڑکیاں حسن کی بہادری دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ پھر سب لوگ کھانا کھانے محل میں آئے۔ ابھی یہ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ آسمان پر ایک بادل دِکھائی دیا، لڑکیوں نے کہا، "حسن جلدی سے چھپ جاؤ! ہمارے والد کی فوج آ رہی ہے۔" چناں چہ وہ چھپ گیا۔ فوج نے تین دن اور تین رات محل میں قیام کیا۔ تیسرے دن چھوٹی شہزادی حسن کے پاس آئی اور بولی، "ہم لوگ ایک شادی میں جا رہے ہیں۔ دو مہینے بعد آئیں گے۔ اس وقت تک تم اس کو اپنا ہی گھر سمجھو، مگر اس دروازے کو ہرگز نہ کھولنا۔ ورنہ بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

جب فوج اور شہزادیاں چلی گئیں تو حسن کو تنہائی سے بہت تکلیف ہوئی، مگر پھر وہ شکار

میں لگ گیا اور اپنا کھانا پکانے لگا۔ اس کے باوجود وہ بار بار اس چھوٹے دروازے کو دیکھتا رہتا تھا۔ آخر وہ ضبط نہ کر سکا اور ایک دن اس نے وہ دروازہ کھول لیا۔ اندر کچھ زینے ملے۔ وہ ان پر چڑھ گیا اور ایک خوب صورت بالکونی پر پہنچ گیا۔ سامنے سرسبز میدان تھا، رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور ایک جھیل بھی تھی۔ حسن نے دیکھا کہ دس شاندار چڑیاں اس جھیل پر آ کر اُتریں، انھوں نے پانی پیا اور پانی میں کھیلنے لگیں۔ پھر یہ چڑیاں عجیب و غریب آوازیں نکالتی ہوئی گھاس پر آ گئیں اور اپنے جھلملاتے ہوئے پَروں کو اپنے پنجوں سے نوچنے لگیں اور پھر وہی چڑیاں یکایک خوب صورت عورتوں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں۔ حسن حیران رہ گیا۔ ایک چڑیا نے اس قدر خوب صورت شکل اختیار کی کہ حسن دَم بہ خود رہ گیا۔ پھر انھوں نے اپنے پَروں کے لباس کو رکھ کر جھیل میں چھلانگ مار دی اور مُرغابیوں کی طرح پیرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی سے نکل آئیں اور اپنے جسم کو خشک کرنے لگیں۔ پھر جو سردار تھی وہ بولی:

"اے بادشاہ زادیو، بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اُڑنا چاہیے۔" اس کے بعد وہ پھر چڑیوں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں اور پرواز کر گئیں۔ حسن پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ روزانہ وہ اس کمرے کو کھولتا اور جھیل کو دیکھتا رہتا، مگر وہ پھر نہ آئیں۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ آسمان پر بادل آ رہے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ شہزادیاں واپس آ رہی ہیں۔ حسن چھپ گیا اور جب فوج چلی گئی تو چھوٹی شہزادی اُسے بُلانے آئی۔ حسن کو غم زدہ دیکھ کر اس نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ حسن نے ان چڑیوں کا سارا ماجرا کہہ سُنایا اور بتا دیا کہ وہ ان کی سردار کے لیے بے قرار ہے۔

شہزادی نے کہا، "میری بہنوں کو نہ بتانا ورنہ وہ تم کو کڑی سزا دیں گی۔" چھوٹی شہزادی نے اپنی بہنوں سے کہا کہ حسن تنہائی کی وجہ سے غم زدہ نظر آتا ہے۔ اب ہم لوگ آ گئے ہیں لہٰذا ٹھیک ہو جائے گا، مگر حسن کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ اتنے میں ان بہنوں کے شکار کا زمانہ آ گیا۔ وہ چھوٹی بہن کو حسن کے پاس چھوڑ کر چلی گئیں۔ جوں ہی وہ گئیں تو چھوٹی بہن نے حسن سے کہا، "چلو، مجھے بھی دِکھاؤ۔ میں بھی ان کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

حسن نے اسے بتایا کہ اس جگہ پر وہ اُتری تھیں۔ چھوٹی شہزادی بولی، "بھائی، تم تو

جنوں کے ایک بادشاہ کی بیٹی کی محبت میں مبتلا ہو گئے ہو اور وہ بڑی لڑکی تو بے حد چالاک ہے۔ تم تو بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔" حسن نے کہا" جو بھی ہو، میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" اس پر چھوٹی شہزادی بولی،" پھر تو تم یہ کرو کہ جس وقت وہ اپنے پَروں کو علاحدہ کریں تو تم منتظر رہو اور اس کے پَروں کو اپنے قبضے میں کر لو اور کہیں چھپا دو۔ پھر تم اس سے شادی کر سکو گے۔" حسن نے کہا" میں روزانہ اس کا انتظار کرتا رہوں گا۔" چھوٹی شہزادی بولی، " دیکھو، اس کا لباس اس کو ہرگز نہ دینا ورنہ وہ اُڑ جائے گی۔ جب تم اس کو پکڑنا تو اس کے لمبے بال پکڑنا۔ اس کی بہنیں اُڑ جائیں گی۔ وہ اکیلی رہ جائے گی۔ پھر تم اُسے اپنے ساتھ رکھ لینا۔"

چناں چہ حسن روز اسی تاک میں لگا رہا۔ ایک روز وہ آگئیں۔ سب نے اپنے پَروں کو اُتارنا شروع کیا۔ بڑی والی نے اپنے پَروں کو جہاں اُتارا وہ جگہ حسن سے چند فیٹ کے فاصلے پر تھی۔ پھر جب اُن سب نے پانی میں چھلانگ لگائی حسن نے اس لباس کو پُھرتی سے اُٹھا لیا اور اپنی قمیص کے اندر چُھپا لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب واپس آئیں اور اپنے لباس پہننے لگیں۔ سب کو تو اپنا اپنا لباس مل گیا، مگر بڑی والی اپنا لباس تلاش کرتی رہ گئی۔ اتفاق سے وہ حسن کے قریب آگئی حسن نے اس کے بال پکڑ لیے۔ دوسری سب پریاں لباس پہن کر اُڑ گئیں۔ حسن نے جس کو پکڑا اس کی بڑی منت سماجت کی، مگر وہ نہ مانی۔ بہرحال حسن اُسے اپنا لبادہ اُڑھا کر اپنے کمرے میں لے آیا اور چھوٹی شہزادی نے اسے سمجھا بُجھا کر راضی کر لیا۔ پھر باقی بہنیں بھی آگئیں۔ حسن نے ان کو ساری باتیں بتا دیں۔ پہلے تو وہ ناراض ہوئیں، مگر بعد میں راضی ہو گئیں اور حسن کی شادی اس پری زاد سے کر دی۔ چالیس روز تک سب نے خوب جشن منایا۔ پھر حسن اپنی دلھن کو لے کر شہر بصرے کی جانب روانہ ہو گیا۔ ساتوں شہزادیوں نے کہا" کبھی کبھی ہمارے پاس آتے رہنا، کیوں کہ تم اب ہمیشہ ہمارے بھائی رہو گے۔"

قصّہ مختصر حسن اپنے گھر آگیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور حسن کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ حسن نے اپنی دلھن سے ملوایا۔ چند روز بعد حسن کی ماں نے حسن سے کہا کہ بصرہ چھوڑ کر بغداد میں کاروبار کرے۔ لہٰذا حسن اپنی والدہ اور دلھن کو لے کر بغداد چلا گیا اور وہاں ایک بڑی سی دُکان کھول دی اور ایک بڑا سا محل خرید لیا۔ سال بھر کے بعد حسن کے گھر میں ایک چاند سا بیٹا ناصر پیدا ہوا۔ پھر ایک اور سال گزرا تو دوسرا بیٹا منصور پیدا ہوا۔

حسن کی خوشی میں اب کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ چوں کہ تین سال گُزر چکے تھے لہٰذا حسن نے کہا کہ اپنی منھ بولی بہنوں کو دیکھ آؤں۔ اس کی بیوی نے اجازت دے دی۔ پھر حسن اپنی ماں کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ پری زاد کا لباس ایک بکس میں ہے اور بکس آنگن میں دفن ہے۔ بیوی کو لباس کبھی ملنے نہ پائے ورنہ وہ اُڑ جائے گی۔ پھر حسن روانہ ہو گیا۔ حسن کی روانگی کے تیسرے دن اس کی بیوی نے اپنی ساس سے کہا، "اماں، حمام چلیے، میں نے ابھی تک بغداد کا حمام نہیں دیکھا ہے۔" چناں چہ یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

اب ذرا ادھر کی سُنیے۔ حمام میں خلیفہ کی ایک کنیز آتی ہوتی تھی۔ اس نے جو حسن کی بیوی اور بچّوں کو دیکھا تو حیران رہ گئی، کیوں کہ ایسی حسین عورت اور اتنے خوب صورت بچے اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس کنیز نے جا کر شہزادی زبیدہ سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ شہزادی زبیدہ نے پتا لگوا کر حسن کی بیوی، بچّوں اور والدہ کو بلوا لیا۔

شہزادی زبیدہ حسن کی بیوی اور بچّوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس نے اپنے خوب صورت

لباس دِکھا کر پوچھا، "تمھارے ملک میں ان لباسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی لباس ہے ؟"
حَسن کی بیوی نے کہا، "جی ہاں، میرے پاس ایک ایسا لباس ہے جس میں چاند اور سورج کے تمام رنگ ہیں۔"
شہزادی زبیدہ بولی، "تم سچ کہہ رہی ہو ؟ پھر تو تم مجھ کو وہ لباس ضرور دکھاؤ !"
"اس لباس کو میرے شوہر کی والدہ نے چھپا رکھا ہے۔" حَسن کی بیوی بولی۔ بات یہ تھی کہ جب حَسن اپنی ماں کو اس لباس کے بارے میں تاکید کر رہا تھا، تو اس کی بیوی نے وہ گُفت گُو سُن لی تھی۔ "اگر آپ ان سے کہیں کہ وہ لباس مجھے دے دیں تو پھر میں آپ کو دِکھا دوں گی۔"
یہ سُن کر حسن کی ماں بولی، "نہیں نہیں۔ ایسا پَروں کا کوئی لباس نہیں۔" مگر شہزادی زبیدہ سمجھ گئی کہ حَسن کی بیوی سچ کہہ رہی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے غلام مسرور کو روانہ کر دیا۔ غلام نے وہ لباس تلاش کر لیا اور لے آیا۔ چناں چہ حَسن کی بیوی کے ہاتھوں میں اس کا لباس پھر آ گیا۔ حَسن کی ماں بہت پریشان ہو گئی۔ اتنے میں شہزادی زبیدہ نے لباس کی تعریف کرتے ہوئے کہا، "اچھا، ذرا یہ تو دِکھاؤ کہ تم اس لباس کو پہن کر اُڑتی کیسے ہو ؟" ابھی یہ جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ حُسن کی بیوی نے اپنے دونوں بچّوں کو اپنے پَروں سے باندھ لیا اور اُڑتی ہوئی نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔ جاتے جاتے وقت اتنا کہہ گئی کہ اگر میرا شوہر پوچھے تو بتا دینا کہ میں جزیرہ واک واک جا رہی ہوں۔
جب حَسن واپس آیا تو اس کی والدہ نے اسے سارا قِصّہ سُنا دیا۔ وہ بولا، "اس جزیرے کا پتا میری منھ بولی بہنیں ہی بتا سکیں گی۔" لہٰذا وہ ان کے پاس پھر چلا گیا۔ ساتوں بہنوں نے سارا قِصّہ سُنا، مگر پتا نہ بتایا۔ آخر چھوٹی بہن نے پھر حَسن کی سفارش کی، تو مدد کے لیے راضی ہو گئیں۔
ان بہنوں کا ایک چچا تھا، جس کا نام عبد القدّوس تھا۔ لڑکیوں نے اُسے حَسن کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ حَسن نے جادوگر کا سَر جو قلم کیا تھا اس پر یہ چچا بہت خوش ہوا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر کبھی حَسن کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میرا دیا ہوا سفوف آگ میں ڈال دینا۔ میں فوراً آ جاؤں گا۔ چناں چہ ان لڑکیوں نے وہ سفوف آگ میں ڈال دیا۔ فوراً آسمان پر دُھویں کا ایک بگولا اُٹھا اور چچا ایک ہاتھی پر سوار اسی دھویں میں سے آ موجود ہوا۔
چچا نے پوچھا، "کیا بات ہے ؟" لڑکیوں نے کہا، "چچا جان، حَسن کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"حسن تم میرے پیچھے ہاتھی پر بیٹھ جاؤ" چچا نے کہا۔ لہٰذا حسن بیٹھ گیا اور ہاتھی چل پڑا۔ بڑی دُور جا کر ایک نیلا پہاڑ ملا۔ چچا ہاتھی سے اُتر پڑا۔ حسن بھی نیچے اُتر پڑا۔ چچا نے کہا، "تم اسی جگہ ٹھیرو۔ میں اندر جا کر ایک شخص سے بات کر آؤں۔ تم کو جب بُلایا جائے تب آنا۔"

اتنا کہہ کر چچا نے جادو کے کچھ الفاظ کہے۔ ہاتھی غائب ہو گیا۔ پھر چچا نے تین بار چٹان پر دستک دی۔ ایک دیو قامت غلام ننگی تلوار لیے نمودار ہوا۔ اس نے چچا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دروازہ کھول دیا۔ پھر چچا نے حسن سے کہا، "میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور حسن کو لے کر ایک دوسرے دروازے میں داخل ہوا، سامنے ایک ریگستان تھا۔ دروازے کے باہر ایک عربی گھوڑا تیار کھڑا تھا۔

چچا نے حسن سے کہا، "اس پر سوار ہو جاؤ اور تیزی سے چلے جاؤ۔ جب یہ رُک جائے تو پیتل کے دروازے پر دستک دینا۔ ایک شیخ سیاہ لباس پہنے نکلے گا۔ اس کو یہ خط دے دینا، وہ خط لے کر چلا جائے گا۔ اب اگر وہ خود واپس آئے تو آگے بڑھنا اور اگر اس کے جوانوں میں سے کوئی تلوار لیے آئے تو سمجھ لینا کہ تم ناکام ہو گئے ہو۔ لو یہ خط۔ اگر بھاگنے کی ضرورت پڑے تو ہاتھی کو آواز دے دینا۔ اس کا نام ہے فیل۔ وہ تم کو میری بھتیجیوں کے پاس پہنچا دے گا۔ اور تم کو پہلی بیوی سے بہتر بیوی مل جائے گی۔"

اس کے بعد حسن گھوڑے پر روانہ ہو گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر گھوڑا رُک گیا۔ حسن اُتر پڑا۔ سامنے ایک پیتل کا دروازہ تھا۔ حسن نے اس پر دستک دی۔ ایک شیخ سیاہ لباس میں نمودار ہوا۔ حسن نے اُسے خط دے دیا۔ شیخ نے خط لے لیا اور مُسکرا کر کہا، "تم یہاں ٹھیرو۔" کچھ دیر بعد دروازہ دوبارہ کُھلا تو وہی شیخ بالکل سفید لباس پہنے باہر آیا۔ کوئی جوان مار ڈالنے کو نہیں آیا۔ حسن کو بڑی خوشی ہوئی۔ پھر یہ لوگ ایک غار میں پہنچے۔ اس کے بعد ایک باغ میں آ گئے۔ شیخ نے حسن سے سنگِ مرمر کے چبوترے پر بیٹھنے کو کہا۔

اتنے میں چار شیخ اور آ گئے۔ "اب ان کو اپنا قصّہ سُناؤ۔" پہلا شیخ بولا۔

حسن نے اپنا پورا قصّہ سُنا دیا۔ ایک شیخ نے پوچھا، "کیا تم کو اس خبیث جادوگر نے اس پہاڑ کی چوٹی پر بھیجا تھا؟"

"جی ہاں۔" حسن نے کہا۔

پھر چاروں شیخ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور بولے، "اس نوجوان نے بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ لہٰذا اسے اس کی بیوی اور بچے مل جانے چاہییں۔" پھر ایک شیخ نے خط لکھا اور حسن سے کہا، "یہ خط لے جاؤ۔ سواری کا میں بندوبست کیے دیتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے تالی بجائی۔ فوراً ایک جن حاضر ہو گیا۔ شیخ نے اس سے کہا، "اس آدم زاد کو سرزمینِ کافور لے جاؤ تاکہ یہ خط وہاں کے بادشاہ کو دے دے۔" اس کے بعد حسن کو جن نے اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور اڑنے لگا۔ آخر کار یہ لوگ سرزمین کافور پہنچ گئے۔ حسن خط لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ خط پڑھ کر بادشاہ نے کہا، "کل آنا، اب آرام کرو۔" دوسرے دن حسن کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ بولا، "میرے جہاز جزیرہ واک واک جاتے ہیں۔ کل ان کا ایک جہاز آئے گا۔ تم اسی پر سوار ہو جانا۔ میری حفاظت میں ہو گے۔"

چناں چہ دوسرے دن حسن جہاز پر سوار ہو گیا۔ دس روز بعد جہاز لنگر انداز ہوا۔ حسن ساحل پر اتر پڑا۔ وہاں بہت سے صوفے پڑے ہوئے تھے۔ لوگ ان پر بیٹھے تھے۔ حسن ایک صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔ جب شام ہوئی تو بہت سی عورتیں سپاہیوں کی وضع میں آ گئیں۔ حسن انتظار کرتا رہا۔

ایک عورت اس کے قریب آ گئی۔ حسن نے آہستہ سے کہا،
"میری مدد کیجیے۔" عورت نے پوچھا، "تم کون ہو؟" حسن نے کہا، "میرا نام حسن ہے، میری بیوی اور بچّے کھو گئے ہیں۔ ان کو تلاش کر رہا ہوں۔" عورت بولی، "بیٹا حسن، تم خوش نصیب ہو کہ تم نے ایک بوڑھی عورت سے بات کی۔ اگر جوان عورت ہوتی تو تم کو فوراً مار ڈالتی۔ اب تم اسی جگہ چھُپے رہو اور انتظار کرو۔" حسن چھُپ گیا۔ عورتیں آپس میں جنگ کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر وہی بوڑھی آئی اور حسن کو عورتوں کی طرح کا فوجی لباس دیا اور کہا کہ اس کو پہن لو۔ ایک لوہے کا خود بھی دیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ پھر بوڑھی عورت حسن کو ایک خیمے میں لے گئی جو غالباً کمانڈر کا تھا۔ اب حسن نے اس عورت کو اچھی طرح دیکھا۔ وہ بہت بوڑھی اور بدصورت تھی۔ حسن نے اس سے پناہ حاصل کرنا چاہی تو وہ بولی، "تم آخر یہاں آئے کیسے؟ اور اب جو آ گئے ہو تو یہاں کتنی دیر تک زندہ رہ سکو گے؟"
یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی اور اس نے مدد کا وعدہ کر لیا۔ پھر اسی بُڑھیا نے کمانڈر کی حیثیت سے سب عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اگلے دن کے لیے جنگی مشقیں کریں اور چلی جائیں۔ جب وہاں کوئی نہیں رہا تو اس نے کہا، "تمھاری بیوی ساتویں جزیرے میں ہے، جو یہاں سے بہت دُور ہے اور راستے میں بڑے خطرے ہیں۔ ان جزیروں کا نام ان درختوں کی بنا پر پڑا ہے، جن کی شاخوں پر کھوپڑیاں ٹنگی ہوئی ہیں اور یہ کھوپڑیاں مسلسل واک واک چلّاتی رہتی ہیں۔ میری فوج جب واپس آ جائے گی، تب ہم روانہ ہوں گے۔"
صبح کو پوری فوج آ گئی۔ کمانڈر نے اُن سے کہا کہ ہم سب ان خطرناک جزیروں کی طرف روانہ ہوں گے۔ چناں چہ سب روانہ ہو گئے۔ حسن اس کمانڈر عورت کے ساتھ رہا۔ یہ لوگ کبھی خشکی پر چلتے تھے اور کبھی سمندر میں۔ آخر حسن نے جزیرہ واک، واک دیکھ لیا، جہاں درختوں پر کھوپڑیاں ٹنگی ہوئی تھیں۔ اب کمانڈر بولی، "حسن، وہ دیکھو سامنے وہاں تمھاری بیوی ہے۔ اس طلسمی ٹوپی کو پہن لو۔ کوئی تم کو نہ دیکھ سکے گا۔ تم سپاہیوں کے درمیان آرام سے چلے جانا۔"
غرض حسن طلسمی ٹوپی پہنے پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا اور اس کمرے میں پہنچ گیا، جہاں اس کی بیوی سو رہی تھی۔ حسن نے آہستہ سے بیوی کے کان میں کہا، "بیگم، میں آ گیا ہوں۔ تم کو لے جانے کے لیے۔" وہ جب جاگی تو حسن نے ٹوپی اُتار لی۔ تب اس نے حسن کو دیکھا اور دیکھتے ہی

چلّائی، "حسن۔ تم کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ تم کو مار ڈالیں گے۔"
حسن نے کہا، "کچھ بھی ہو، میں تم کو اور بچّوں کو لے کر جاؤں گا۔" اتنے میں دونوں بچے آ گئے۔ حسن اُن سے کھیلنے لگا۔ اتنے میں حسن کی بیوی کی والدہ نے دروازے پر دستک دی اور کہا، "یہ کس آدم زاد کی آواز سُنائی دے رہی ہے۔ دروازہ کھولو تاکہ میں دیکھوں۔" یہ سنتے ہی حسن نے وہ ٹوپی پہن لی اور ملکہ اسے نہ دیکھ سکی، واپس چلی گئی۔ پھر شام کو جب اندھیرا ہو گیا تو حسن نے اپنی بیوی سے کہا، "ایک بچّے کو تم لے لو اور ایک کو میں۔ اب یہاں سے چلنا چاہیے۔" چناں چہ حسن اپنی بیوی اور بچّوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ محافظ سپاہی سب سو رہے تھے۔ باہر ایک بوڑھی عورت ملی۔ اس نے کہا، "آؤ، میں تمھاری مدد کروں۔ اے شاہ جنّات کی بیٹی، میں نے دیکھ لیا ہے کہ تیرا شوہر آدم زاد ہے، حال آنکہ اس نے طلسمی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ یہ لکڑی لے لو اور اسے زمین پر تین بار مارنا۔ فوراً پری زاد آموجود ہوں گے اور تم کو لے جائیں گے۔"
حسن کی بیوی نے اس بُڑھیا کو ہیرے کی ایک انگوٹھی دے دی اور لکڑی کو زمین پر تین بار مارا۔ لکڑی مارنا تھی کہ دو دیو قامت پری زاد نمودار ہو گئے اور بولے، "حکم کیجیے۔"
حسن نے کہا، "یہاں سے بغداد کتنی دُور ہے؟" پری زاد بولا، "اگر ہم آپ کو اپنے کندھے پر بٹھا لیں گے تو پھر فاصلہ زیادہ نہیں رہے گا۔"
"تو پھر فوراً بغداد چلو۔" حسن نے حکم دیا۔
ایک پری زاد نے حسن کی بیوی اور ایک بچّے کو اُٹھا لیا اور ایک نے حسن اور دوسرے بچّے کو اور اُڑ گئے۔ ہوا میں اُڑتے وقت حسن کو عجیب سا لگا، مگر ذرا ہی دیر میں یہ لوگ حسن کے باغ میں پہنچ گئے اور سب کو زمین پر اُتار دیا گیا۔ پری زادوں کو رخصت کر کے حسن نے دروازے پر دستک دی۔ حسن کی ماں نے دروازہ کھولا اور خوش ہو کر حسن کو اور اس کی بیوی بچوں کو گلے لگایا۔ حسن نے قسم کھائی کہ اب بیوی بچّوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اتنے میں اس کی بیوی اپنے کمرے میں چلی گئی اور لباس تبدیل کیا۔ بچّوں کو بھی عمدہ لباس پہنائے۔ پھر بولی، "اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اس مرتبہ کی جُدائی نے مجھے بتا دیا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے، آگ جلاؤ۔" حسن نے آگ جلائی تو اس کی بیوی نے اپنا پَروں والا لباس آگ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد حسن اور اس کی بیوی بچّے سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

polka
ICE CREAM
When your child chooses Polka,
you can be sure it's the best
Polka is an ice-cream with a special touch of quality
— made from wholesome fresh dairy cream with
original flavours specially developed by Polka food experts.
In ice cream making, our concern for health comes first.
We go to the extent of using the finest quality 100%
International food grade packing material
and we manufacture our ice-cream at
hygienic modern air conditioned factories. Our ice-cream
samples are tested regularly at home and abroad.
Originality in flavours with a concern for quality
has been the key to Polka's success as number one
ice-cream in Pakistan from Khyber to Karachi.
polka
ICE CREAM
Tastes Like First Love
PPA-2-84

پیارے بچو، جاگو، جگاؤ، علم حاصل کرو اور علم کی شمع ہاتھ میں لے کر دوسروں تک علم کی روشنی پہنچاؤ۔ علم حاصل کرنا اور دوسروں تک علم کی روشنی پہنچانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ حکیم محمد سعید

ہمدرد انسائکلوپیڈیا

س : ریڈیو فوٹو کیا ہوتا ہے؟ — محمد ایاز کلسی، شاہ پور چاکر

ج : یہ لفظ آپ نے اخباروں کی بعض تصویروں کے نیچے لکھا دیکھا ہوگا۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسی تصویر جو ریڈیائی لہروں کے ذریعہ سے لی گئی۔ ہوتا یہ ہے کہ دُور دراز کسی مقام کے کسی منظر کی تصویر اگر کسی اخبار کو بھیجنی ہے تو کیمرے کے ذریعہ سے وہ تصویر لی جاتی ہے جس میں یہ انتظام ہوتا ہے کہ تصویر ریڈیائی لہروں میں تبدیل ہو جائے اور یہ لہریں آپ کے شہر تک آن کی آن میں آجاتی ہیں جہاں برعکس عمل سے اُنھیں پھر اُسی تصویر میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ ایسی تصویر "ریڈیو فوٹو" کہلاتی ہے۔

س : سورج گرہن اور چاند گرہن کیسے ہوتا ہے؟ — سید آصف مصطفٰی نقوی، کراچی

ج : پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ زمین اور چاند دونوں مختلف فاصلوں پر رہتے ہوئے سورج کے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند ہماری زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے اور "تنکے کی اوٹ" پہاڑ "والی مثل صادق آجاتی ہے۔ چوں کہ چاند ہم سے سورج کے مقابلے میں بہت قریب ہے اس لیے چھوٹے سے چاند کی وجہ سے بڑا سا سورج ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ہم کہتے ہیں سورج گرہن ہو گیا، بالکل اسی طرح جیسے آپ ایک رُپے کا سکہ اپنی آنکھ پر رکھ لیں تو سامنے کی کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ جب چاند ہٹ جاتا ہے تو سورج پھر پہلے کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔

چاند گرہن خود ہماری زمین کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی جب ہماری زمین سورج اور چاند کے

درمیان آجاتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر پڑتا ہے جو سیاہ ہوتا ہے اور ہم کہتے ہیں چاند گرہن ہو گیا۔ اگر پورا چاند زمین کے سائے میں آجاتا ہے تو پورا چاند گرہن ہو جاتا ہے ورنہ تھوڑا۔

س: انسان جب سوتا ہے تو خرّاٹے کیوں آتے ہیں؟ اورنگ زیب علی پاشا، کراچی
ج: سوتے وقت ہم زیادہ گہرے سانس لیتے ہیں۔ اگر گردن ٹیڑھی ہو جائے یا منھ کھلا رہ جائے تو ہوا حلق میں سے گزر کر طرح طرح کی آوازیں پیدا کرتی ہے جنھیں ہم خرّاٹے کہتے ہیں۔

س: مریخ ہماری زمین سے کتنی دُور ہے اور زہرہ ہماری زمین سے کتنے فاصلے پر ہے؟
محمد مجیب اختر، رینالہ خورد
ج: ہم سے مریخ کا کم سے کم فاصلہ ساڑھے تین کروڑ میل رہتا ہے۔ اسی طرح زمین سے زہرہ کا فاصلہ کبھی کم زیادہ ہوتا رہتا ہے جو کم سے کم ڈھائی کروڑ میل اور زیادہ سے زیادہ سولہ کروڑ میل ہوتا ہے۔

س: شہابِ ثاقب کیا ہوتا ہے؟ محمد سلیم بسمل، کراچی
ج: رات کو آسمان سے ایک تارا ٹوٹتا اور زمین کی طرف گرتا نظر آتا ہے، لیکن پہلے ہی جل بھن کر راکھ ہو جاتا ہے۔ یہ ستارہ نہیں بلکہ شہاب ہوتا ہے۔ اس میں بھی وہی چٹانی مادہ ہوتا ہے جو ہماری زمین پر پایا جاتا ہے۔ دراصل ایسے چھوٹے بڑے بے شمار ٹھوس اجسام خلا میں ہر وقت آوارہ گھومتے رہتے ہیں۔ جب ہماری زمین ان کے قریب سے گزرتی ہے تو ان میں سے بعض اجسام کشش کی وجہ سے زمین کی طرف کھنچ آتے ہیں اور اس کی طرف گرنے لگتے ہیں، لیکن اُن میں سے بیش تر ہوا کے ساتھ رگڑ کھا کر جل بھن کر ختم ہو جاتے ہیں اور ہم اُن کی ٹکر سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن بعض جسم اتنے بڑے اور سخت ہوتے ہیں کہ وہ ہماری زمین پر آگرتے ہیں۔ بعض عجائب گھروں میں ایسے شہاب محفوظ ہیں۔ خلا سے آنے والے یہ جسم شہابِ ثاقب کہلاتے ہیں۔

س: سانپ کے ڈس لینے کے بعد فوری علاج کیا کرنا چاہیے؟ عبدالمجید دشتی بلوچ، کراچی

ج : اگر ممکن ہو تو سانپ کو مار کر فوراً یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ خطرناک زہریلا ناگ ہے یا معمولی سانپ۔ معالج کو بُلا بھیجنا چاہیے اور ابتدائی امداد (فرسٹ ایڈ) کے طور پر ایک دستی یا ڈوری ہاتھ یا پیر پر اُس جگہ سے کچھ اوپر کس کر باندھ دینی چاہیے جس جگہ سانپ نے کاٹا ہے۔ کاٹنے کی جگہ پر ہلکا سا شگاف دے کر زہر نکال دینا چاہیے اور مریض کو سونے نہیں دینا چاہیے۔ بعض لوگ منھ سے چُوس کر زہر نکال دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی صورت اُس جگہ سے خون نکل جائے تاکہ اُسی کے ساتھ زہر بھی نکل جائے۔ پھر معالج کے آتے ہی زہر کو بے اثر کر دینے والا ٹیکا لگوانا چاہیے۔

س : اسکائی لیب خلا میں کیسے جاتی ہے اور کیسے کام کرتی ہے۔ آمنہ عظمت، کراچی

ج : خلائی تجربہ گاہ کو راکٹ کے ذریعہ سے خلا میں پہنچایا جاتا ہے اور پھر وہاں سے اُسے زمین کے متوازی ایک مدار پر چھوڑا جاتا ہے۔ اُسے زور سے دھکا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی اپنی قوت اور زمین کی کشش کے درمیان ایک توازن قائم ہو جاتا ہے۔ نہ وہ زمین پر گرتی ہے اور نہ خلا میں غائب ہوتی ہے بلکہ زمین کے چاروں طرف گردش کرنے لگتی ہے۔ اُس میں کوئی خلا باز بھی سوار ہو سکتا ہے یا خود کار سائنسی آلات لگائے جا سکتے ہیں جو خلا میں مختلف تجربات کرتے ہیں اور زمین پر ہمیں اُن کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایسی تجربہ گاہیں سائنس دانوں نے خلائی تجربات کرنے کے لیے بنائی ہیں۔

س : رنگین ٹیلے وژن میں کون کون سے رنگ استعمال ہوتے ہیں؟

لیاقت محمود جنجوعہ، کوٹلی آزاد کشمیر

ج : رنگین ٹیلے وژن میں وہ تمام رنگ نظر آتے ہیں جو نشر ہونے والے منظر میں پیش کیے گئے ہیں مثلاً اسٹوڈیو میں کوئی ڈراما ہو رہا ہے اور اداکاروں نے مختلف رنگوں کے لباس پہن رکھے ہیں تو آپ کو اپنے ٹیلے وژن سیٹ پر وہی رنگ نظر آئیں گے۔

س : کہا جاتا ہے کہ پودے بھی سانس لیتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ طیب رشید، لاہور

س : پودے اس طرح تو سانس لیتے نہیں جس طرح ہم پھیپڑوں والے جان دار لیتے ہیں، لیکن اپنے پتوں اور شاخوں کے ذریعے سے وہ گیس جذب بھی کرتے ہیں اور چھوڑتے بھی ہیں۔ اسی کو سانس لینا کہہ لیجیے۔

س : گنا، آم، سیب اور دوسرے میٹھے پھلوں میں مٹھاس کیسے پیدا ہوتی ہے؟
محمد اقبال شاکر، لودھراں ضلع ملتان
ج : تمام خوردنی چیزوں کا دار و مدار اپنے بیج پر ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہیں۔ ہوا، مٹی، پانی، دھوپ وغیرہ اس عمل میں مدد دیتی ہیں۔ شیریں چیز میٹھی بن جاتی ہے اور کڑوی چیز کا بیج ڈالیں گے تو اُس سے کڑوی چیز پیدا ہوگی۔ پھلوں میں قدرتی طور پر گلوکوز پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ میٹھے لگتے ہیں۔

س : سام میزائل کے بارے میں کچھ بتائیے؟ عبدالوحید، کراچی
ج : یہ سیاسی ہتھیار ہیں۔ مختصر طور پر یہ سمجھیے کہ میزائل ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جسے نشانے پر پھینکا جاتا ہے۔ اسے خود کار راکٹ سمجھ لیجیے جو اپنے خود کار آلات کی مدد سے راستہ تلاش کر لیتا ہے اور دشمن کے ٹھکانوں پر گر کر انھیں تباہ کر دیتا ہے۔

س : شہد کی مکھی کا چھتا کیا چیز ہوتی ہے؟ کیا اس کے ذریعے سے گھر پر شہد بنایا جا سکتا ہے؟
محمد عارف، کراچی
ج : سب جانتے ہیں کہ چھتے سے موم حاصل ہوتا ہے۔ مکھیاں چکنی رطوبت سے اپنا گھر بناتی ہیں اور اس کے خانوں میں شہد جمع کرتی ہیں۔ اگر آپ گھر پر مکھیاں پال لیں اور انھیں رہنے نیز شہد اکٹھا کرنے کی سہولت دیں تو گھر پر چھتا لگ جائے گا۔ اس کے لیے لکڑی کے گھر بنائے جاتے ہیں اور مکھیاں پالی جاتی ہیں۔

امام غزالی

مسعود احمد برکاتی

آج سے کوئی ساڑھے نو سو سال پہلے کی بات ہے کہ ایک طالبِ علم تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس لوٹ رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے آگھیرا۔ تمام مال واسباب پر قبضہ جمایا۔ اور تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، لیکن طالبِ علم کو سب سے زیادہ فکر اپنے نوٹس (NOTES) کی تھی، جو اس نے اُستاد کے لکچروں کو پوری توجہ سے سُن کر لکھے تھے اور جن کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ آخر وہ طالبِ علم ڈاکوؤں کے سردار کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ مجھے کسی اور سامان کی فکر نہیں ہے، صرف میرے نوٹس واپس کر دو، کیوں کہ وہ نوٹس میری زندگی، سفر اور جدوجہد کا حاصل ہیں۔ سردار یہ سُن کر ہنسا اور طالبِ علم سے کہا کہ تم نے خاک سیکھا ہے؟ جب کہ تمھاری حالت یہ ہے کہ کاغذ نہ رہا تو تم کورے رہ گئے۔ یہ کہہ کر اس نے نوٹس واپس کر دیے۔ طالبِ علم پر اس جملے کا بے حد اثر ہوا۔ اس نے وہ نوٹس حفظ کرنا شروع کر دیے۔ تین سال کی محنت کے بعد وہ ان کا حافظ ہو گیا اور ان میں جو علم و معلومات تھیں ان پر مکمل عبور حاصل کر لیا۔

کیا آپ سمجھ گئے کہ یہ طالبِ علم کون تھا؟ یہ طالبِ علم مشہور مسلمان مفکر حجتہ الاسلام ابوحامد محمد غزالی تھے۔ امام غزالی خراسان کے ضلع طوس میں ۴۵۰ ہجری مطابق ۱۰۵۸ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پڑھے لکھے نہ تھے۔ وہ سوت بیچا کرتے تھے۔ امام غزالی کم عمری میں ہی یتیم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جُرجان پہنچ کر امام ابونصر اسماعیلی سے پڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے وطن واپسی پر ڈاکوؤں کا وہ واقعہ پیش آیا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

امام غزالی کے زمانے میں اسلامی ملکوں میں علوم و فنون کے دریا بہ رہے تھے۔ خاص طور پر دو شہر علم و حکمت کے مرکز تھے: ایک نیشاپور اور دوسرے بغداد۔ امام صاحب نے چند نوجوانوں کے ساتھ نیشاپور کا رُخ کیا اور امام الحرمین کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، جو مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس تھے۔ امام غزالی نے یہاں اتنی محنت سے علم حاصل کیا اور دینی علوم کے علاوہ منطق اور فلسفے پر بھی عبور حاصل کیا کہ خود ان کے اُستاد امام الحرمین کہا کرتے تھے کہ میرے شاگردوں میں غزالی دریائے زخار (بھرا ہوا دریا) ہے۔ لیکن جب تک استاد زندہ رہے امام غزالی ان کی صحبت سے الگ نہیں ہوئے،

مگر جب ۴۷۸ ہجری میں ان کا انتقال ہو گیا تو امام صاحب نے نظام الملک کے دربار کا رُخ کیا۔ نظام الملک امام صاحب کا ہم وطن اور ملک شاہ سلجوق کا وزیر تھا۔ وہ خود بھی علم والا اور عالموں کا قدر دان تھا۔ وہ امام صاحب کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور ان کو مدرسۂ نظامیہ بغداد کا صدر مدرس بنا دیا۔ اُس وقت امام صاحب کی عمر ۳۴ سال تھی۔ اتنی کم عمری میں یہ عزّت اور مرتبہ کسی اور عالم کو حاصل نہیں ہوا۔

کچھ عرصے کے بعد امام غزالی کا ذہنی اطمینان ختم ہونا شروع ہوا، اور مختلف خیالات میں سے حق کی تلاش کا جذبہ پیدا ہوا۔ چناں چہ آپ نے ان کا مطالعہ اور ان پر غور شروع کیا اور آخر میں تصوّف پر آ کر رُکے۔ لیکن تصوّف محض علمی چیز نہیں ہے، عملی فن ہے، اس لیے ضروری تھا کہ عمل و عبادت پر زیادہ توجہ صَرف کی جائے۔ چناں چہ وہ اپنے عہدے اور عزّت و مرتبت کو ترک کر کے بغداد سے نکل کھڑے ہوئے اور تمام تعلقات کو چھوڑ دیا۔ دوسرے عالموں اور بعض رئیسوں نے بھی روکنا چاہا لیکن آپ نہ مانے اور شام کی راہ لی۔ دمشق پہنچ کر مجاہدے اور ریاضت میں مشغول ہوئے۔ دو برس بعد دمشق سے بیت المقدس کا رُخ کیا۔ پھر مکہ معظّمہ اور مدینۂ منورہ کا رُخ کیا۔ مکّے میں عرصے تک قیام رہا۔ اسی سفر میں مصر اور اسکندریہ بھی پہنچے۔ غرض دس گیارہ سال تک ان کی بے چین روح نے ان کو سفر میں رکھا۔ یہ دراصل ان کا ذہنی سفر بھی تھا، جس کا مقصد تلاشِ حق تھا۔ وہ شہروں اور ویرانوں میں گھومے اور غور و فکر میں غرق رہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ حکما گم راہی میں مبتلا ہیں۔ ان کی تردید کا ارادہ کیا۔ پہلے ایک کتاب "مقاصد الفلاسفہ" لکھی، پھر "تہافت الفلاسفہ" لکھی۔ پہلی کتاب فلسفیانہ نظریات کی تشریح میں ہے، دوسری کتاب میں ان پر تنقید ہے۔

امام غزالی نے بڑی عمر نہیں پائی، لیکن ۵۴، ۵۵ سال میں انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ بعض لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر اوسط نکالا جائے تو روزانہ ۱۶ صفحات ہوتے ہیں۔ امام صاحب نے جن علوم میں کتابیں تصنیف کیں ان میں فِقہ، کلام، اخلاق اور تصوّف شامل ہیں۔ ان کی سب سے مقبول کتاب "احیاءُ العُلوم" ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے دِل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ اس میں امام صاحب نے وعظ اور حکمت دونوں کو ساتھ ساتھ رکھا ہے اور یہ کتاب عام فہم ہونے کے باوجود فلسفہ و حکمت کے معیار سے گرنے نہیں پائی ہے۔ امام غزالی کی لکھی ہوئی کتابوں کا ایک مدت تک یورپ میں بھی چرچا رہا اور بہت سے مشہور مصنفین نے امام صاحب کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ۵۰۵ ہجری ۱۱۱۱ عیسوی میں اس عظیم مفکر، مُصلح اور مُجدّد نے انتقال فرمایا۔

نائگرا آبشار کی سیر

حکیم محمد سعید

نائگرا آبشار (NIAGARA FALLS) کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی شہر میں کسی بھی شخص سے یہ پوچھیے کہ کینڈا کی خاص چیز کیا ہے تو آپ کو یقیناً یہی جواب ملے گا، "نائگرا آبشار" ـــــ نائگرا فالز! یہ کینڈا کا ایک نہایت جانا پہچانا پتا ہے۔ خود اس آبشار کا بھی یہی دعوا ہے، "میں ایک ایسا مقام ہوں جس کا پتا بے شمار لوگ جانتے ہیں۔" اردو میں عام طور

دوشیزۂ کہر نائگرا آبشار کے قریب

پر اس کو "نیاگرا آبشار" لکھتے ہیں، لیکن "ناگرا آبشار" لکھنا زیادہ صحیح ہے ۔

ستمبر ۱۹۸۲ء میں اپنے علمی سفر و سیاحت کے دوران میں کینیڈا بھی گیا۔ اور یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ ۱۹۸۴ء کے جون میں ایک بار پھر میں کینیڈا پہنچ گیا۔ اس بار میرے ساتھ میری اکلوتی بیٹی سعدیہ بھی تھیں ۔ وہ اکثر سفروں میں میرے ساتھ ہوتی ہیں ۔ اب وہ ہمدرد میں میرے ساتھ رات دن کام بھی کرتی ہیں ۔ تو اس بار پھر ناگرا فالز کی رعنائیوں کی دید کے لیے وہاں پہنچ گیا ۔ مگر اس بار میں رات میں گیا۔

ناگرا فالز کی یہ کہانی ملی جُلی ہے ۔ یعنی ۱۹۸۲ء میں جو دیکھا تھا اُس کے تاثرات اور پھر ۱۹۸۴ء کی باتیں ۔ ۱۹۸۲ء میں، میں نے دنیا کے اس مشہور ترین آبشار کو دیکھنے کا پروگرام اس انداز سے بنایا تھا کہ ایک دن آرام بھی کر لوں اور سیر بھی ۔ چناں چہ ۱۹ ستمبر کو میں ناگرا پہنچ گیا اور جو کچھ دیکھا اس کے بارے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ آبشار قدرت کا ایک انتہائی حسین اور دل کش شاہکار ہے جسے دیکھ کر انسان دَنگ رہ جاتا ہے ۔

آؤ بچّو! سب سے پہلے آپ کو یہ بتاؤں کہ یہ آبشار ہے کیا ۔ ناگرا دراصل ایک بڑا دریا ہے جو کینیڈا میں واقع 'ایری جھیل' (LAKE ERIE) سے نکلتا ہے ۔ یہ جھیل سطح سمندر سے ۵۷۲ فیٹ بلند ہے ۔ دریائے ناگرا یہاں سے نکل کر ۳۰ میل دُور واقع ایک اور جھیل 'اونٹاریو' میں جا گرتا ہے ۔ اونٹاریو جھیل سطح سمندر سے ۲۴۶ فیٹ بلند ہے ۔ گویا اس ۳۰ میل کے سفر کے دوران یہ دریا بڑی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہے ۔ اس کی اس گزرگاہ میں تقریباً ۱۵ میل چل کر ایک جگہ بہت گہرا کٹاؤ آ گیا ہے جس پر سے یہ پانی نیچے گرتا ہے ۔ یہ پورا حصّہ سخت چٹان پر مشتمل ہے ۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ دریا تقریباً چودہ ہزار سال سے یہاں گر رہا ہے ۔ جس جگہ پانی کی یہ زبردست چادر گرتی ہے وہاں ایک زبردست جھیل بن گئی ہے جس میں لاکھوں اور کروڑوں ٹن پانی غوطہ لگا کر اگلے سفر پر چل پڑتا ہے ۔ یہ جھیل ۱۵۰ فیٹ گہری ہے اور یہاں گرنے والے پانی کی طاقت کا اندازہ پانچ لاکھ ایسی قوت (ہارس پاور) لگایا گیا ہے ۔

اس آبشار کا اصل نام 'اونگوئی اہرا' (ONGUIAAHRA) ہے ۔ ۱۶۴۱ء کے ایک نقشے میں بھی یہی نام درج ہے ۔ یہی نام بعد میں اونگیارا (ONGIRA) اور پھر بعد میں ناگرا بن گیا۔

دریائے ناگرا امریکا اور کینیڈا کی سرحد بھی ہے ۔ یہ کینیڈا کے صوبہ اونٹاریو کو امریکا کی ریاست نیویارک سے الگ کرتا ہے ۔ یہ آبشار دونوں ملکوں کے حصّے میں آتا ہے ۔ اس کے تین

حکیم محمد سعید "دوشیزۂ کہر" میں سیاحوں کے ساتھ

حصّوں کے الگ الگ نام ہیں: اس کا ایک حصّہ ہارس شُو فالز (گھوڑے کے نعل جیسا آبشار) کہلاتا ہے، دوسرے کا نام امریکن فالز اور تیسرے کا برائیڈل ویل (دلہن کا گھونگٹ) ہے۔ ہارس شُو فالز کینیڈا کے علاقے میں واقع ہے اور آبشار کے اس حصّے کی چوڑائی دو ہزار دو سو فیٹ اور بلندی ۱۶۷ فیٹ ہے۔

دنیا کے کئی آبشار اس سے زیادہ بلندی سے گرتے ہیں، لیکن اس آبشار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت چوڑا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں پانی بھی بہت بڑی مقدار میں بہتا ہے۔ ان دو باتوں کی وجہ سے اس کی آن بان کا مقابلہ کوئی آبشار نہیں کر سکتا۔ صاف وشفاف پانی کی چادر اور اس سے پھوٹنے والی پھوار پر سورج اور چاند کی کرنیں پڑتی ہیں تو ایک رنگ برنگا جال سا بُن جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت خوب صورت منظر ہوتا ہے۔

اس رنگ برنگے منظر کو ہم نے رات کو طاقت ور کئی رنگوں کی سرچ لائٹوں میں بھی دیکھا۔

ہوا یوں کہ جون کی ۱۵ تاریخ کو ہم ٹورانٹو سے خاصی دیر میں روانہ ہوئے۔ ایک نکاح میں شرکت ضروری تھی۔ نکاح ہمارے میزبان جناب معین صاحب نے انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں پڑھایا۔ زبانوں کا بڑا دل چسپ امتزاج تھا۔ دُلھن پاکستانی تھیں اور دولھا کینیڈین۔ خیر جب ہم رات کے کوئی ساڑھے دس بجے نائگرا پہنچے تو سردی زور پکڑ گئی تھی اور ہوا اس زنّاٹے کی چل رہی تھی کہ آبشار کی بوچھاڑوں نے سارے ماحول کو ایسا کر رکھا تھا کہ جیسے خوب تیز بارش ہو رہی ہو۔ ہمارے عزیز میزبان معین صاحب اور ان کی اہلیہ دونوں پروفیسر ہیں۔ ان کے بچّے بھی بڑی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ ان کی علمی قابلیت مقابلتہً زیادہ ہے۔ ہماری سعدیہ کو گرمی کم مگر سردی زیادہ لگتی ہے۔ وہ تو خیر ہو گئی کہ ہمدرد کی پرانی رفیق خانم ڈسلوا نے اپنے گرم سوئٹر اور کوٹ سعدیہ ہی کو دے دیے تھے ورنہ ان کی تو قلفی جم جاتی۔ ایسا شدید موسم تھا کہ ہر شخص ہی آبشار سے دُور دُور تھا۔ ہمارے ہر ساتھی نے ہمّت ہار دی۔ مگر بھئی میں تو رات کو تیز رنگ برنگی سرچ لائٹوں میں آبشار کا حُسن دیکھنے آیا تھا۔ سب پیچھے رہ گئے اور میں پوری طاقت سے آبشار پر پہنچ ہی گیا۔ ہوا کے تھپیڑے اور آبشار کی زبردست بوچھاڑیں مجھے نہ روک سکیں۔ انسان جس مقصد کے لیے آگے بڑھے اُسے پورے عزم و استقلال کے ساتھ حاصل کرنا ہی مردانگی اور کام یابی ہے۔ آبشار کے حُسن و جمال نے میرا دل موہ لیا۔ میں ماحول سے بے پروا کافی دیر وہاں رہا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ میں اوپر سے نیچے تک تر بہ تر ہو چکا ہوں! میرے سفید سوتی کپڑے سب کے سب بھیگ چکے تھے۔ اچھا تو اب پھر میں نائگرا کی کہانی شروع کر رہا ہوں۔

دریائے نائگرا میں ہر سکنڈ دو لاکھ مربع فیٹ یا ساڑھے چھے ہزار ٹن پانی بہتا ہے۔ آپ یقیناً جانتے ہیں کہ آبشار بجلی پیدا کرنے کا نہایت سستا اور عمدہ ذریعہ ہوتے ہیں۔ پاکستان سمیت دنیا کے بہت سے ملکوں میں پانی کی اس قوت سے لاکھوں کلوواٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ پانی کی اس بجلی کو برقاب کہتے ہیں۔ امریکا اور کینڈا میں بھی نائگرا کے اس تیز رفتار پانی سے لاکھوں کلوواٹ بجلی بنائی جاتی ہے۔ برقاب کے کچھ چھوٹے اسٹیشن تو یہیں ہیں، لیکن بڑے بڑے بجلی گھر امریکا اور کینڈا کے علاقے میں ذرا فاصلے پر واقع ہیں۔ ان بجلی گھروں میں نائگرا کے تیز رفتار پانی کو بڑی بڑی نہروں سے پہنچایا جاتا ہے۔ اس نائگرا کا پچھتّر فی صد پانی بجلی بنانے کے کام آتا ہے۔ آبشار کی خوب صورتی کو برقرار رکھنے کے لیے کینڈا اور امریکا نے ۱۹۵۰ء میں ایک معاہدہ کیا۔

جس کے مطابق یہ طے پایا کہ سیاحوں کی یہاں آمد کے موسم میں دن کے وقت اس میں ایک لاکھ مربع فیٹ فی سیکنڈ پانی بہتا رہے گا اور رات کے وقت پانی کی مقدار گھٹ جائے گی۔

امریکن فالز کی بلندی ۱۸۴ اور بعض لوگوں کے مطابق ۱۹۳ فیٹ ہے۔ نائگرا آبشار کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا پانی بالکل صاف ستھرا ہوتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ جھیل سے نکلتا ہے اس لیے اس میں مٹی شامل نہیں ہوتی۔ اس میں نیلے، نتھرے، چمکیلے پانی کو دیکھ کر آنکھوں میں تراوٹ آجاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اس جگہ سب سے پہلے جو یورپی پہنچا وہ فرانس کا شمُجوشاں پلاں (CHAMPLAIN) تھا۔ یہ ایک اسپینی جہاز کا کپتان تھا اور ۱۶۱۳ء میں فرانس کے بادشاہ کے حکم پر اس علاقے میں آیا تھا۔ آج یہاں لاکھوں سیاح دنیا کے کونے کونے سے آتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں آنے والوں کی تعداد ۲۰ لاکھ سالانہ ہے۔

بیٹی اور باپ آبشار کے نیچے جانے کے لیے تیار ہیں

میں نے بچّوں کو بتایا ہے کہ یہ دریا اپنی سخت چٹانی گزر گاہ پر چودہ ہزار سال سے بہ رہا ہے۔ پانی کے بہاؤ سے چٹانیں بھی کٹ جاتی ہیں۔ یہی حال اس دریا کی گزر گاہ کا بھی ہے۔ جس چٹان پر سے یہ دریا گرتا ہے وہ بھی آہستہ آہستہ کٹ رہی ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق چٹان کے گھِسنے یا کٹنے کی رفتار سو سال میں پانچ سو فیٹ ہے۔ خیال ہے کہ آج سے پانچ ہزار سال بعد اس چٹان کا پانچ میل لمبا حصّہ کٹ جائے گا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد آبشار بھی اپنی بلندی کھو دے گا اور پھر وہ محض ایک نہایت تیز رفتار دریا بن جائے گا۔

اس دریا پر چھے پُل بنے ہوئے ہیں جو دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ ان پُلوں میں رین بو برج (قوس قزح کا پُل) بہت مشہور ہے۔

جب ہم نے گھوم پھر کر اس پورے علاقے کی سیر کر لی تو دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ اس آبشار کا دو لاکھ ٹن پانی فی سیکنڈ گر رہا ہے اس کے قریب کیسے جائیں۔ یہ بڑی ہمّت کی بات ہے۔ پانچ لاکھ ہارس پاور سے گرنے والے پانی کے نیچے جانا۔ ایک دفعہ تو جُھرجُھری آ ہی گئی۔ خانم ڈسلوا نے تو کانوں پر ہاتھ رکھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سعدیہ کے دل میں بھی خوف ہے، مگر بیگم معین اور ان کے بچّے تو بڑے نڈر نکلے۔ مجھ سے بھی شاید زیادہ ہی۔

سائنس نے اور انسانی جدوجہد نے ہر چیز کو آسان بنا دیا ہے۔ اب ذرا دیکھیں کہ ہم اس خطرناک آبشار کے پاس کیسے پہنچے۔ بڑی دل چسپ کہانی ہے۔

ہارس شُو فالز اور امریکن فالز کو قریب سے جا کر دیکھنے کے لیے ناگرا کی گہری جھیل میں "میڈ اوف دی مِسٹ" (کُہر کی دوشیزہ) نامی ایک بڑی کشتی چلتی ہے۔ سیّاح اس پر سوار ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے طاقت ور انجن تیز رفتار پانی سے زور کرتے کشتی کو پانی کی چادر کے قریب لے جاتے ہیں۔ آبشار کا بکھرتا پانی موسلا دھار بارش کی طرح برستا رہتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے سیّاحوں کو ربر اور پلاسٹک کے برساتی کوٹ پہننے پڑتے ہیں جن میں ٹوپیاں بھی لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کوٹوں کو پہن کر کشتی کے عرشے پر سے گرجتے دھاڑتے آبشار کا منظر دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہاں پہنچ کر لکھوکھا ٹن گرتے پانی کی زبردست قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پانی کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

سیّاحوں کے اس عظیم مرکز میں سیّاحوں کی تفریح اور آرام کے لیے پورے علاقے میں خوب

سعدیہ اور حکیم محمد سعید

صورت باغ بغیچے لگائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں کئی آرام دہ ہوٹل بھی ہیں اور ریستوران بھی۔ مختلف مقامات پر منظر دیکھنے کے لیے اونچے اور خوب صورت مینار بنے ہیں۔ جگہ جگہ یادگاریں، قلعے، عالی شان عمارتیں، نہریں، باغِ نباتات، عجائب گھر اور چھوٹے چھوٹے چڑیا گھر بھی بنے ہیں۔ سب سے بلند مینار کا نام اسکائی لون ہے۔ یہ ۵۷۷ فیٹ بلند ہے۔

ہم کب چُوکنے والے تھے! آبشار کی بوچھاڑوں سے اور سردی کی شدید لہروں اور ہواؤں کے جھکڑوں سے فارغ ہو کر رات کے کوئی ۱۲ بجے ہوں گے کہ ہم اس مینار پر جا پہنچے۔ وہاں سے ناگرا اور نواح کا منظر بڑا دل کش لگتا ہے۔

سیاحوں میں ایک خاصی تعداد نئے دولھا دُلھنوں کی بھی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے فرانس کے مشہور بادشاہ نپولین بونا پارٹ کا بھائی ینو اور لینزسے اپنی دُلہن کو شاہی گاڑی میں یہاں لایا تھا۔ اس کے بعد دوسرے جوڑے بھی یہاں آنے لگے اور یوں ایک رسم سی بن گئی۔ اور اب تو ناگرا

پر ایک "ہنی مون" ہوٹل بھی بن گیا ہے ۔ بڑا ہوٹل ہے ۔

آپ جانتے ہیں کہ امریکا اور کینڈا کے شمالی علاقوں میں بڑی سخت سردی پڑتی ہے ۔ اس کی وجہ سے سمندر اور جھیلیں بھی برف بن جاتی ہیں ۔ سمندر اور جھیلوں کی سطح کئی کئی فیٹ تک برف کے فرش میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ جاڑوں میں نائگرا آبشار بھی جم جاتا ہے ۔ برف کی اس شفاف چادر کو دیکھنے کے لیے بھی لوگ دُور دُور سے آتے ہیں ۔ رات کے وقت اس پر رنگ برنگی تیز روشنیاں ڈالی جاتی ہیں ۔ یہ ایک نہایت حسین اور دِل فریب منظر ہوتا ہے ۔ آبشار کو قریب سے دیکھنے کے لیے کشتی کی سیر کے علاوہ اور انتظامات بھی کیے گئے ہیں ۔ ان میں سے چند کی سیر میں نونہال بچّوں کو کراتا ہوں ۔

منظر بینی کی سُرنگیں

یہ سُرنگیں آبشار کے پیچھے کی چٹان میں کھودی گئی ہیں ۔ سیّاح ان میں سے گزر کر اُس چبوترے تک جا پہنچتے ہیں جو پانی کی گرجتی دھمکتی چادر کے پیچھے بنایا گیا ہے ۔ امریکن فالز کے نیچے بنے ہوئے غار میں پہنچنے کے لیے تین سُرنگیں بنائی گئی ہیں ۔

محترمہ بیگم معین کا اصرار تھا کہ اس سُرنگ میں بھی ضرور جانا چاہیے ۔ یہ بھی کم دِل گُردے کا کام نہیں تھا ! انھوں نے ٹکٹ خرید لیے اور ہم اب اس سُرنگ میں داخل ہو گئے ۔ دِل دہلا دینے والا پانی کا شور در و دیوار لرزہ بر اندام ۔ ہمارے دِلوں کا حال بس اللہ ہی جانے ۔ رفتارِ دل ایک لاکھ بار فی سیکنڈ سے کیا کم ہو گی !

دی گریٹ گارج اینڈ نائگرا ڈیول گیلری

GREAT GORGE AND NIAGRA DAREDEVIL GALLERY)

اس گارج یا گھاٹی میں بجلی کے جھُولے یا لفٹ سے پہنچتے ہیں ۔ یہ حصّہ آبشار کے نیچے واقع ہے ۔ یہاں سے ایک راستہ بنایا گیا ہے جو مشہور بھنور وھرل پُول ریپڈز (WHIRL POOL RAPIDS) کو جاتا ہے ۔ یہاں آبشار میں بہ کر آنے والی چیزیں بھی نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں ۔ میں نے یہ دل چسپ منظر بھی دیکھا ۔ ایسے موقعوں پر میرا دل چاہتا ہے کہ ہمدرد نونہال پڑھنے والا ہر بچّہ میرے ساتھ ہو ۔

نائگرا ہیلی ایئر

یہ ہیلی کوپٹر سروس ہے۔ ان میں بیٹھ کر سیّاح آبشار کے اوپر پرواز کرتے ہیں۔

میرین لینڈ اینڈ گیم فارم

یہاں ایک بہت بڑا مچھلی گھر بنا ہوا ہے۔ اس میں کرتب دکھانے والی ڈولفن مچھلیاں، سمندری شیر، وھیل اور شارک مچھلیاں رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک گیم فارم بھی ہے جس میں دنیا بھر کے جانوروں کو بڑے سلیقے سے رکھا گیا ہے۔

ڈولفن وھیل نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تمام سمندروں اور بعض میٹھے پانیوں میں بھی ہوتی ہے۔ یہ بچّوں کو دودھ پلاتی ہے اور بہت ذہین ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کی مدد کے علاوہ مختلف آوازوں میں پیغام بھی دیتی ہے۔

بیگم معین، اُن کے بچے اور سعدیہ ہمدرد

ڈولفن سے مجھے بڑا ہی پیارا ہے۔ میں اپنے دنیا بھر کے سفروں میں جہاں کبھی سُنتا ہوں کہ ڈولفن کہیں ہے تو میں اُسے دیکھنے کے لیے پہنچ ہی جاتا ہوں۔ میں میرین لینڈ اینڈ گیم فارم بھی پہنچ گیا۔ یہ تو ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔ اس بار تو ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی کہ ڈولفن سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ میرے پاس کیمرا تو ہوتا ہی ہے۔ ہاں! میں بہت اچھا فوٹو گرافر بھی تو ہوں! ذرا پیارے بچّے ڈولفن کے کرتب بھی دیکھیں۔

اوپر چھوٹی ڈولفن اور سامنے کے صفحے پر اوپر کی تصویر میں بڑی ڈولفن بڑے اونچے ٹنگے ہوئے غباروں کو تالاب میں سے پوری طاقت سے اُچھل کر پیار کر رہی ہے۔ تربیت یافتہ ڈولفن اپنے "استاد" کا کہنا خوب مانتی ہے۔ اس سے زیادہ دل چسپ منظر یہ ہے کہ بڑی ڈولفن کو انسان پر پیار آیا۔ وہ دیوار کے پاس کھڑے ہوئے حاضرین میں سے ایک کو پیار کر رہی ہے۔ (سامنے کے صفحے پر نیچے کی تصویر) جو جرات کر کے پیار کرانے کو تیار ہو گیا تھا۔

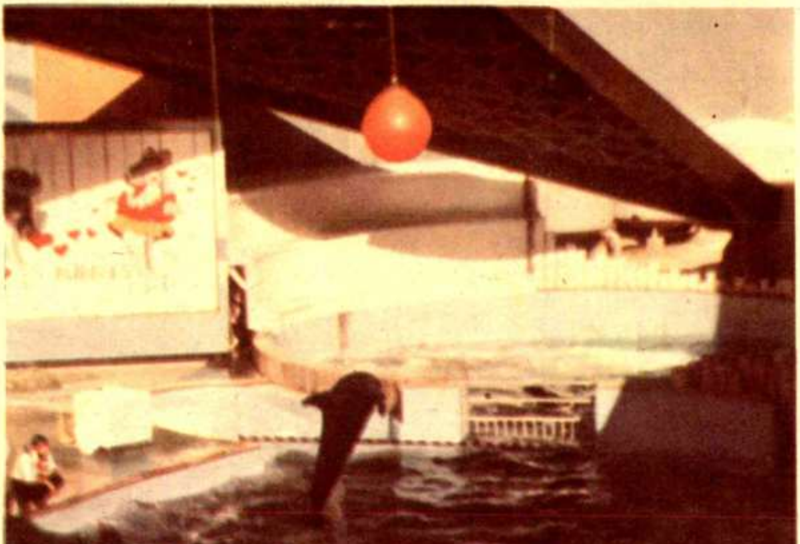

نائگرا فال میوزیم

یہ شمالی امریکا کا سب سے پرانا عجائب گھر ہے۔ اس میں سات لاکھ اشیا نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔ ان میں مصر کی سات ممیّاں (مسالے سے محفوظ کی ہوئی لاشیں) اور خوف ناک چیزوں کا ہال بھی شامل ہے۔

اسپینش ایرو کلب

یہ لوہے کے رستے پر چلنے والی گاڑی ہے جو ۱۸۰ سو فیٹ کی بلندی پر آبشار کے اوپر سے گزرتی ہے۔

پارکس کمیشن کنزر ویٹری

یہاں سال بھر پھولوں کی نمائش لگتی رہتی ہیں۔ ہر موسم میں خصوصی شو بھی ہوتے ہیں۔

اوک ہال

سر ہنری اوک نامی ایک کروڑپتی نے یہ شان دار عمارت تعمیر کرائی ہے۔ اس محل نُما عمارت میں عام لوگوں کو داخلے کی اجازت ہے۔ اس کے اطراف لگے ہوئے خوب صورت باغ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عمارت میں نائگرا آبشار کی قدیم تصویریں رکھی ہوئی ہیں۔

پیناسونک سینٹر

یہ دراصل ایک ہوٹل ہے جس میں ۶۶۵ فیٹ کی گہرائی میں مچھلی گھر اور دوسری چیزیں رکھی گئی ہیں۔ لوگ بلندی سے اِن چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

بلوسم فیسٹیول

موسمِ بہار میں نائگرا کے باغیچوں میں رنگ و خوش بُو کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ اس موقع پر یہاں ایک جشن منایا جاتا ہے جس میں مختلف کھیل، پریڈیں، مختلف قوموں کے ناچ کے علاوہ بہار کی ملکہ کا جلوس بھی نکلتا ہے۔

جناب محترم معین، اُن کے صاحب زادے، بیگم ڈاکٹر شاہین، سعدیہ ہمدرد، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر فواد شاہین۔

ریِن بو ٹاور کیریلن

یہ مختلف سائز کے ۵۵ گھنٹوں کا ایک ساز ہے۔ اس میں سب سے بڑے گھنٹے کا وزن دس ٹن ہے۔ اس کو بجانے سے دل فریب موسیقی کا طوفان اُمڈ آتا ہے۔

میپل لیف ویلج

دراصل یہ ایک مکان ہے جہاں سے سیّاح یادگاری اشیا خریدتے ہیں۔ اس کے تین سو فیٹ بلند کینڈا ٹاور سے اطراف کا منظر دیکھا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں سے بہت سے تحفے خریدے اور پھر ٹاور کے اوپر بھی ہم بالآخر پہنچ ہی گئے۔

ان کے علاوہ یہاں اور بھی بہت سی دل چسپ چیزیں اور مقامات ہیں مثلاً عجائب گھر، مومی

اشیا کی نمائش وغیرہ

ناٹگرا خود قدرت کا ایک حسین شہ پارہ ہے۔ انسان نے اس کے دامن میں بہت سی خوب صورت اور قابلِ دید اشیا ضرور جمع کر دی ہیں، لیکن اس کے اپنے حُسن کی کوئی مثال نہیں۔

بچّو! اب یہ کہانی ختم ہوتی ہے۔ آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ناٹگرا فالز سے رات ایک بجے فارغ ہو کر ہم نے کیا کیا۔ میرے ایک پرانے دوست ہیں ڈاکٹر شاہین۔ ان سے ۱۹۷۵ء میں پہلی بار وینس (اٹلی) میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور ہم کئی دن ساتھ رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہین تُرک ہیں۔ بڑے پیارے انسان ہیں۔ ان کا مکان اور ان کا اپنا ہسپتال ناٹگرا فالز ہی پر ہے۔ وہ اور ان کی بیگم اور ان کی بیٹی کوئی ڈیڑھ بجے شب ہمارے منتظر تھے۔ چائے پانی سب تیار تھا۔ دراصل یہ سحری کا وقت تھا۔ میں تو روزے رکھ رہا تھا اور میں سحری کھاتا نہیں ہوں، مگر اس وقت تازہ سادہ کیک اور سنگترے کا جُوس بڑا مزے دار لگا۔ ہم سب نے ڈاکٹر شاہین کے ہاں یہ شب بلکہ صبح گزاری۔ ان کا گھر بڑا آرام دہ ہے۔ صبح ڈاکٹر شاہین صاحب سے میں نے اطمینان سے باتیں کیں اور پھر ہم اُن سے رخصت ہو گئے۔

رقبے کے لحاظ سے برّاعظموں کے بڑے ملک

برّاعظم ایشیا میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک روس ہے۔ (اس کا یورپی حصّہ بھی اس رقبے میں شامل ہے) اس کے دوسرے نمبر پر چین ہے۔ افریقہ میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک سوڈان ہے اور دوسرے نمبر پر زائرے ہے (جس کا پرانا نام کانگو تھا۔)

شمالی امریکا میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک کینیڈا ہے اور دوسرے نمبر پر یو۔ ایس۔ اے ہے۔

یورپ میں (روس کو چھوڑ کر) رقبے کے لحاظ سے بڑا ملک فرانس ہے اور دوسرے نمبر پر اسپین ہے۔

جب ۲۳ ویں اولمپک کھیل شروع ہوئے

پوری فضا موسیقی سے گونج اُٹھی۔ رنگ برنگے غبارے اور پرچم لہرانے لگے

ساجد علی ساجد

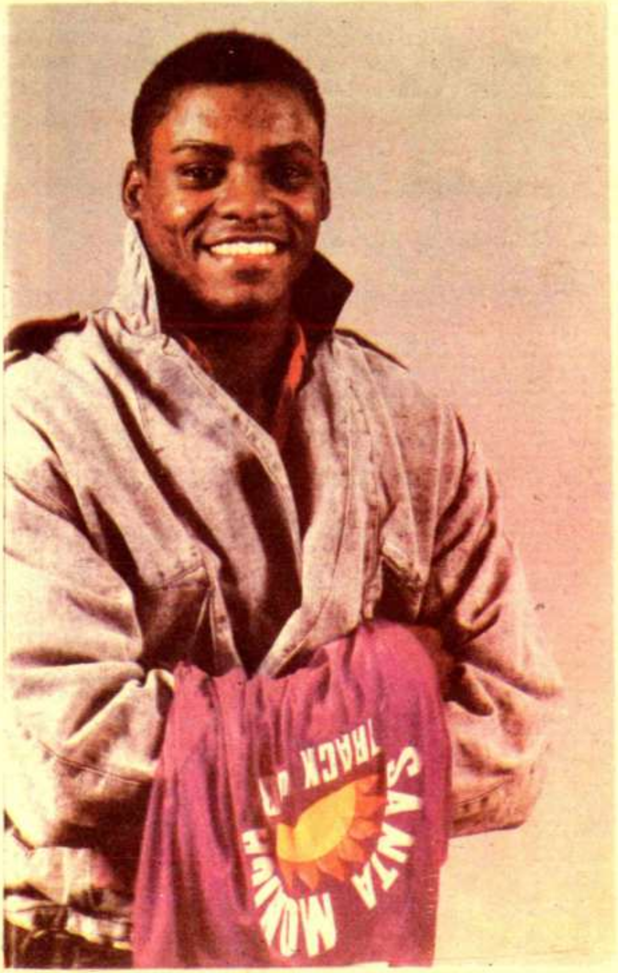

"میں تمام لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے نئے دور کے تیئیسویں اولمپک کھیلوں کے شروع ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔"

۲۸ جولائی ۱۹۸۴ء کی سہ پہر امریکی صدر رونالڈ ریگن نے سولہ انگریزی الفاظ پر مشتمل یہ تاریخی جملے ادا کیے اور اس کے ساتھ ہی اولمپک کی تاریخ کے سب سے بڑے کھیلوں کی ابتدا ہوگئی اور لاس اینجلز پندرہ دن کے لیے پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اس سے پہلے ہالی وُوڈ کے فن کاروں نے تین گھنٹے کا رنگارنگ پروگرام پیش کیا، جس میں امریکا کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار کی زندگی کی جھلکیاں دکھائی گئی تھیں۔ یہ رنگ و رقص کا مسحور کن پروگرام تھا۔

جب صدر ریگن نے افتتاحی کلمات ادا کیے تو ایک لاکھ کے لگ بھگ تماشائیوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا اولمپک اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اُٹھا۔ ہزاروں کی تعداد میں غبارے فضا میں چھوڑے گئے۔ اسٹیڈیم کے اوپر پرواز کرتے ہوئے پانچ ہوائی جہازوں نے اپنے دھویں سے پانچ دائرے بنائے جو اولمپک کا نشان ہیں۔ امریکا کے مشہور ایتھلیٹ جیفری جونسن نے اولمپک کی مشعل روشن کی۔ اس کے بعد ۱۳۹ ملکوں کے تقریباً آٹھ ہزار کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیمیں اپنے اپنے قومی پرچم لیے اسٹیڈیم میں داخل ہوئیں۔ پاکستانی دستے کی قیادت قومی ہاکی ٹیم کے کپتان منظور جونیئر کر رہے تھے۔

سب سے پہلے ایک کھلاڑی خلائی لباس پہنے اولمپک اسٹیڈیم میں داخل ہوا جسے میموریل کولیزیم کا نام دیا گیا ہے۔ اس موقع پر ہزاروں غبارے اور کبوتر فضا میں چھوڑے گئے۔ غباروں پر دنیا کی تقریباً ہر زبان میں خوش آمدید لکھا ہوا تھا اور کئی غباروں پر اردو زبان میں بھی خوش آمدید لکھا ہوا تھا۔ لاس اینجلز کے سیاہ فام میئر جو ۱۹۳۲ء کے لاس اینجلز اولمپک کا ٹکٹ غربت کی وجہ سے نہیں خرید سکے تھے آج (۲۸ جولائی ۸۴ء) کو بہ طور میزبان امریکی صدر ریگن کے برابر بیٹھے تھے۔

امریکی ایتھلیٹ کارل لیوس کی تصویر (پچھلے صفحے پر) جنھوں نے لمبی چھلانگ، ایک سو میٹر کی دوڑ، دو سو میٹر کی دوڑ اور ریلے ریس کے مقابلے جیت کر چار طلائی تمغے حاصل کیے اور لاس اینجلز اولمپکس کے ہیرو بن گئے۔ وہ اولمپک کی تاریخ کے دوسرے کھلاڑی ہیں جنھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس سے پہلے امریکا کے ہی ایتھلیٹ جیسی اوونز نے ۱۹۳۶ء کے برلن اولمپک میں یہ عظیم کام یابی حاصل کی تھی۔ کارل لیوس ان ہی کی نقل کرنا چاہتے تھے اور اپنے اس مقصد میں وہ کام یاب رہے۔

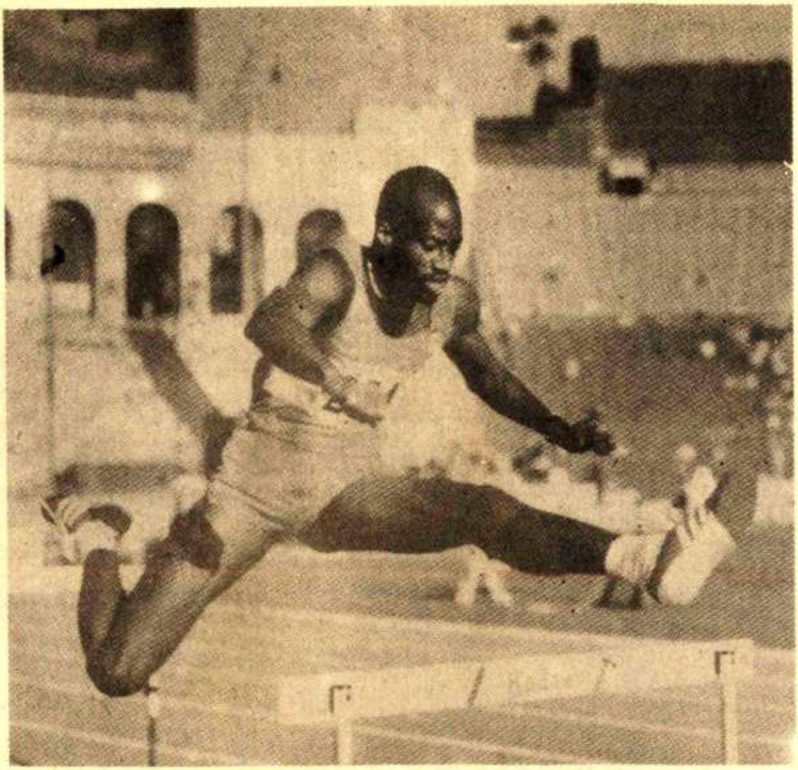

یہ ہیں ایڈورِن موزز۔ بڑی سے بڑی رُکاوٹ بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتی۔ لاس اینجلز اولمپکس میں بھی وہ ۴۰۰ میٹر کی رکاوٹوں کی دوڑ جیت گئے اور طلائی تمغا لے گئے۔ یہ ان کی مسلسل ایک سو پانچویں کامیابی تھی۔

رقص و موسیقی کے پروگرام میں شرکت کرنے والے دس ہزار افراد کی حرکات و سکنات سے جو اسٹیڈیم میں موجود تھے بڑے حیرت انگیز مناظر پیدا ہوئے۔ وہ کبھی امریکا کا نقشہ بناتے تھے اور کبھی اولمپک کا پرچم۔ امریکی دستے میں سب سے بڑی تعداد سیاہ فام کھلاڑیوں کی تھی۔ افتتاحی مارچ پاسٹ میں تباہ حال لبنان کے ۲۴ کھلاڑیوں کے دستے نے بھی شرکت کی۔

اولمپک مشعل لے کر اپنے زمانے کے عظیم ایتھلیٹ جیسی اووِنز جنھوں نے ۱۹۳۶ء کے برلن اولمپک میں چار طلائی تمغے جیتے تھے ان کی پوتی جینا ہیمفل میدان میں داخل ہوئی۔ اس نے یہ مشعل ۱۹۶۰ء

کے روم اولمپک کے ڈیکاتھلون چیمپین جیفری جونسن کے حوالے کی، جنھوں نے اس سے اولمپک کی سب سے بڑی مشعل روشن کی۔

اولمپک مشعل

یہ مشعل اُس وقت تک امریکا کے اندر نو ہزار میل کا لمبا سفر طے کر چکی تھی۔ اس دوران یہ مشعل پورے ۲۸ روز میں امریکا کی ۳۳ ریاستوں میں سے گزری اور اسے ۵۵ لاکھ افراد نے دیکھا۔ تین کروڑ افراد نے ٹیلی وژن پر اس کا سفر دیکھا اور بہت سے علاقوں میں تو یوں لگا جیسے پوری آبادی یہ مشعل دیکھنے اُمڈ آئی ہو۔ اب یہ مشعل اولمپک کولیزیم میں ۱۲۔ اگست تک جلتی رہے گی۔

جب ۲۳ ویں اولمپک کھیلوں کا آغاز ہوا تو وہ واقعی دیکھنے کے قابل منظر تھا۔ اس اجتماع میں ۱۴۰ ملکوں کے سات ہزار آٹھ سو کھلاڑی موجود تھے، جن میں ڈیڑھ ہزار خواتین شامل تھیں۔ وسیع و عریض اسٹیڈیم کے باہر اولمپکس میں شریک ملکوں کے رنگ برنگے پرچم لہرا رہے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اسٹیڈیم میں داخلے کا ٹکٹ دو سو ڈالر کا تھا۔ اس کے باوجود میدان کے کسی حصے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ تماشائیوں میں ہالی وُوڈ کے کئی مشہور اداکار اور دنیا کے سیکڑوں دولت مند اور ممتاز شخصیتیں شامل تھیں۔

اس موقع پر آٹھ سو سازندوں کا مارشل بینڈ میدان میں لایا گیا۔ ۸۴ پیانو گاڑیوں میں لد کے اسٹیڈیم پہنچے، جس کے بعد موسیقی کا پروگرام ساڑھے تین گھنٹے جاری رہا۔

اولمپک کے پرچم کو لاس اینجلز اولمپک کمیٹی اور عالمی اولمپک کمیٹی کے سربراہوں نے باری باری لہرایا۔ دس فیٹ قطر کے غبارے فضا میں چھوڑے گئے جن میں سے کچھ بجلی کے تاروں میں الجھ گئے اور شہر کے کچھ حصوں میں بجلی کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئی۔

سب سے پہلے البانیہ کی ٹیم میدان میں آئی اس کے بعد بنگلہ دیش کی ٹیم تھی، جس میں صرف ایک کھلاڑی شامل تھا۔ پاکستان کے ۳۳ کھلاڑی جب سبز رنگ کا کوٹ اور جناح کیپ پہنے میدان میں داخل ہوئے تو اجتماع میں موجود پاکستانیوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ قومی ہاکی ٹیم کے کپتان منظور جونیئر نے پاکسانی دستے کی قیادت کی۔ ساٹھ رکنی بھارتی دستے کی قیادت ان کی ہاکی ٹیم کے کپتان ظفر اقبال کر رہے تھے۔

یہ ہیں جون بینائٹ پچھلے مئی ۸۴ء میں ان کا گھٹنے کا اپریشن ہوا، مگر دوسرے ہی روز سے انھوں نے ہسپتال میں اپنے بستر کے قریب مشق کے لیے سائکل منگوالی۔ ان کا عزم اور حوصلہ ان کے کام آیا اور وہ لاس اینجلز اولمپکس میں بیس ہزار میٹر لمبی دوڑ جیت گئیں۔ انھیں طلائی تمغے کے ساتھ ساتھ لمبی دوڑ کی ملکہ کا خطاب بھی دیا گیا۔

سب سے بڑا دستہ امریکا کا تھا۔ اس دستے میں ۶۱۵ کھلاڑی شامل تھے۔ یہ دستہ سب سے آخر میں میدان میں آیا۔ امریکی ٹیم میں سیاہ فام کھلاڑیوں کی اکثریت تھی۔

اس موقع پر اسٹیڈیم میں موجود ایک لاکھ کے لگ بھگ تماشائیوں کو ایک دل چسپ راز بتایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اپنی نشستوں کے نیچے رکھے ہوئے رنگین کارڈز نکالیں اور ان سے اپنے چہرے ڈھانپ لیں۔ جب سب نے ایسا کیا تو اسٹیڈیم میں ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے میں آیا۔ چاروں طرف مقابلوں میں حصہ لینے والے ملکوں کے قومی پرچموں کی تصویریں بن گئیں۔

کھانے پینے کا سامان

شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ اولمپک سائٹ میں کھیل کُود اور قیام کرنے کے لیے ساڑھے تین ہزار مزدوروں نے دن رات کام کیا ہے اور اولمپک میدان کے چاروں طرف لوہے کی ۵۲ میل لمبی باڑھ تعمیر کی گئی ہے۔ آپ یہ سُن کر بھی حیران رہ جائیں گے کہ ۱۴۰ ملکوں کے دس ہزار کے قریب کھلاڑی پندرہ دن میں دو لاکھ ستّر ہزار پونڈ گوشت کے علاوہ ستّر ہزار درجن انڈے کھا جائیں گے۔ یہ انڈے اتنے ہیں کہ اگر ایک قطار میں انھیں رکھا جائے تو یہ پچیس میل لمبی قطار بن جائے۔ اس کے علاوہ لاس اینجلز میں اس مقصد سے دس لاکھ کے قریب درخت لگائے گئے ہیں۔ کھلاڑی اس دوران ایک لاکھ کے لگ بھگ بسکٹ اور نان خطائیاں کھائیں گے۔

یہ صرف چند اعداد و شمار ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتنے بڑے کھیل ہو رہے ہیں۔ ایک اور دل چسپ بات سُنیے۔ سونے کے تمغے میں جس کو حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر کے کھلاڑی ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں بانوے (۹۲) فی صد چاندی شامل ہے، لیکن جیسا کہ ایک کھلاڑی نے کہا۔ اہمیت سونے کی نہیں، اعزاز کی ہے۔

تمغے

پہلے دن سے اولمپک کھیلوں میں تمغوں کی تقسیم شروع ہو گئی۔ چین کی ٹیم ۱۹۵۲ء کے بعد پہلی مرتبہ اولمپک میں آئی اور اولمپک میں پہلا طلائی تمغا جیتنے کا اعزاز "فری پستول شوٹنگ" ایک چینی کھلاڑی شو ہی فینگ نے حاصل کیا، جب کہ اس سے پہلے اس کھیل میں چینیوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ پہلی خاتون جنھوں نے پہلا تمغا جیتنا امریکا کی کارپنٹیر فنی تھی جنھوں نے سائیکلنگ میں یہ اعزاز حاصل کیا۔ باسکٹ بال کا طلائی تمغا امریکا کے حصّے میں اور والی بال کا طلائی تمغا جاپان کے حصّے میں آیا۔

اس وقت جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اولمپک کھیل زور شور سے جاری ہیں، لیکن ابھی سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مجموعی طور پر اولمپک کھیلوں پر میزبان ملک امریکا کا غلبہ رہے گا، کیوں کہ ابھی تک سب سے زیادہ تمغے امریکا کے کھلاڑیوں نے جیتے ہیں۔

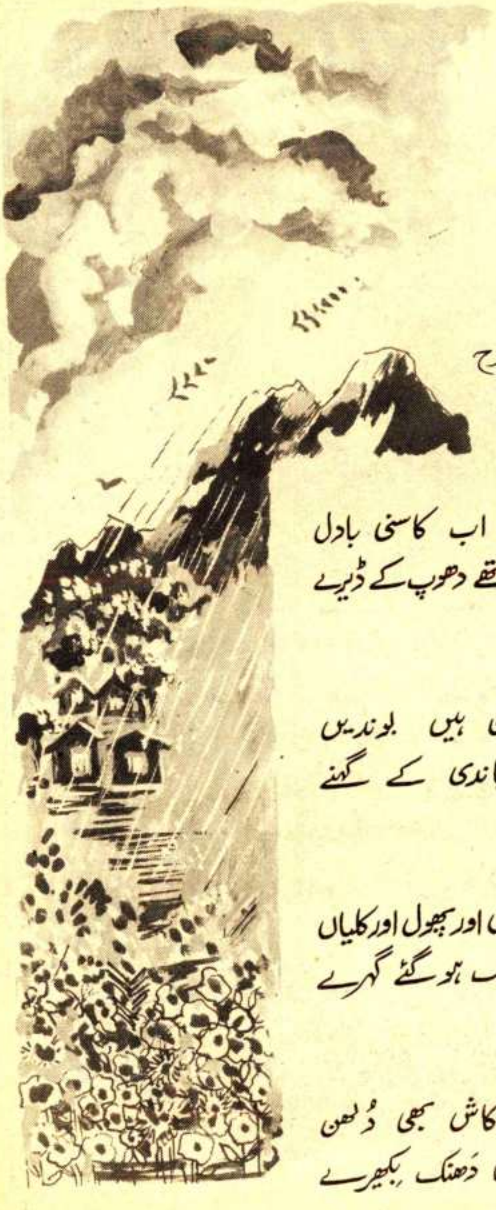

بارش کے رنگ

عینیہ فرح

بادل آئے خوب گھنیرے
نگر نگر کرتے ہیں پھیرے
چھائے ہیں اب کاسنی بادل
پہلے جہاں تھے دھوپ کے ڈیرے
لے کر ایسی گھٹا کا منظر
پنچھی جائیں اپنے بسیرے
رو پہلی پڑتی ہیں بوندیں
پانیوں میں چاندی کے گہنے
پربت دُھل کر اور بھی نکھریں
پیلے، اُودے، سبز، سنہرے
پودے گھاس اور پھول اور کلیاں
سبزے کے رنگ ہو گئے گہرے
ساری رات زمیں پر رم جھم
سورج دُھل کر آئے سویرے
بن جائے آکاش بھی دُلھن
بارش کا دن دھنک بکھیرے

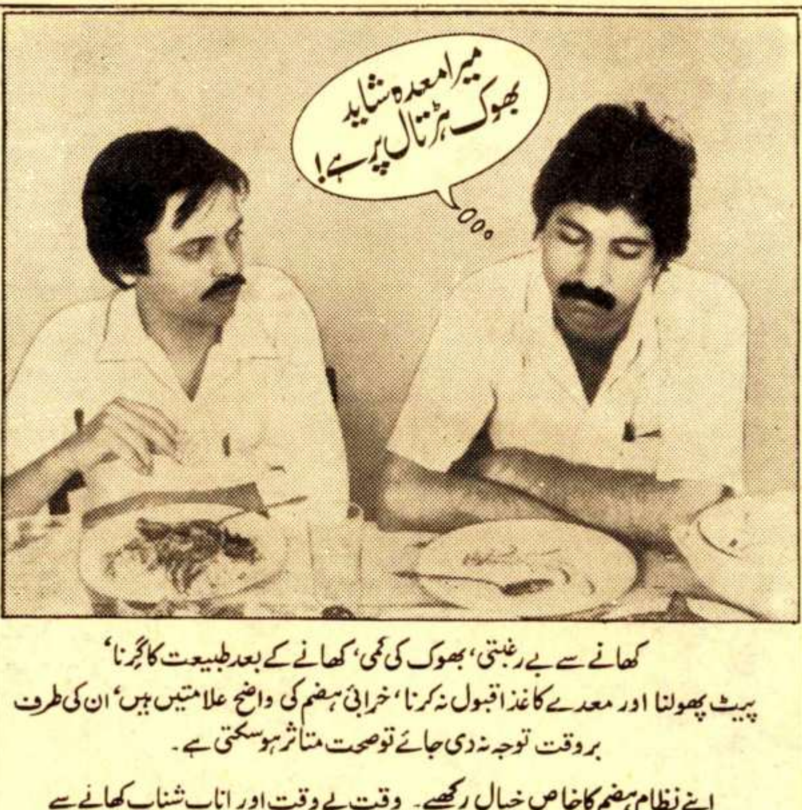

کھانے سے بے رغبتی، بھوک کی کمی، کھانے کے بعد طبیعت کا گرنا،
پیٹ پھولنا اور معدے کا غذا قبول نہ کرنا، خرابیٔ ہضم کی واضح علامتیں ہیں، ان کی طرف
بروقت توجہ نہ دی جائے تو صحت متاثر ہوسکتی ہے۔

اپنے نظامِ ہضم کا خاص خیال رکھیے۔ وقت بے وقت اور اناپ شناپ کھانے سے
پرہیز کیجیے۔ ہمیشہ سادہ، متوازن اور زود ہضم غذا کھایئے۔

بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن اور تیزابیت کی صورت میں کارمینا استعمال کیجیے۔

کارمینا

نظامِ ہضم کو بیدار کرتی ہے معدے اور
آنتوں کے افعال کو منظم و درست کرتی ہے

ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں

کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے

آوازِ اخلاق
تم کسی خائن کے حمایتی نہ بنو۔

Adarts CAR-1/84

گھوڑے کہاں گئے؟

معراج

چوہدری خیر دین اپنے بیٹے کے پاس کویت جا رہا تھا۔ اُسے اپنے دو رشتے داروں کرمو اور فضلو کا خیال آیا۔ یہ دونوں بہت بوڑھے تھے اور شہر سے باہر جھونپڑی میں رہتے تھے۔

چودہری صاحب نے پچکار کر اپنی گایوں، بکریوں اور مرغیوں کو اپنے پاس بُلایا۔ پھر اپنے گھوڑے کو آواز دی، "خوشیا میرے بچے۔" سب جانور چوہدری کے پاس جمع ہو گئے تو انھوں نے یہ سب کرمو اور فضلو کے حوالے کر دیے۔ کرمو اور فضلو اتنے بہت سے جانور دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ جانوروں کو آپس میں تقسیم کرنے لگے۔

یہ گائے تمھاری ہے یہ گائے میری۔

یہ بکری تمھاری ہے، یہ میری۔

یہ مرغی تمھاری ہے، یہ میری۔

اب اس گھوڑے کا کیا کریں؟ ایک گھوڑا دونوں میں کیسے تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

فضلو بولا، "یہ گھوڑا میرا ہے، کیوں کہ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔"

کرمو بولا، "یہ گھوڑا میرا ہے، کیوں کہ میں عمر میں چھوٹا ہوں۔"

خوشیا بے حد سمجھ دار گھوڑا تھا۔ چاہے اسے ہَل میں جوتو یا گاڑی میں، وہ کام کرنے میں ہمیشہ خوشی محسوس کرتا، پھر وہ چھے تک گنتی بھی تو جانتا تھا۔ سچ پوچھو تو یہ گھوڑا خوشیوں کا خزانہ تھا۔ اگر وہ دونوں بڈھے چاہتے تو خوشیا انھیں ہمیشہ خوش رکھتا۔

جب بات چل نکلی تو دونوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ آخر نوبت مار پٹائی تک پہنچی۔

"ٹھک"، فضلو نے ایک گھونسہ مارا۔

"ٹھکا ٹھک"، کرمو نے جواب میں فضلو کو دو مُکّے رسید کیے۔

"ھات نرے کی۔"

"دھت ترے کی۔"

عین اسی وقت ایک پڑوسی کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ انھیں لڑتا جھگڑتا دیکھ کر ٹھیر گیا اور صلح صفائی کرانے لگا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ گھوڑے کو فروخت کر دیا جائے اور اس سے جو رقم حاصل ہو اسے آدھا آدھا آپس میں بانٹ لیں۔ اس طرح جھگڑا بھی ختم ہو جائے گا اور تم دونوں کو اطمینان بھی ہو جائے گا۔

کرمو بولا، "بالکل نہیں، خوشیا میرا ہے، میرا قد چھوٹا ہے اور میں اس پر آسانی سے سواری کر سکتا ہوں۔"

فضلو بولا، "واہ یہ بھی خوب رہی۔ خوشیا میرا ہے۔ میں زیادہ چل پھر نہیں سکتا۔"

جب لڑائی نے طول کھینچا تو ہمسایہ لاحول پڑھتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔

کچھ دیر بعد وہاں سے ایک لڑکے کا گزر ہوا۔ اس نے کہا، "تم لوگ بے کار وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس جھگڑے کا حل یہ ہے کہ تم اسے تحفے میں چڑیا گھر بھنچا دو۔ وہ تمھاری اس عنایت پر بے حد خوش ہوں گے۔"

"ناممکن، سراسر ناممکن۔"

"اجی اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اب جھگڑا دوبارہ ہونے لگا۔ دونوں گھوڑے پر اپنا اپنا حق جتا رہے تھے۔ ایک لڑکا اپنی نانی کے گھر جا رہا تھا۔ اس نے ایک بہت عمدہ تجویز پیش کی۔ اس نے کہا، "فضلو اس گھوڑے کو ہفتہ، اتوار، پیر تین دن اپنے پاس رکھے گا۔ کرمو منگل، بدھ، جمعرات کے دن اسے اپنے پاس رکھے۔ جمعے کے دن دونوں اس پر سوار ہو کر جامع مسجد جایا کریں۔"

"چل بھاگ، بڑا آیا ہمیں سبق پڑھانے والا۔"

"جا جا، اپنا راستہ ناپ۔"

وہ بے چارہ تو کھسیانا ہو کر اپنی راہ ہو لیا۔ اِدھر دونوں بڈھے پھر گھوڑے سے کھینچا تانی کرنے لگے۔ کبھی کرمو گھوڑے کو گھسیٹ کر اپنی طرف لے جاتا، کبھی فضلو اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا۔ بے چارہ گھوڑا بھی پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے؟

کچھ دیر بعد وہاں سے ایک شریر لڑکا گزرا، وہ انھیں لڑتا بھڑتا دیکھ کر بہت ہنسا، پھر بولا،

"ارے لڑتے کیوں ہو؟ میری مانو تو اسے فتّو بڑھئی کے پاس لے جاؤ، وہ اسے آری سے دو برابر حصّوں میں چیر دے گا۔ یا پھر اسے دُھومی قسائی کے پاس لے جاؤ، وہ اس کی تکّا بوٹی کر کے برابر برابر حصّوں میں بانٹ دے گا۔ خوشیا نے جب دھومی قسائی کا نام سُنا تو وہ تھر تھر کانپنے لگا

فضلو بولا، "ٹھیر تو جا نامراد، میں تیری بھی خبر لیتا ہوں، مگر پہلے اس بڑھے سے نپٹ لوں۔"

کرمو بولا، "اگر میں بڈھا ہوں تو تم بھی کون سے جوان جہان ہو؟"

فضلو چلّایا، "میں کہتا ہوں کہ منھ سنبھال کر بات کرو۔"

کرمو چیخا، "تیری ایسی کی تیسی۔"

دونوں میں تُو تکار ہوتی رہی پھر وہ دونوں گُتھّم گُتھّا ہو گئے۔ اب خوشیا نے جو میدان صاف دیکھا تو وہ بگٹٹ بھاگا۔ وہاں سے بہت دُور ایک اصطبل تھا۔ خوشیا اس میں گھس گیا اور اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے لگا۔

یہ اصطبل گھوڑوں کے ڈاکٹر اسپی کا تھا۔ ڈاکٹر نے جب گھوڑے کو اس خراب حال میں دیکھا تو

اسے بہت رحم آیا۔ اُس نے گھوڑے کا سَر سہلایا اور اُسے پیار کیا۔ ڈاکٹر نے کہا،
"تمھیں تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔"
گھوڑے کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو بہنے لگے۔ اس نے ڈاکٹر اپسی کو اشاروں کی زبان میں بتایا،
"دو بڈھے میری جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی انھیں مشورہ دیتا ہے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروادیں، کوئی کہتا ہے کہ دھومی قسائی کے حوالے کر دو۔ آخر میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"
اپسی کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا۔ وہ ہنکارا بھر کر بولے،
"ہوں، تو یہ بات ہے، اب تم کوئی فکر نہ کرو خوشیا۔ تم میرے پاس رہو اور تمھیں کوئی کچھ نہ کہے گا۔" ڈاکٹر اپسی بھنّایا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک لڑنے میں لگے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی داڑھیاں پکڑے ہوئے کھینچا تانی کر رہے تھے۔
ڈاکٹر اپسی یہ دل چسپ منظر دیکھ کر قہقہہ ضبط نہ کر سکا "ھا ھا ھا، بھئی مزہ آگیا۔ بچّوں اور جوانوں کو تو لڑتے دیکھا تھا، لیکن بڈھوں کی لڑائی آج ہی دیکھی ہے۔"
دونوں بڈھے ہانپتے کانپتے الگ الگ ہوگئے اور دُور بیٹھ کر ایک دوسرے کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگے۔
ڈاکٹر اپسی نے پوچھا، "تم جس گھوڑے کے پیچھے لڑائی بھڑائی کر رہے ہو، وہ کہاں ہے؟"
فضلو نے کہا، "کہاں ہے وہ؟"
کرمو بھی بولا، "وہ کہاں ہے؟"
اب ڈاکٹر اپسی کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ غصّے سے بولا "ارے عقل کے اندھو، ہوس اور لالچ نے تمھاری عقلوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ تم تو جوانوں سے بھی گئے گزرے ہو۔"
وہ دونوں خاموشی سے ڈاکٹر کی ڈانٹ پھٹکار سنتے رہے۔ ڈاکٹر اپسی نے پھر کہا، "گھوڑا بہت ڈرا ہوا ہے اور اسے تیز بخار ہے۔ کان کھول کر سُن لو، اگر کسی نے اس پر اپنا حق جتایا تو میں اچھی طرح اس سے نپٹ لوں گا۔"
وہ دونوں بہت شرمندہ ہوئے۔ وہ ڈاکٹر اپسی کے اصطبل میں پہنچے۔ گھوڑا انھیں دیکھ کر بدکنے لگا۔ اپسی نے کہا "کوئی فکر نہ کرو خوشیا، یہ صرف تمھاری مزاج پرُسی کے لیے آئے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی تمھیں لے جانے کی بات کرے تو بے شک تم اُسے دولتی جھاڑ دینا یا کاٹ کر بوٹی نکال لینا۔ مجھے کوئی

اعتراض نہ ہوگا۔ دونوں خوشیا سے گلے ملے اور انھوں نے اپنے قصور کی معافی مانگی۔

خوشیا، ڈاکٹر اسپی کے گھر میں رہنے لگا۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ نام ور ڈاکٹر بہت تنگی ترشی سے گزارا کر رہا ہے۔ جو لوگ اپنے جانوروں کو علاج معالجے کے لیے لاتے ہیں وہ عام طور پر غریب لوگ ہوتے ہیں، اس لیے ڈاکٹر ان سے فیس وصول نہیں کرتا۔

ایک دن نواب صاحب کے نوکر چاکر اچھے گھوڑوں کی تلاش میں اِدھر بھی آنکلے۔ انھوں نے خوشیا کو بہت پسند کیا۔ خوشیا بھی اپنی خوش قسمتی پر پھولا نہیں سمایا۔ ایک نوکر نے گھوڑے کی گردن سہلاتے ہوئے کہا، "تمھیں نواب کی سنہری گاڑی کو کھینچنا ہوگا۔ اس خدمت کے بدلے میں تمھارا ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔ کھانے کے لیے بہت زیادہ بھوسا اور گھاس، سردیوں میں گاجریں۔ کہو تمھیں یہ ملازمت منظور ہے؟" خوشیا خوشی سے ہنہنانے لگا۔

ڈاکٹر نے اس کے کان میں کہا، "بے وقوف مت بن، جو رُوکھا سُوکھا تمھیں میسر ہے تم اسی پر قناعت کر لو۔"

خوشیا بولا، "ڈاکٹر صاحب، ہر شخص کو اپنی بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ پھر آپ یہ بھی تو دیکھیے کہ میں آپ پر بلا وجہ کا بوجھ بنا ہوا ہوں۔"

ڈاکٹر اسپی نے مجبور ہو کر خوشیا کو نواب کے نوکروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب خوشیا کو پہلی بار نواب کی گاڑی میں جوتا گیا تو وہ فخر سے پھولا نہیں سمار ہا تھا۔ اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ ٹھوس سونے سے بنی ہوئی گاڑی بہت بھاری تھی، پھر نواب صاحب اور ان کی بیگم بہت موٹے موٹے تھے۔ دن بھر ان کا وقت گھومنے پھرنے میں گزرتا۔ نواب صاحب تو دعوت میں شریک ہونے چلے جاتے۔ خوشیا چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رہتا۔ تھوڑے دنوں میں ہی خوشیا کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا۔

خوشیا دل میں سوچتا کہ "میں نے بہت گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ کاش میں نے اس امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی خواہش نہ کی ہوتی۔"

ایک دن نواب صاحب نے کار خرید لی۔ انھوں نے خوشیا کا سَر تھپتھپایا اور بولے، "لو میاں، اب ہمیں تمھاری ضرورت نہیں رہی۔ خدا حافظ۔"

خوشیا نے بہت کہا، "سرکار، میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں کس کے دَر پر جاؤں، خدا کے لیے مجھے

بے سہارا مت چھوڑیے۔" لیکن وہاں اس کی زبان سمجھنے والا کون تھا؟ اگلے دن دربان نے اُس کی باگ ایک تانگے والے کو تھما دی۔ وہ بہت مِنّت سَماجت کرتا رہا کہ مجھ پر رحم کرو، رحم کرو، لیکن کسی نے اس کی بات نہ سمجھی۔

اب خوشیا دن بھر تانگے میں جُتا رہتا۔ وہ بہت نیک طبیعت کا گھوڑا تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتا، اپنے دوستوں سے سلام دُعا ضرور کر لیتا۔

بھورو اور کالُو جو برف خانے کی گاڑی کھینچتے۔

چِٹا اور چتکبرا جو دودھ والے کی گاڑی کھینچتے۔

بُوما جو کوئلے والے کی گاڑی کھینچتا تھا۔

خوشیا کے دن بہت اچھی طرح گزر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا تھا۔ اچانک ایک دن تانگے والے نے رکشا خرید لیا۔ اس دن وہ خوشیا سے گلے مل کر رویا، پھر اس نے اس کی رسی گلاب دھوبی کے ہاتھ میں تھما دی۔ خوشیا اب بھی خوش تھا، لیکن ابھی کچھ دن ہی گزرے

ہوں گے کہ گلاب دھوبی بھی ویگن لے آیا۔ اس نے خوشیا کو ایک نانبائی کو بیچ دیا۔ خوشیا نے یہ تبدیلی بھی ہنسی خوشی گوارا کرلی۔ وہ دِل میں سوچتا کہ جب گاڑی ہی کھینچنا ہے تو گاڑی میں نواب بیٹھے یا نانبائی، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایک دن خوشیا گلی کوچوں سے گزر رہا تھا، اُسے راستے میں کوئی گھوڑا نظر نہیں آیا۔ اس نے دیکھا، پھر غور سے دیکھا۔ لیکن گھوڑے تو بالکل غائب تھے۔ نہ جانے انھیں زمین نِگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ گھوڑوں کے بجائے ہر طرف ٹرک، ویگنیں، رکشے اور موٹریں دندناتی پھر رہی تھیں۔

چیتے کی جگہ سفید کار آگئی تھی۔

کالو کی جگہ کالے سیاہ رنگ کا ٹرک آگیا تھا۔

بھورو کی جگہ بھورے رنگ کی ویگن نے لے لی تھی۔

تانگوں کی جگہ رکشے اور ٹیکسیاں دندناتی پھر رہی تھیں۔

پیں۔ پی پی۔ ایک پک اپ پاس سے گزری۔

پوں پپ پوں ایک ٹیکسی پاس سے گزری۔ کھڑ کھڑ کھڑڑڑڑ ــــ ایک رکشا پاس سے گزر گیا۔

بھو بھوں۔ پو۔ بھوں۔ پاں۔ پاں۔ کسی ٹرک والے نے بھونپو بجادیا۔

یہ خوف ناک آواز سُن کر خوشیا بھڑک گیا اور رسّی تڑوا کر بھاگا۔ بیکری والا چلّاتا ہی رہ گیا، لیکن خوشیا نے ایک نہ سُنی۔ گاڑی پتھروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی، لیکن خوشیا کو نہ رُکنا تھا نہ رُکا۔ وہ سیدھا ڈاکٹر اپسی کے اصطبل میں پہنچا۔

ڈاکٹر اپسی اسے دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ خوشیاں نے اسے اپنی رُوداد سُنائی۔ ڈاکٹر بھی اس کی دُکھ بھری کہانی سُن کر بہت متاثر ہوا۔

خوشیا بولا "ڈاکٹر صاحب، آج مجھے راستے میں کوئی گھوڑا یا گدھا نظر نہیں آیا۔"

ڈاکٹر نے حیران ہو کر پوچھا "یہ گھوڑے کہاں گئے؟"

خوشیا بولا "میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، میرا خیال ہے کہ دھومی قسائی کے اصطبل میں بندھے ہوں گے۔

اتنے میں نانبائی اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آگیا۔ اس کے ساتھ دھومی قسائی بھی تھا۔ نانبائی نے غصّے سے کہا "خوشیا، تم نے میرا بہت نقصان کر دیا ہے اس لیے میں نے تمھیں دھومی کے ہاتھ

فروخت کر دیا ہے۔"

دھومی قسائی نے خوشیا کی رسّی تھام لی اور اسے کھینچنے لگا۔

خوشیا نے پیچھے مُڑ کر ڈاکٹر اپسی کی طرف بہت بے چارگی سے دیکھا۔

ڈاکٹر نے پوچھا، "بھائی دھومی، تم خوشیا کو کیوں لے جا رہے ہو؟"

دھومی ہنسا، "اجی قبلہ، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا؟ گائے بیل تو آپ لوگ کب کے برابر کر چکے، اب ان گدھے گھوڑوں کی باری ہے۔"

ڈاکٹر اپسی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے کہا، "میں سمجھا نہیں۔"

دھومی قسائی پھر ہنسا، "اجی حضرت، قسم کھا کر کہتا ہوں کہ گائے، بھینس، بکری وغیرہ سب جانور لوگ کھا پی چکے ہیں۔ آپ ہی فرمائیے کیا آپ نے کوئی گائے بیل دیکھا؟ کیا کسی بھیڑ بکری کو ممیاتے ہوئے سُنا؟"

ڈاکٹر بھونچکا سا کھڑا تھا۔

دھومی نے کہا، "اگر آپ کو یہ گھوڑا ایسا ہی پیارا ہے تو ڈیڑھ ہزار رُپے پرسوں تک پہنچا دیجیے۔"

دھومی قسائی خوشیا کو کھینچتا ہوا لے گیا۔

بے چارہ ڈاکٹر اپسی حیران و پریشان کھڑا ہوا سوچتا رہ گیا کہ اب کیا کیا جائے؟ ڈیڑھ ہزار رُپے کا بندوبست کہاں سے ہو۔ آخر اس نے ان لوگوں کے ناموں کی فہرست بنائی جنھیں اس کے علاج سے فائدہ ہوا تھا۔

سب سے پہلے وہ سیٹھ باٹلی والا کے پاس پہنچا۔ باٹلی والا بہت اخلاق سے پیش آیا۔ ڈاکٹر اپسی نے خوشیا کی درد بھری کہانی سُنائی اور پھر سیٹھ سے ڈیڑھ ہزار رُپے عطا کرنے کی درخواست کی۔

سیٹھ باٹلی والا بولا، "ڈاکٹر صاحب، میں آج کل خود بہت پریشان ہوں، کارخانے میں کام نہیں ہو رہا ہے۔ مال کی فروخت بند ہے۔ میں ڈیڑھ ہزار تو کیا ڈیڑھ رُپیہ بھی نہیں دے سکتا۔"

ڈاکٹر اپسی سیٹھ کے اس جواب سے بہت مایوس ہوا۔ لوگ اپنی خوشی کی خاطر ہزاروں رُپے خرچ کر سکتے ہیں، لیکن دوسروں کو دینے کے لیے ان کے پاس ایک کوڑی تک نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر اپسی جس کسی سے ملتا وہ ایسا ہی جواب دے کر ڈاکٹر کو ٹرخا دیتا۔ فہرست کا آخری نام ایک مشہور شاعر کا تھا۔ ڈاکٹر اپسی اس کے پاس پہنچا۔ جب اس نے ڈیڑھ ہزار رُپے دینے کی درخواست

کی تو شاعر ہنس دیا۔ اس نے کہا، "اجی حضرت، آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں؛ زر و جواہر ہمارے پاس کہاں؟ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟"

ڈاکٹر اسپی چلنے کے لیے اُٹھا۔ شاعر نے کہا، "حضرت، ایک بہت ہی عمدہ شعر یاد آ گیا ہے۔"

ڈاکٹر اسپی نے کہا، "اس وقت معاف فرمائیے، کسی فرصت کے وقت سُن لوں گا۔" ڈاکٹر بہت مایوس ہو کر واپس لوٹا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ گھر کے باہر دو بوڑھے اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ یہ فضلو اور کرمو تھے۔ ڈاکٹر اسپی بہت تپاک سے ملا اور انھیں گھر میں لے گیا۔

فضلو نے پوچھا، "خوشیا کیسا ہے؟"

ڈاکٹر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا، "وہ غریب تو دو تین دن کا مہمان ہے۔"

کرمو نے گھبرا کر پوچھا، "کیا ہوا خوشیا کو؟ کیا وہ بیمار ہے؟"

ڈاکٹر نے خوشیا پر جو کچھ گزری تھی وہ سب کہانی سنائی۔

دونوں بڈھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کیے۔ کرمو بولا، "ڈاکٹر صاحب، بات دراصل یہ ہے کہ ہم بھی اپنے بھتیجے خیر دین کے پاس جا رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنی کل جائداد آپ کے حوالے کر دیں۔ آپ اُسے جیسے اور جس طرح چاہیں خرچ کریں۔"

ڈاکٹر اسپی نے آدھی زمین تو فروخت کر دی۔ اس سے جو رقم حاصل ہوئی وہ دھونی قسائی کو ادا کر کے اس کے سارے گھوڑے خرید لیے۔ آدھی زمین پر ایک چراگاہ بنائی اور ان معذور اور بڈھے گھوڑوں کو اس میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار

چیز	پہلے نمبر پر	دوسرے نمبر پر	چیز	پہلے نمبر پر	دوسرے نمبر پر
گندم	روس	امریکا	چاول	چین	بھارت
آلو	روس	پولینڈ	مویشی	بھارت	امریکا
بھیڑیں	اوسٹریلیا	روس	خام تیل	امریکا	روس
کوئلہ	امریکا	روس	بجلی	امریکا	روس
گیس (جلانے والی)	امریکا	روس	ایٹمی بجلی	امریکا	برطانیہ

سُوپر
خوشبودار
ٹائیفون
ٹوٹل کنٹرول
یقینی خاتمہ کیلئے
ٹائیفون لمیٹڈ۔ کراچی - لاہور

باتوں کا پٹارا

مناظر صدیقی

کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی بچّی رہتی تھی۔ بہت خوب صورت، بڑی پیاری پیاری سی۔ نام تو اس کا کچھ اور تھا، لیکن سب لوگ پیار سے اُسے گڑیا کہتے تھے۔ وہ تھی بھی بالکل گڑیا کی طرح، لیکن اس میں بس ایک خرابی تھی، یعنی وہ بولتی بہت تھی۔ ہر وقت باتیں کرتی رہتی۔ خاموش رہنا تو جیسے اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی اور تُتلا کر بولتی تو لوگوں کو بڑی اچھی معلوم ہوتی، لیکن جب وہ کچھ بڑی ہوئی اور اسکول جانے لگی تب بھی اس نے بولنا کم نہیں کیا۔ صبح جب اس کی امّی اسے جگاتیں تو وہ اسی وقت سے باتیں کرنا شروع کر دیتی اور رات کو اُس وقت تک باتیں کرتی رہتی جب تک اُسے اس کی امّی ڈانٹ ڈپٹ کر سُلا نہ دیتیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ سونے کے بجائے رات بھر باتیں کرتی رہتی۔

گڑیا اس طرح بولتی جیسے ٹیپ رکارڈ بج رہا ہو۔ مثلاً وہ کہتی:

"میں نے کل ایک بلّی دیکھی تھی، اتنی موٹی دُم تھی اُس کی جیسے ہمارے گھر کی جھاڑو باہر منڈیر پر بیٹھی دُم ہلا رہی تھی۔ اُس کی دم ہلتی تو بہت ساری دھول اُڑنے لگتی۔ مجھے وہ بہت اچھی لگی۔ میں اس کے قریب گئی۔ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، لیکن بلّی بڑی بے وقوف تھی۔ میں تو اُسے پیار کر رہی تھی اور وہ بھاگ گئی۔ پھر میں اپنے اسکول چلی گئی۔ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچی۔ میں ہمیشہ ٹھیک وقت پر اسکول پہنچتی ہوں۔ جب ہی تو سب لوگ اسکول میں مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اچھی بچیّاں ہی ٹھیک وقت پر اسکول آتی ہیں اور دل لگا کر پڑھتی ہیں۔ میں بھی دل لگا کر پڑھتی ہوں۔ جب ہی تو میں ہر سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیتی ہوں۔ استانی نے گھر پر کام کرنے کے لیے دیا تھا۔ سب لوگ استانی جی کو مِس کہتے ہیں۔ میں بھی اب انھیں مِس کہنے لگی ہوں۔ میں اپنا کام کر کے لے گئی تھی۔ مِس کو بہت پسند آیا، کہنے لگیں کہ گڑیا تمھارا خط بہت اچھا ہے۔ پھر انھوں نے مجھے ایک پنسل دی۔ اس سے میں نے ایک بلّی بنائی۔ ویسی ہی بلّی جیسی میں نے منڈیر پر دیکھی

تھی۔ یہ بلّی بھی مِس کو بہت پسند آئی۔ انھوں نے مجھے شاباشی دی۔ وہ کہتی ہیں کہ میری ڈرائنگ بھی بہت اچھی ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ جانوروں کی تصویریں تو میں بہت ہی خوب صورت بناتی ہوں۔ دیکھ لینا میں بڑی ہو کر آرٹسٹ بنوں گی۔ ابّو کہہ رہے تھے آرٹسٹ بہت سارا پیسہ کماتے ہیں اور شہروں میں رہتے ہیں۔ میں بھی شہر میں جا کر رہوں گی اور بہت سارا پیسہ کماؤں گی۔ پھر میرا......"

غرض گڑیا اسی طرح لگاتار بولتی رہتی۔ لوگ تنگ آکر کہتے:

"گڑیا، گڑیا، اب چپ بھی ہو جاؤ۔" لیکن گڑیا بھلا کہاں چُپ ہوتی۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا۔ اس کا نام تھا جلیل۔ وہ گڑیا کو ڈرانے کے لیے کہتا:

"دیکھو گڑیا، اب چپ ہو جاؤ، ورنہ ابھی پولیس کا سپاہی ادھر آئے گا تو میں اُس سے کہوں گا کہ وہ تمھیں پکڑ کر لے جائے اور بند کر دے۔"

گڑیا اس کے جواب میں کہتی:

"بھیّا، آپ بھلا پولیس والے کو کیا جانیں۔ سپاہی تو میرا دوست ہے۔ پرسوں ہی اسکول

جاتے ہوئے وہ مجھے راستے میں ملا تھا۔ میں نے اُسے سلام کیا، اُس نے بھی جواب دیا۔ پھر میں اُس سے باتیں کرنے لگی۔ وہ میرے ساتھ اسکول تک گیا۔ مجھے معلوم ہے وہ تو ابّو سے ملتا ہے۔ شاید ابّو کا دوست ہے۔ آپ کے کہنے سے وہ مجھے کیوں پکڑنے لگا؟ وہ تو ویسے بھی بہت اچھا آدمی ہے۔ مجھے تو......"

جلیل گڑیا کو ڈرانے کے لیے کہتا:

"چپ رہو، زیادہ بولنا قانون کے خلاف ہے۔ تم بولتی بہت زیادہ ہو، اس لیے سپاہی میرے کہنے سے تمھیں پکڑے گا۔ نہیں پکڑے گا تو میں تھانے دار سے کہہ دوں گا، وہ میرا دوست ہے۔"

گڑیا پھر جواب دیتی، "اچھا تو آپ کو قانون معلوم ہے۔ پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ بچیّوں کو ڈرایا نہیں کرتے۔ ابّو اسی دن کہہ رہے تھے کہ چھوٹے بچّوں کو ڈرانا بہت بُری بات ہے اور جو بچّوں کو ڈراتا ہے وہ بہت بُرا آدمی ہوتا ہے۔ پولیس تو بُرے آدمیوں کو پکڑتی ہے۔ مجھے کیوں پکڑے گی! میں تو بہت پیاری سی بچّی ہوں۔ مجھے تو سب ہی لوگ پیار کرتے ہیں......"

گڑیا کی باتوں سے تنگ آکر جلیل خود ہی خاموش ہو جاتا۔ صرف بھائی کے ساتھ ہی نہیں گڑیا تو اپنی امّی کے ساتھ بھی اسی طرح باتیں کرتی تھی۔ کبھی اگر امّی کہتی کہ اُن کے سر میں درد ہے۔ گڑیا تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاؤ۔ تو بھی گڑیا خاموش نہیں ہوتی۔ اُس کی زبان چلتی ہی رہتی، یہاں تک کہ امّی خود ہی تنگ آکر کمرے سے چلی جاتیں۔ اُن کے جانے کے بعد بھی گڑیا چپ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی۔ کبھی اپنی گڑیاں نکال لیتی اور اُن سے باتیں کرنے لگتی۔ باتیں بھی اتنی زور زور سے کرتی کہ کمرے میں سوتا ہوا اُس کا مُنّا سا بھائی بھی جاگ جاتا اور رونے لگتا۔ اس کی آواز سُن کر امّی کو دوبارہ کمرے میں آنا پڑتا۔ وہ گڑیا کو ڈانٹتیں کہ دیکھو، تم نے اپنی باتوں سے مُنّے کو بھی جگا دیا۔ تو گڑیا کہتی:

"میں نے تو مُنّے سے کوئی بات نہیں کی۔ مُنّا تو میری باتیں سُنتا بھی نہیں۔ عجیب مُنّا ہے، بس روتا رہتا ہے۔ بھلا میری طرح پیاری پیاری باتیں کیوں نہیں کرتا۔ اسی لیے تو میں اُس سے باتیں نہیں کرتی۔ میں تو اپنی گڑیوں سے باتیں کر رہی تھی۔ میری گڑیاں کتنی اچھی ہیں۔ میری باتیں سُنتی ہیں......"

امّی گڑیا کی باتیں سُننے کے بجائے منّے کو اُٹھا کر چلی جاتیں اور گڑیا پھر اپنی باتوں میں لگ

جاتی۔ وہ کھانا کھاتے وقت بھی بولتی اور باتیں کرتی رہتی تھی۔ اب تو لوگ اسے باتوں کا پٹارا کہنے لگے تھے۔

جس گاؤں میں گڑیا رہتی تھی اُس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ لوگ اسے پھول پہاڑی کہا کرتے تھے، کیوں کہ اس پہاڑی پر بے شمار پودے اُگے ہوئے تھے، جن میں سال بھر لال، پیلے، نیلے، گلابی، آسمانی غرض رنگ برنگے پھول کھلتے رہتے۔ ہرے ہرے پتّوں کے بیچ میں یہ رنگ برنگے پھول بڑے خوب صورت معلوم ہوتے۔ ان کی مہک سے جی خوش ہو جاتا۔ جو بھی پہاڑی پر جاتا اُس کی تھکن دُور ہو جاتی۔ لوگ تفریح کرنے کے لیے اکثر اس پہاڑی پر جایا کرتے تھے۔

ایک دن گڑیا کے جی میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ امّی کو بتائے بغیر اس پہاڑی کی طرف نکل گئی۔ راستے میں کچھ بچّے گڑیا کو ملے۔ انھوں نے گڑیا کو بتایا کہ آج انھوں نے پھول پہاڑی پر کچھ بونے دیکھے ہیں۔ لال لال اور ہری ہری قمیض پہنے۔ یہ بونے بھی پھولوں کا پودا ہی نظر آرہے ہیں۔ اس لیے آج پہاڑی پر جانا ٹھیک نہیں، لیکن گڑیا کو ان بچّوں کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ یقین بھی کیسے آتا، وہ تو اپنے آپ میں مگن تھی۔ اس نے تو بچّوں کی بات ٹھیک سے سُنی بھی نہیں تھی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے وہ پھول پہاڑی پر پہنچ گئی۔ پہاڑی پر اُسے ایک جگہ چار بونے مل گئے۔ ان بونوں نے گڑیا کو سلام کیا۔ وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے، لیکن بھلا گڑیا اُن کی بات کیا سُنتی! اُس نے تو بونوں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ بونوں کو دیکھتے ہی ہنستے ہوئے کہنے لگی:

"ارے واہ، تم بھی عجیب مسخرے ہو۔ کتنا چھوٹا قد ہے تمھارا اور تم نے یہ کیسے لال پیلے ہرے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کہیں لڑکے بھی ایسے کپڑے پہنتے ہیں۔ ایسے کپڑے تو لڑکیاں پہنتی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے بھی ایسے ہی کپڑے پہن لیے تھے۔ ہمارے اسکول میں سالانہ جلسہ تھا۔ میرے کپڑے دیکھ کر میری مِس بہت خوش ہوئیں۔ میں تو ان کپڑوں میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ویسے بھی میں تو لڑکی ہوں۔ لڑکیاں ہی ایسے رنگین لباس پہنتی ہیں۔ اسی لیے تو میں نے بھی ایسے کپڑے پہنے تھے۔ اسکول بھر میں کسی کا لباس اتنا خوب صورت نہیں تھا۔"

ایک بونے نے کہا، "ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔"

گڑیا نے بونے کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، "کچھ لڑکیوں کا لباس تو خوب صورت تھا، لیکن انھوں نے اُسے ٹھیک طرح نہیں پہنا تھا۔ اس لیے اُن پر اچھا ہی نہیں لگ

رہا تھا۔ مجھ پر تو ہر لباس اچھا لگتا ہے، کیوں کہ میں اسے قاعدے سے پہنتی ہوں۔"

"لیکن ہم کچھ پریشان ہیں۔ آپ ہماری بات تو سُن لیجیے۔" دوسرے بونے نے کہا۔

"ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" تیسرے بونے نے کہا۔

"آپ ہماری مدد کیجیے۔ خدا آپ سے خوش ہو گا۔" چوتھے بونے نے کہا۔

گڑیا کو تو صرف اپنی آواز پسند تھی۔ اُس نے بونوں کی ایک بات بھی نہ سُنی اور کہتی رہی، "کوئی بھی لباس قاعدے سے پہنا جائے تو بدن پر سجتا ہے۔ بدن پر لباس سج جائے تو آدمی اچھا لگنے لگتا ہے۔"

بونوں نے جب یہ دیکھا کہ لڑکی اُن کی بات تو سُنتی ہی نہیں، لگاتار بولے جا رہی ہے تو اُن میں سے ایک بونا گڑیا کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس نے بڑی پُھرتی سے گڑیا کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ دوسرے بونوں میں سے ایک نے اپنا بڑا سا رومال گڑیا کے منھ پر باندھ دیا۔ گڑیا کو بونوں کی اس حرکت پر بڑا غصّہ آیا، لیکن اب وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کا منھ تو رومال سے بندھا ہوا تھا۔ پھر

بھی وہ رومال کے اندر سے ہی غصّے میں کچھ بولنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن وہ صرف "اُغُوں۔ غوں، غُوں، غُب غُب۔" ہی کہہ سکتی تھی۔

بونوں کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اب گڑیا خود کچھ نہیں کہہ سکتی تو اُن میں سے ایک نے کہا:

"دیکھو لڑکی، ہمیں ہمارے بادشاہ نے بونوں کے دیس سے یہاں بھیجا ہے۔ ہمارا شہزادہ بہت بیمار ہے۔ اکیلے پڑے پڑے وہ تھک جاتا ہے۔ ہمارے بادشاہ نے کہا ہے کہ ہم انسانوں کے شہر سے کوئی گراموفون یا کوئی ایسا باجا خرید لائیں جسے ہمارا شہزادہ لیٹے لیٹے سنتا رہے۔ اور اس کا دل بہل جائے۔ تم ہمیں بتاؤ کہ ایسا باجا کہاں سے ملے گا؟"

بے چاری گڑیا اب کیا جواب دیتی۔ اس کا منھ تو بندھا ہوا تھا۔ وہ "اُغ۔ اُغ۔ یُوں۔ یُغ یُغ" کر کے رہ گئی۔ اسی وقت شاید کسی دوسرے بونے نے گڑیا کی یہ "اُغ یُغ" سُن لی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا پہلے چار بونوں اور گڑیا کے پاس پہنچا تاکہ یہ دیکھے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے جو یہ تمام ماجرا دیکھا تو کہنے لگا:

"ارے یہ تو تم نے ایک لڑکی کو پکڑ رکھا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ تو "باتوں کا پٹارا" ہے۔"

"باتوں کا پٹارا! کیا یہ ہمیشہ اسی طرح بولتی رہے گی؟" چاروں بونوں نے حیرت سے پوچھا۔

پانچویں بونے نے کہا، "ہاں یہ مستقل بولتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ اسی کو بادشاہ کے پاس لے چلو۔ کسی بھی دوسرے باجے کے مقابلے میں یہ زیادہ اچھا باجا ثابت ہو گی۔ اس میں نہ تو چابی بھرنے کی ضرورت ہے نہ اس کی مرمّت کرانی پڑے گی۔"

"یہ تو بڑا اچھا خیال ہے۔" چاروں بونوں نے کہا۔ انھوں نے گڑیا کے منھ سے رومال کھول کر اسی رومال سے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے اور گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ منھ کھولتے ہی گڑیا پھر بولنے لگی:

"بے وقوف شریر بونو! تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھے گھسیٹ کر کہاں لے جا رہے ہو، مجھے چھوڑ دو نہیں تو میں امّی سے تمھاری شکایت کر دوں گی۔ پھر امّی میرے بھائی سے کہیں گی وہ پولیس کے سپاہیوں کو بُلا لائے گا۔ پولیس تم سب کو گرفتار کرے گی۔ تم نے سمجھا کیا ہے؟ سپاہی اور تھانے دار میرے بھائی کے دوست ہیں۔ کسی کو بے قصور، بے خطا پریشان کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ ارے مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ

تم سب پچھتاؤ گے۔ ابھی تم نے میری امّی کا غصّہ نہیں دیکھا ہے۔ میں تو دیکھ چکی ہوں خالہ انّو کی بیٹی نے گھر میں پانی گرا دیا تھا۔ میری امّی نے اس کی پٹائی کر دی تھی۔ وہ تمھاری بھی پٹائی کر دیں گی ......"

گڑیا بولتی رہی، لیکن بونوں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ راستے میں پانچویں بونے نے کہا کہ اپنے شہر میں چل کر بادشاہ کے بڑھئی سے ایک لمبا سا صندوق بنوا لینا۔ اس میں اس لڑکی کو بند کر دینا۔ یہ اندر سے بولتی رہے گی۔ ہمارا شہزادہ اس کی باتیں سنتا رہے گا۔ صندوق کا ڈھکن کھولتے ہی اس کی آواز آنے لگے گی اور ڈھکنا بند کرتے ہی اس کی آواز سُنائی دینی بند ہو جائے گی۔ تمام بونوں کو یہ ترکیب بہت پسند آئی۔ پھر جب وہ اپنے شہر میں پہنچے تو انھوں نے بادشاہ کے بڑھئی سے ایک صندوق بنوایا۔ بونوں کے شہر میں ہر بونے نے اس لڑکی کو دیکھا اور بہت خوش ہوئے کہ اب اُن کے شہزادے کا دِل بہل جائے گا۔ اتنی دیر گڑیا بھی لگاتار بولتی رہی۔

صندوق تیار ہو گیا تو کئی بونوں نے مل کر گڑیا کو اس صندوق میں بند کر دیا۔ اس وقت بھی گڑیا بڑے غصّے میں کہہ رہی تھی:

"تم لوگ مجھ جیسی پیاری پیاری لڑکی پر اتنا ظلم کر رہے ہو۔ میرا کوئی قصور بھی نہیں۔ میں نے تو تمھیں پریشان بھی نہیں کیا۔ پھر بھی تم لوگ مجھے ستا رہے ہو۔ دیکھنا موقع ملتے ہی میں بھاگ جاؤں گی اور اپنے ابّو سے تمھاری شکایت کروں گی۔ پھر وہ پولیس لا کر تم سب کو گرفتار کرا دیں گے۔ دیکھنا تو تمھیں کیسی سزا ملے گی۔ خوب مار پڑے گی۔ تم روؤ گے، چلّاؤ گے، لیکن میں سپاہی سے کہوں گی کہ انھیں اور مارو۔ انھوں نے مجھے بہت پریشان کیا تھا۔ تمھیں نہیں معلوم، سپاہی مجھے بھی جانتا ہے۔"

گڑیا نہ جانے اور کیا کیا کہتی۔ بونوں نے صندوق کا ڈھکنا بند کر دیا۔ اب گڑیا کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بونے صندوق لے کر بادشاہ کے پاس پہنچے اور بادشاہ کو بتایا کہ وہ باتوں کا پٹارا لے آئے ہیں، جو دوسرے تمام باجوں سے اچھا ہے۔ صندوق کا ڈھکن کھولتے ہی اس میں سے آواز آنے لگے گی اور ڈھکنا بند کرتے ہی آواز بند ہو جائے گی۔ بادشاہ نے یہ صندوق شہزادے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ بیمار شہزادہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ صندوق اس کے بستر

کے قریب ہی رکھ دیا گیا۔ پھر انھوں نے جیسے ہی ڈھکنا کھولا اس میں سے گڑیا کی آواز آنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"تم لوگ اگر یہ سمجھتے ہو کہ میں اسی صندوق میں رُکی رہوں گی تو تم غلط سوچ رہے ہو۔ میری امی اور ابو مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ وہ جلد ہی پولیس کو لے کر آجائیں گے۔ تم سب کو گرفتار کرا دیں گے۔ میرا بھائی جلیل تھانے دار کا بھی دوست ہے۔ تم لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ تم بچ جاؤ گے! ارے تمھیں سخت سزا ملے گی۔ کسی کو بے خطا، بے قصور پریشان کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ اللہ کو ظلم پسند نہیں۔ دیکھنا تم سب لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ میں تو اتنی پیاری سی لڑکی ہوں کہ مجھے سب لوگ پیار کرتے ہیں اور تم نے مجھے صندوق میں بند کر رکھا ہے۔ مجھے نکالو یہاں سے ......"

گڑیا صندوق میں لگاتار بول رہی تھی اور بونے یہ آوازیں سُن کر خوش ہو رہے تھے۔ بونوں کا شہزادہ بھی خوش تھا اور بونوں کی ملکہ بھی۔ وہ رات ہونے تک گڑیا کی باتیں سُنتا رہا۔ گڑیا کو اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔ وہ کہتی کہ ارے مجھے کھانا تو کھلاؤ۔ کبھی پانی مانگتی، لیکن بونے تو اُسے باجا سمجھ رہے تھے، انھوں نے اُسے نہ کچھ کھلایا نہ پلایا، بلکہ وہ تو خوش ہو رہے تھے

کہ عجیب باجا ہے جو کھانا پانی بھی مانگتا ہے۔

رات ہوئی تو ملکہ نے صندوق کا ڈھکنا بند کر دیا تا کہ شہزادہ سو جائے۔ ڈھکنا بند ہوتے ہی گڑیا کی آواز بھی آنی بند ہو گئی۔ پھر صبح ہوئی تو شہزادے نے ایک بونے کو آواز دے کر صندوق کا ڈھکنا پھر کھلوا دیا۔ پورے دن اور پوری رات بھوکی پیاسی رہنے سے اب گڑیا کی آواز کم زور پڑ گئی تھی۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے زیادہ بولنے کی وجہ سے اُس پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کبھی اتنا زیادہ نہ بولے گی۔ جیسے ہی صندوق کا ڈھکنا کھلا تو گڑیا کہنے لگی:

"خدا کے لیے مجھے باہر نکالو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب کبھی اتنا زیادہ نہیں بولوں گی۔ دوسروں کی باتیں بھی سنوں گی۔ بس مجھے باہر نکالو اور اپنے گھر جانے دو۔"

گڑیا کی آواز تو کم زور ہو ہی گئی تھی۔ پیاس سے اس کا حلق سوکھ گیا تھا، چناں چہ اتنا جملہ کہتے ہی اُسے کھانسی آنے لگی۔ اِدھر شہزادے نے جب یہ سُنا کہ اندر جو کوئی بھی ہے وہ باہر نکلتے ہی بولنا بند کر دے گی تو وہ کہنے لگا، "اب تو میں تمھیں ہرگز باہر نہیں نکالوں گا۔ میں اتنا اچھا باجا خراب نہیں کر سکتا۔"

گڑیا نے شہزادے کا یہ جملہ سُنا تو اُسے اتنا صدمہ ہوا کہ اُس کی آواز ہی بند ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اسی صندوق میں بند رہ کر وہ اب بھوکی پیاسی مر جائے گی۔ وہ رونے لگی، لیکن روتے ہوئے بھی اس کی آواز نہیں نکلی۔ اب وہ اتنی کم زور ہو چکی تھی کہ یوں بھی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ شہزادے نے تھوڑی دیر تو انتظار کیا کہ شاید اب باجا دوبارہ بولنا شروع کر دے، لیکن جب کوئی آواز نہیں آئی تو اُس نے اپنی نوکرانیوں سے کہا کہ یہ باجا باہر پھینک آئیں۔ یہ خراب ہو گیا ہے۔

دو خادمائیں اس صندوق کو اُٹھا کر لے چلیں، لیکن تھیں تو وہ بھی بونی۔ شہزادے کے کمرے سے تو انھوں نے کسی نہ کسی طرح صندوق باہر نکال ہی لیا، لیکن وہ جیسے ہی برآمدے میں پہنچیں صندوق نہ سنبھال سکیں اور گر پڑیں۔ ان کے گرتے ہی صندوق بھی گر پڑا۔ اس کا ڈھکنا کُھل گیا۔ جس سے گڑیا کو موقع مل گیا کہ وہ صندوق سے باہر نکل آئے۔ اس طرح گرنے سے اُس کے چوٹ تو لگی تھی اور چوبیس گھنٹے بھوکی پیاسی رہنے سے وہ کم زور بھی ہو گئی تھی۔ پھر بھی یہ اُس کے لیے بہترین موقع تھا۔ وہ صندوق سے باہر نکلی اور ہمت کر کے بھاگتی ہوئی محل سے باہر نکل گئی۔ پھر تو وہ جتنا تیز

دوڑ سکتی تھی دوڑتی رہی، یہاں تک کہ بونوں کے شہر سے نکل کر وہ پھول پہاڑی پر اُسی جگہ پہنچ گئی، جہاں سے بونوں نے اُسے پکڑا تھا۔ گڑیا نے یہاں بھی آرام نہیں کیا اور اُسی طرح بھاگتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔

ہانپتی کانپتی گڑیا گھر میں داخل ہوئی تو امّی نے لپک کر اُسے اُٹھا لیا اور پوچھنے لگیں کہ وہ رات بھر کہاں رہی؟ ابّو اور جلیل بھیّا اُسے رات بھر تلاش کرتے رہے۔ گڑیا نے سارا واقعہ امّی کو سُنایا اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ کبھی اتنا زیادہ نہیں بولے گی۔

گڑیا تو پہلے بھی بہت خوب صورت پیاری سی بچّی تھی۔ اب وہ زیادہ باتیں نہیں کرتی، دوسروں کی باتیں بھی سنتی ہے۔ سب لوگ اُسے پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگے ہیں۔

مضمون کب بھیجیں

وہ نونہال جو کسی موقع، تہوار یا شخصیت پر مضامین لکھتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اپنے ایسے مضمون کو تین چار ماہ پہلے روانہ کیا کریں۔ نونہال ہمیں عین موقع پر یا اُسی ماہ مضمون بھیجتے ہیں۔ مثلاً ۱۱ ستمبر یا ۶ ستمبر پر مضمون ہمیں اگست کے آخر یا ستمبر میں بھیجتے ہیں اور اس وقت تک ستمبر کا رسالہ پریس میں چھپنے کے لیے جا چکا ہوتا ہے۔ اگر ہم رسالہ پہلے نہ بنائیں تو پھر آپ اُسے کس طرح اسی ماہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح یومِ آزادی، رمضان، عید، بقرعید وغیرہ جیسے تہوار اور اہم دِنوں پر مضمون ہمیں تین چار مہینے پہلے بھیجیں۔

سب سے پہلے تو انتخاب کے بعد مضمون کی تحقیق، اصلاح اور درستی کی جاتی ہے۔ مضمون کی اصلاح کے بعد مضمون کتابت کو جاتا ہے۔ جب مضمون کتابت ہو کر آتا ہے تو اس کی تصیح کی جاتی ہے اور رسالہ مکمل کر کے پریس بھیجا جاتا ہے، پریس بھی وقت لیتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ بھیجی ہوئی ہر تحریر کاغذ کے صرف ایک طرف لکھیں۔ اس پر اپنا نام، پتا صاف اور مکمل لکھیں۔ اس طرح آپ کو شکایت اور ہمیں تکلیف نہ ہو گی۔ شکریہ

شرلاک ہومز کا اُستاد

افسانوی جاسوسوں میں شرلاک ہومز کا نام سرِ فہرست ہے اور آج بھی وہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ممکن ہے آپ نے اس کی تصویر دیکھی ہو۔ لمبا تڑنگا آدمی۔ چھے فیٹ دو انچ قد، سر پر شکاری ٹوپی رکھے، بے آستین کی قبا زیب تن کیے۔ منھ میں پائپ لگائے اور ہاتھ میں شیشہ لیے جس سے ہر چیز بڑی نظر آتی ہے۔ ہمارے ٹیلے وژن پر بھی ایک سلسلہ دکھایا جا چکا ہے: شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن۔"

بہر حال جس بات سے شرلاک ہومز کو شہرت ملی وہ اس کا حُلیہ یا لباس نہیں۔ اس کی حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ کی بہ دولت اس کو یہ مقام حاصل ہوا۔ شرلاک ہُومز کی ایک مقبول کہانی "دی نارووُڈ بلڈر" میں ایک نوجوان ہُومز کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ہانپتے ہوئے کہتا ہے، "میں ہوں جان مَیک فَرلین۔"

شرلاک ہومز نے بے پروائی سے جواب دیا، "آپ نے اپنا نام اس طرح بتایا کہ جیسے میں آپ کو پہچان جاؤں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ محض چند ظاہری باتوں کے سوا مثلاً یہ کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں، وکیل ہیں، فری میسن ہیں اور آپ کو دمے کا مرض ہے۔ مجھے آپ کے بارے میں قطعی کوئی علم نہیں۔"

شرلاک ہومز نے صرف اپنی آنکھوں سے کام لیا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ آنے والے کے لباس میں کچھ سلائی کی ضرورت ہے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ وہ شخص شادی شدہ نہیں ہے۔ اس آدمی کی جیب میں ایک قانونی دستاویز تھی، اس سے ہومز نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص وکالت کرتا ہوگا۔ اسی طرح اس کی گھڑی کی زنجیر میں ایک تعویذ بھی تھا اور اس قسم کا تعویذ صرف فری میسن استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ آدمی ہانپ رہا تھا جس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو

دے کا مرض ہے۔

یہ پڑھ کر کہ ہومز ایک اجنبی کے بارے میں اتنی باتیں کس طرح بتا سکتا ہے، شاید آپ یہ خیال کر رہے ہوں کہ کیا ایسی بات واقعی ممکن ہے۔ شاید آپ کہتے ہوں کہ کتابوں میں تو ایسے قصّے ہو سکتے ہیں، لیکن اصل زندگی میں اس طرح کا کوئی آدمی نہیں ہو سکتا۔ تو سُنیے کہ ایک ایسا آدمی واقعی اصل زندگی میں بھی تھا۔

یہ ایڈنبرا کے ایک مشہور سرجن تھے ان کا نام تھا ڈاکٹر جوزف بل JOSEPHBELL ڈاکٹر موصوف پچاس برس تک ایڈنبرا یونی ورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم کو اچھا ڈاکٹر بننا ہے تو پہلے اپنی آنکھوں کو صحیح طور پر استعمال کرنا سیکھو۔ اُن کا کہنا تھا کہ "زیادہ تر لوگ دیکھتے تو ہیں، لیکن غور نہیں کرتے۔ کسی آدمی کو دیکھو تو اس کے چہرے سے تم کو بہت سی باتیں ایسی مل جائیں گی جن سے تم کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں کام کرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ باقی باتیں اس کے لباس سے ظاہر ہو جائیں گی، یہاں تک کہ اگر اس کے کوٹ پر دھاگے کا ایک ٹکڑا چپکا ہوا ہے تو اس سے بھی تم کو بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

وہ ایک اجنبی کو دیکھ کر کہتے، "اچھا، یہ موچی ہے۔" بعد میں وہ اپنے شاگردوں کو سمجھاتے کہ موچی کے پتلون کا اندرونی حصّہ گِھسا ہوا ہوتا ہے، کیوں کہ جوتے کی مرمت کرتے وقت وہ جوتے کو اسی جگہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا ایک نوجوان شاگرد تھا جس کا نام تھا آرتھر کانن ڈائل (ARTHUR CONAN DOYLE)۔ یہ نوجوان ۱۸۸۱ء میں یونی ورسٹی سے رخصت ہوا اور چھے سال تک ڈاکٹر کی حیثیت سے روزی کمانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر اس کی مالی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ مجبور ہو کر اس نے لکھنا شروع کر دیا۔ اس نے جاسوسی کہانی لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک نرالے قسم کے جاسُوس کا کردار تخلیق کرتے وقت اس کو اپنے پرانے اُستاد ڈاکٹر جوزف بل کا خیال آیا۔ اگر ڈاکٹر موصوف ایک جاسوس ہوتے تو وہ جاسوسی کو محض ایک تفریح نہ سمجھتے بلکہ اسے ایک جاسوس کی حیثیت دیتے۔ چناں چہ کانن ڈائل نے سائنٹی فک جاسوس

شرلاک ہومز بنا لیا، لیکن ہومز کے شان دار طریقے دراصل ڈاکٹر بل ہی کے طریقے ہیں۔
ایک دن سہ پہر کے وقت ڈاکٹر بل ہسپتال میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، "آجائیے!"
ایک آدمی اندر داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر بل نے اسے غور سے دیکھا اور کہا:
"آپ پریشان کیوں ہیں؟"
"آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں پریشان ہوں؟"
"چار بار دستک دینے سے۔ جو لوگ بے فکرے ہوتے ہیں وہ دو بار یا زیادہ سے زیادہ تین بار دستک دیتے ہیں۔" بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص واقعی پریشان تھا۔
ایک دوسرے موقع پر جب کانن ڈائل ڈاکٹر بل کے ماتحت کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ایک مریض کمرے میں داخل ہوا۔
"کیوں جناب! آپ جب شہر کے جنوبی حصّے سے گزرے تو گالف کے میدان میں چہل قدمی کرنے سے لُطف آیا کہ نہیں؟" ڈاکٹر بل نے پوچھا۔
مریض نے جواب دیا، "جی ہاں، لطف تو آیا، کیا آپ نے مجھے وہاں دیکھا تھا؟"
ڈاکٹر بل نے کہا کہ نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔ پھر انھوں نے سمجھایا، "جب بوندا باندی ہوتی ہے تو گالف کے میدان کی سرخی مائل مٹی جوتوں میں چپک جاتی ہے۔ اس قسم کی مٹی اور کہیں نہیں ہے۔"
شرلاک ہومز صِرف ڈاکٹر بل کے طریقوں ہی پر عمل نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات تو وہ واقعی جاسوسی کے کرتب دِکھا دیتا ہے۔ ڈاکٹر بل کے مطب میں جب مریض آتا تو اس سے پہلے کہ مریض کچھ بولے ڈاکٹر صاحب خود ہی اس کی تکالیف بتا دیتے۔ وہ اس کی پچھلی زندگی کے واقعات کی تفصیل بھی بتا دیا کرتے تھے اور اس میں اُن سے کبھی کبھی ہی غلطی ہوتی تھی۔ ایک دن ایک مریض آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو غور سے دیکھا اور بولے، "آپ نے فوج میں ملازمت کی ہے، اسکاٹش رجمنٹ میں، اور حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔" "جی ہاں، جناب!"
"آپ سارجنٹ تھے اور بار باڈوس میں تعینات تھے۔"

پھر ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوئے، "آپ نے دیکھا کہ یہ صاحب با اخلاق آدمی ہیں، لیکن انھوں نے کمرے کے اندر آکر اپنا ہیٹ نہیں اُتارا۔ فوج میں لوگ ہیٹ نہیں اُتارتے، لیکن اگر ان کو رِٹائر ہوئے زیادہ دن گزر چکے ہوتے تو پھر یہ عام شہریوں کے طور طریقے سیکھ لیتے۔ بہ ظاہر ان کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ہے۔ لہٰذا ان کا اسکاٹش رجمنٹ میں ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ رہا بار باڈوس کا معاملہ، تو ان کو ایک ایسا مرض لاحق ہے جو ویسٹ انڈیز میں عام ہے۔"

شرلاک ہومز کی ایک کتاب "دی گریک انٹرپریٹر" میں بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ شرلاک ہومز بہت جلد بے حد مقبول ہو گیا اور آج تک ہے۔ وہ واقعی ایک جاسوس معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ وہ جس طرح جُرم کا پتا چلاتا ہے وہ سب بیان کر دیتا ہے۔ بلاشبہ ایک لحاظ سے وہ واقعی جاسوس تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جیتا جاگتا کردار معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بل نے ایک آدمی کو بڑی خوب صورتی سے پکڑ لیا۔ وہ اپنے شاگردوں کو پڑھا رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی کمرے میں آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے شاگردوں سے کہا، "دوستو! یہ شخص ہائی لینڈ رجمنٹ میں ایک سپاہی تھا۔ غالباً یہ بینڈ بجاتا تھا۔" ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ مریض جب اندر آیا تو یہ ذرا اینٹھ کر چلا۔ یہ حرکت بالکل اسی طرح کی ہے جس طرح ہائی لینڈ کے بیگ پائپ بجانے والے کرتے ہیں، لیکن اس شخص نے جلدی سے انکار کیا اور کہا کہ میں تو جوتے بناتا ہوں۔ میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا کہ اپنی قمیص اُتارو۔ اس نے قمیص اُتار دی۔ طالبِ علموں نے دیکھا کہ اس شخص کے سینے پر انگریزی کا ڈی (D) بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جو لوگ جنگِ کریمیا سے بھاگ گئے تھے وہ جب پکڑے گئے تو ان کے سینوں پر ڈی داغ دیا گیا تھا۔

آخر اس آدمی نے اعتراف کیا کہ وہ ہائی لینڈ رجمنٹ کے بینڈ میں تھا۔ ڈاکٹر بل نے اپنے سامعین کی جانب گھوم کر وہی الفاظ کہے جن کی وجہ سے شرلاک ہومز کو شہرت حاصل ہوئی یعنی "دوستو! یہ تو دراصل ابتدائی بات تھی۔"

ڈاکٹر بل کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹروں اور جاسوسوں کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کو دانش مندی سے استعمال کریں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی زندگی کو فضول سمجھتا ہو۔ وہ اپنی قوتِ مشاہدہ کو تیز کرکے اپنی زندگی کو دلچسپ بنا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بہن نے ایک بار بتایا کہ ریل گاڑی کے سفر کو ڈاکٹر صاحب بڑا دلچسپ بنا دیا کرتے تھے۔ ہم لوگ جب ریل گاڑی پر سفر کرتے تو وہ ہم کو بتاتے کہ دوسرے مسافر کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جارہے ہیں اور اُن کے کام کے بارے میں بھی چند باتیں بتاتے، پھر وہ اُن مسافروں سے پوچھتے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کا اندازہ کتنا صحیح تھا اور کتنا غلط۔ ڈاکٹر صاحب اکثر و بیش تر جو بتاتے تھے وہ صحیح ثابت ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم لوگ اُن کو جادوگر سمجھنے لگے تھے۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب یہ واضح کر دیا کرتے تھے کہ وہ جو باتیں بتاتے ہیں وہ جادو نہیں بلکہ اچھی طرح مشاہدہ کرنے کی بہ دولت ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آدمی جو کام کرتا ہے اس کے نشانات اس کے ہاتھوں پر ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ کوئلے کی کان میں کام کرنے والے کے ہاتھوں پر جو نشانات ہوتے ہیں وہ پتّھر کی کان میں کام کرنے والے کے نشانات سے مختلف ہوتے ہیں۔ بڑھئی اور پتّھر کی عمارت بنانے والے دونوں کے ہاتھ سخت ہو جاتے ہیں، مگر ان میں بھی فرق ہوتا ہے۔

اس کے باوجود ڈاکٹر بل کبھی کبھار غلطی بھی کر جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے وہ نہایت خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ لوگ جب ان سے ان کی جاسوسی کے بارے میں پوچھتے تو وہ یہ قصہ سُنا دیا کرتے تھے:۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب اور ان کے شاگرد ہسپتال میں ایک مریض کا معائنہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مریض سے پوچھا: ”تم موسیقار ہو نا؟“ ”جی ہاں۔“

”دوستو! یہ بالکل آسان بات ہے۔ اس مریض کے گالوں کے عضلات (پٹھے) ایک مرض کا شکار ہیں، کیوں کہ اس نے بِگل بہت بجایا ہے۔ ہم اس سے سوال کریں گے اور وہ اعتراف کرلے گا۔ ہاں تو آپ کون سا باجا بجاتے تھے؟“ مریض بستر سے کہنیوں کے بَل ذرا اُٹھا اور بولا: ”ڈاکٹر صاحب، میں تو بڑا ڈھول بجاتا تھا۔“

اخبار نونہال

ترجمہ کرنے والی مشین

جاپان نے کمپیوٹر کی مدد سے کام کرنے والی ایک ایسی مشین بنائی ہے جو جاپانی زبان سے انگریزی میں ایک گھنٹے میں ۳ ہزار الفاظ کا ترجمہ کر سکتی ہے۔ یہ مشین اپنی نوعیت کی پہلی اور انوکھی ہے اور اس کی قیمت ۵ ر ۱۹ ملین ین (جاپانی سکّہ) ہے جو ۸۳ ہزار امریکی ڈالر کے برابر ہے۔

اس مشین کے بارے میں دنیا کے مختلف حصّوں سے ۱۴۰ افراد یا اداروں نے معلومات حاصل کی ہیں، جن میں امریکا کا محکمۂ دفاع بھی شامل ہے، لیکن اس مشین کے کیے ہوئے ترجموں کو ابھی انسان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

مرسلہ: سلمیٰ اقبال، حیدر آباد

فُٹ بال کے برابر برف کے گولے

روس کے علاقے سائبیریا میں برف کا ایک طوفان آیا تھا۔ اس طوفان میں زمین پر گرنے والے برف کے گالے فُٹ بال سے بھی زیادہ بڑے تھے۔ بتایا گیا ہے کہ ان گالوں کی لمبائی تقریباً بیس انچ تھی اور قطر تقریباً ۸ انچ تھا۔

مرسلہ: فرحت حسین، حیدر آباد

سب سے بڑی دُور بین اور خُرد بین

دنیا کی سب سے بڑی دُور بین روس میں نصب ہے۔ اس کے شیشے کا قطر ۲۳۶٫۲ انچ اور

وزن ۸،۷ ٹن ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر پندرہ ہزار میل کے فاصلے پر کوئی موم بتی جل رہی ہو تو اس دُوربین سے اس کی روشنی دیکھی جا سکتی ہے۔
دنیا کی سب سے بڑی خُرد بین مشی گن یونی ورسٹی امریکا میں ہے جو ہر چیز کو ۲۶۰ ملین گنا بڑا کرکے دکھاتی ہے۔ مرسلہ: حمیرہ گوہر، وقار عظیم، کراچی

تیل، نمک، موسم کی پیشن گوئی اور درخت

چین میں ایسے عجیب و غریب درخت پائے گئے ہیں جن میں سے تیل اور نمک نکلتا ہے۔ اور جن کے ذریعہ سے موسم کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی صوبے میں ایسے سفید درخت پائے گئے ہیں جن کی شاخوں اور پتوں سے ایسا تیل نکلتا ہے جو کھانا پکانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ شمالی مشرقی چین میں ایسے درخت دریافت ہوئے ہیں جن سے نمک کی شکل کا سفوف نکلتا ہے جو کھانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شمالی مشرقی چین میں پائے جانے والے درخت کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس سے سوڈا نکلتا ہے۔ شمالی چین ہی میں ڈیڑھ سو سال پرانا ایسا درخت بھی ہے جس کے ہرے پتے بارش سے پہلے سُرخ ہو جاتے ہیں۔
مرسلہ: ماہ رُخ، ملیر توسیعی کالونی

ٹانگوں سے محرومی

جونی شاید دنیا کا واحد آدمی ہے جو پیدائشی طور پر اپنی ٹانگوں سے محروم ہے۔ جونی جب پیدا ہوا تو ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ بہ مشکل چند گھنٹے زندہ رہ سکے گا، لیکن جونی کی زندگی میں حیرت انگیز خوبیاں پیدا ہوئیں۔ اس نے اپنی زندگی میں ٹائپ کرنا سیکھا۔ شعبدہ بازی میں حصّہ لیا۔ غرض ہر کام میں مہارت حاصل کرلی اور خوب نام پیدا کیا۔ مرسلہ: پرنس افضل شاہین، بہاول نگر

نونہال مصور

فاطمہ عروج

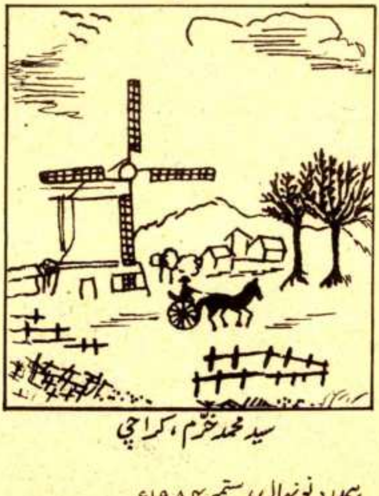

سید محمد خرم، کراچی

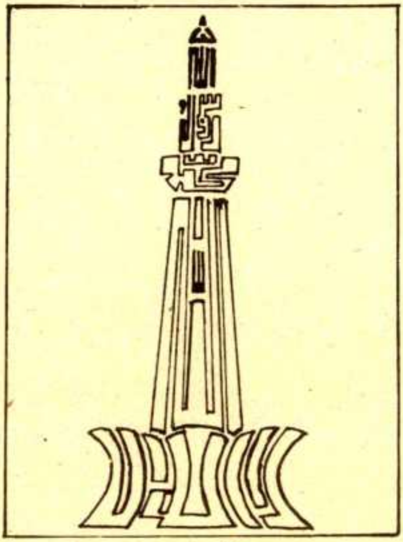

عبداللہ شیخ، خیرپور

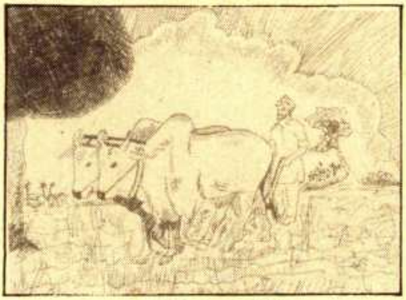

جمیل احمد خان، کراچی

روبینہ غیور، کراچی

نگہت رسول، راولپنڈی

علینا انصاری، کراچی

علی اختر عمرانی بلوچ، نواب شاہ

گلنار کرن، حیدرآباد

علوینہ خان، کراچی

ذوالفقار علی مصّور، مٹھن کوٹ

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي

BGL

– the excellent performance of our bottles on filling lines has made us the market leader

Al-Hamdolillah. The excellent performance of our bottles on filling lines and dedication to specifications, quality and service has made us the market leader in glass containers for beverages and food Industry.

We look ahead to continued high performance and success.

We also offer expert glass container designing and development service in association with our world renowned consultants, Rockware International, UK, to suit your specific requirements.

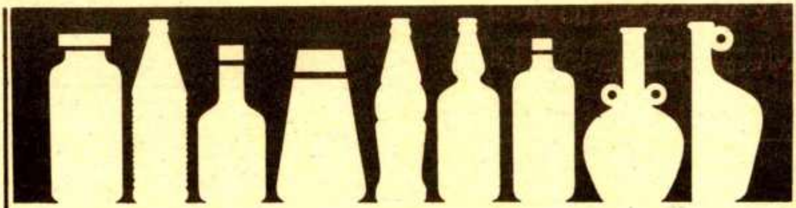

BGL Baluchistan Glass Limited

(A Habib Group Project)

HEAD/LIAISON OFFICE: 1101, Uni Towers,
I.I. Chundrigar Road, Karachi.
Phones: 228511 (4 lines), 239642.
Cable: GLASSCO. Telex: 2893 HABIB PK.
REGISTERED OFFICE: Hilal Manzil, Jinnah Road,
Quetta.

Thaver 2-84

ہماری تاریخ کے خوب صورت لمحے

احمد خان خلیل

حضرت علیؓ عدالت میں

ایک بار حضرت علیؓ کی ایک زرہ کھوئی گئی جو بعد میں ایک یہودی کے ہاں نکلی۔ یہودی کا دعوا تھا کہ زرہ اس کی اپنی ہے۔ حضرت علیؓ معاملہ عدالت میں لے گئے۔ قاضی شُریح نے جو اُس وقت قاضی (جج) تھے دونوں کو عدالت میں پیش ہونے کو کہا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو اس وقت امیرالمومنین یعنی سب سے بڑے حاکم بھی تھے عدالت میں یہودی کے برابر کھڑے ہوئے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے گواہ لانے کو کہا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، "میرا بیٹا حسن میرا گواہ ہے۔" قاضی شُریح نے کہا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں کی جاسکتی۔ ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ یہودی نے زرہ واپس کرنے اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے کہا کہ جس دین میں عدالت کو خلیفہ پر جرح کرنے کی طاقت حاصل ہے وہ یقیناً حق و انصاف کا دین ہے۔

میں سوتا رہوں گا تو...

فتح اسکندریہ (۲۱ ہجری = ۶۴۲ عیسوی) کی خبر لے کر قاصد معاویہ بن خدیج مدینے آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے سوچا امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ آرام کر رہے ہوں گے۔ چناں چہ مسجدِ نبوی میں چلا گیا۔ وہاں اتفاق سے حضرت عمرؓ کی ایک خادمہ نے اُسے دیکھ لیا۔ اس نے اُسی وقت جا کر حضرت عمرؓ کو خبر دی اور پھر واپس آ کر قاصد کو ساتھ لے گئی۔

حضرت عمرؓ نے فتح کی خبر سُن کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ پھر فرمایا، "آپ سیدھے یہاں کیوں نہیں چلے آئے؟" قاصد نے کہا، "دوپہر کا وقت تھا میں نے سوچا آپ آرام فرما ہوں گے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا، "میں اگر دن کو بھی سوتا رہوں گا تو خلافت کا بوجھ کون اُٹھائے گا؟"

خلیفہ کے بچّوں کی عید

خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اس درجہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ اُن کا شمار خلافتِ راشدہ میں کیا جاتا ہے۔ ایک بار عید کا موقع تھا۔ بیوی نے کہا کہ عید سَر پر آگئی ہے۔ بچّوں کے لیے نئے کپڑوں کا انتظام فرمائیے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی تنخواہ پیشگی لینے کے لیے خزانچی کو رقع لکھا۔ خزانچی نے کہا کہ آپ کا حکم سَر آنکھوں پر، لیکن آپ کو یہ یقین کیسے ہے کہ آپ مہینے تک جئیں گے اور پیشگی رقم ادا کر دیں گے۔ خلیفۂ وقت نے ان کی دلیل مان لی اور پیشگی رقم نہ لی۔ آپ کے بچّوں نے پرانے کپڑے پہن کر عید منائی۔

طاقت سے نہیں انصاف سے

ایک بار جراح بن عبادالله حاکم خراسان نے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھ بھیجا کہ اہلِ خراسان تلوار کے بغیر سیدھے ہونے والے نہیں، اس لیے سختی کی اجازت دی جائے۔ آپ نے جواب بھیجا کہ یہ بات غلط ہے۔ عدل ایسی چیز ہے کہ باغی سے باغی آدمی بھی بغاوت اور فساد چھوڑ دیتا ہے۔

عہد کا پاس

۱۵ ہجری (۶۳۶ء) کا واقعہ ہے۔ جب شام میں حمص پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو وہاں کے عیسائیوں کے جان و مال کی حفاظت کے عوض اُن پر کچھ جزیہ مقرر کیا گیا۔ جزیہ اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو غیر مسلموں سے اُن کی حفاظت کے معاوضے کے طور پر اسلامی حکومت لیتی ہے۔ مسلمانوں سے جزیہ اس لیے نہیں لیا جاتا کہ اُن پر جنگی خدمت فرض ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ بعد میں عیسائی فوجوں کی نقل و حرکت سے حالات اتنے خراب ہو گئے کہ مسلمان حمص کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔

چناں چہ مسلمان فوجوں کے کمان دار ابو عبیدہ نے حکم دیا کہ جزیہ کی رقم سب کو واپس کر دی جائے، کیوں کہ ہم اپنے عہد کا پاس کرنے کے فی الحال قابل نہیں۔ مسلمانوں کے اس انصاف سے عیسائی بہت متاثر ہوئے، کیوں کہ ان کی اپنی حکومت نے ایسا انصاف کبھی نہیں کیا تھا۔

ہماری عزّت صرف اسلام سے ہے

فتح بیت المقدس کے موقع پر عیسائیوں نے درخواست کی تھی کہ مسلمانوں کا امیرالمومنین خود آکر معاہدے پر دستخط کرے ۔ چناں چہ حضرت عمرؓ صرف ایک ملازم اسلم کو ساتھ لے کر مدینہ سے شام کو روانہ ہوئے ۔ جب آپ بیت المقدس کے قریب پہنچے تو سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ اور دوسرے مسلمان سردار استقبال کو موجود تھے ۔ حضرت عمرؓ جن کے نام کی روم و شام تک میں دھوم تھی موٹے جھوٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے ۔ سرداروں نے چاہا کہ آپ کو قیمتی پوشاک پہنا کر اعلا ترکی گھوڑے پر سوار کر کے بیت المقدس میں داخل کیا جائے، لیکن آپ نے فرمایا، "خدا نے ہمیں جو عزّت دی ہے وہ صرف اسلام کی وجہ سے ہے اور یہی عزّت ہمارے لیے کافی ہے ۔

میرے بیٹے نے دین نہیں بیچا

قاضی موسیٰ کشمیر میں قاضی القضاۃ (بڑے جج) تھے ۔ چک خاندان کا بادشاہ یعقوب اُن سے ایک غلط فتویٰ لکھوانا چاہتے تھے ۔ قاضی صاحب نے انکار کیا کہ میں خلافِ شرع کچھ نہیں کروں گا ۔ بادشاہ نے انھیں سرِ دربار قتل کروایا ۔ اُن کی لاش کو ہاتھی کی دُم سے بندھوا کر تمام شہر میں پھروایا ۔ جب لاش اُن کے گھر پہنچی تو اس کی غم زدہ ماں نہ روئی نہ پیٹی ۔ بیٹے کی لاش پر اپنی اوڑھنی بچھادی اور کہا، "میرے بیٹے نے دین بیچنے کے لیے تعلیم نہیں پائی تھی ۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ حق کی راہ میں شہید ہوا ۔"

ہر شخص ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوا ہے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فاتح مصر عمرو بن العاص نے جو مصر کے گورنر تھے ایک قبطی (مصری) کو بے وجہ مارا پیٹا ۔ اس کی شکایت خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کو پہنچی ۔ آپ نے عمرو بن العاص کی خوب خبر لی اور فرمایا، "آپ نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا ہے ۔ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد پیدا کیا ہے ۔"

لوٹ مار نہ کرنے دی

۴۲۹ ہجری (۱۰۳۸ء) میں جب سلطان طغرل خان نے نیشاپور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر

لیا تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ کسی بڑے شہر کی فتح کے بعد لشکر میں شامل لوگوں کو لوٹ مار کی اجازت دے دی جاتی تھی اور وہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق لوگوں کا زر و مال لوٹ لیتے تھے۔ چناں چہ طغرل خان کی فوج بے تاب تھی کہ اجازت ملے تو تُرکستان کے دولت مند ترین شہر کی دولت سے اپنی جھولیاں بھریں، لیکن طغرل خان نے یہ کہہ کر اپنی فوج کو ٹھنڈا کرنا چاہا کہ رمضان کا مہینہ ہے۔ بہ حیثیت مسلمان ہم سب پر اس کا احترام واجب ہے۔ یہ سُننے کے بعد لشکر کا لشکر پھر اس تاک میں رہا کہ رمضان ختم ہوں تو شہر کو لُوٹیں اور لشکر کے لوگوں میں بے چینی نظر آنے لگی، لیکن طغرل بیگ نے بغاوت کے آثار دیکھ کر بھی انھیں لوٹ مار کی اجازت نہ دی، البتہ نیشاپور والوں سے کہا کہ وہ جتنی رقم بہ خوشی دے سکتے ہیں دے دیں تاکہ لشکر میں بانٹ دی جائے اور لوٹ کھسوٹ نہ ہو۔

طغرل خان اُس شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جسے سَلجُوق کہتے ہیں۔ یہ قوم کے تاتار تھے۔ اُن کے دادا کا نام سلجوق تھا۔ سلطان الپ ارسلان بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

جھوٹے اور ظالم وزیروں کا حشر

سلطان محمود والیِ گجرات (کاٹھیاواڑ) ۸۷۰ ہجری (۱۴۶۵ عیسوی) میں جب دکن کی طرف شکار کو نکلا تو اس کے ایک سردار نے ایک شخص کو بے قصور قتل کرا دیا اور خود بھاگ گیا۔ بادشاہ نے اپنے دو وزیروں ملک حاجی اور عِضدُالملک کو حکم دیا کہ اس سردار کو گرفتار کرائیں۔ یہ دونوں وزیر در پردہ اس سردار سے ملے ہوئے تھے۔ اس کے بجائے کہ وہ اس سردار کو پکڑواتے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور اس سردار کے دو نوکروں کو بہت سی رقم دے کر اقبالِ جرم کے لیے تیار کرایا اور اُن سے وعدہ کیا کہ وہ انھیں سزا سے بچا لیں گے، مگر وہ بے چارے مقتول کے بدلے میں قتل کر دیے گئے۔

جُرم چُھپا نہیں رہ سکتا۔ بادشاہ کو جلد ہی خبر ہو گئی کہ انھوں نے ایک مجرم کو بچایا اور دو بے گناہوں کو قتل کروایا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وزیر اس قدر بے انصافی کریں تو باقی افسروں کی حالت کیا ہو گی۔ بادشاہ نے دونوں وزیروں کو قتل کروا کر اُن کی کھالوں میں گھاس پھوس بھروا کر احمد آباد کے چوک میں لٹکوا دیا۔ تاکہ تمام بے انصاف، جھوٹے اور ظالم حاکموں کو عبرت ہو۔

شاہی تخت سے بھکاریوں کی صف میں

القاہر باللہ ۳۲۰ ہجری (۹۳۲ عیسوی) میں خلیفہ بنا۔ یہ عباسی خُلَفا میں انیسویں نمبر پر تھا۔ قاہر باللہ بڑا ہی ظالم اور بد باطن شخص تھا۔ اس نے اپنے سے پہلے والے خلیفہ کی ماں کی دولت ہتھیانے کے لیے اس کو درخت پر اُلٹا لٹکوا دیا۔ اس کی اولاد کو شکنجہ میں کھچوا دیا۔ جن درباریوں نے ان کاموں سے روکنا چاہا انھیں بھی قتل کرا دیا۔ آخر رعایا اور سلطنت کے افسر تنگ آ گئے۔ انھوں نے خلیفہ القاہر باللہ کو پکڑوا کر آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اندھا کر دیا اور اُسے تخت سے اُتار دیا۔

جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ قاہر باللہ بغداد کی سیڑھیوں پر بھکاریوں کی صف میں بیٹھ کر بھیک مانگنے لگا۔ وہ یہ بھی کہتا جاتا تھا، "لوگو! میں کل تک تمھارا خلیفہ تھا، آج تمھارا محتاج ہوں۔" آخر حکومت نے سوچا کہ اس طرح تو خلفا کی ذلّت اور بدنامی ہوتی ہے، اس لیے اسے نظر بند کر دیا اور وہ موت تک نظر بند رہا۔

نیک آدمی کی جرات کام کر جاتی ہے

المقتفی اکتیسواں عباسی خلیفہ تھا جو ۵۳۰ سے ۵۵۳ ہجری تک (۱۱۳۵ تا ۱۱۶۰ عیسوی) تخت نشین رہا۔ اس نے رعایا پر بے شمار ٹیکس لگا رکھے تھے۔ لوگ مالی پریشانیوں میں بُری طرح مبتلا تھے، لیکن کوئی نہیں تھا جو خلیفہ کو اصل حالات سے مطلع کرتا۔ اس زمانے میں خُلَفا مطلق العنان تھے یعنی جو اُن کے جی میں آتا کر گزرتے۔ ان کے ایک ادنا اشارے سے گردنیں تک کاٹ دی جاتی تھیں۔

آخر ایک عالمِ دین سے نہ رہا گیا، جن کا نام ابن عبادی تھا۔ انھوں نے سوچا حق بات کہنے کا انجام جو بھی ہو اللہ کے سامنے تو میں شرمندہ نہ ہوں گا۔ وہ خلیفہ کے پاس گئے اور بڑے سلیقے سے اس کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا بلکہ یہاں تک کہا کہ غریبوں کے گاڑھے پسینے کی حلال کمائی بیت المال میں جا کر گانے والوں اور گانے والیوں پر تو صَرف ہو رہی ہے، لیکن حق دار اپنے حق سے محروم ہیں۔ خلیفہ نے ان باتوں اور دلیلوں سے متاثر ہو کر تمام ٹیکس ختم کر دیے اور عوام نے چین کا سانس لیا۔

وفادار بیوی

کامران شہنشاہ بابر کا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی تھا۔ جب اس کی طرف سے ریشہ دوانیاں بہت بڑھ گئیں تو اسے اندھا کروا دیا گیا اور ملک بدر کر کے حجاز جانے کا حکم دیا گیا۔ شاہ حسین حاکم ٹھٹھہ اس کے سُسر تھے۔ کامران اور اس کی بیگم وہاں آئے تو شاہ حسین اور دوسرے رشتے داروں نے کامران کی بیوی کو سمجھایا بُجھایا کہ شہزادہ اب اندھا ہو چکا ہے، تم کہاں اس کے ساتھ خوار ہوتی پھرو گی یہیں پر رہ جاؤ۔ اس وفا شعار بیوی نے اپنے والد صاحب سے کہا، "ابا جان، جب کامران خوش حال، تن درست اور بادشاہ تھا تو آپ نے مجھے اس کے حوالے کیا۔ اب وہ اندھا اور خستہ حال ہے۔ اسے میری خدمت کی جتنی اب ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں اپنے سرتاج کو اس مشکل وقت میں چھوڑ دوں۔" بیٹی کی بات سُن کر باپ کا جی بھر آیا۔ جتنا مال و دولت دے سکتا تھا انھیں دیا اور عرب روانہ کر دیا۔ کامران نے بقیہ زندگی حجازِ مقدس میں گزاری۔ ۹۶۴ ہجری میں وہیں اس کا انتقال ہوا۔

میرا ہاتھ اور آپ کا دامن

ریاست رام پور میں نواب احمد علی خاں (۱۲۰۹۔۱۲۵۶ ہجری = ۱۷۹۴۔۱۸۴۰ء) کے زمانے میں ایک عدالت میں ایک شخص کا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ عدالت کے منصف اس شخص کے مقدمہ کو خراب کر رہے تھے۔ وہ بے چارہ فریاد کرتا، لیکن شُنوائی نہ ہوئی۔

ایک دن جب نواب صاحب شکار کے لیے ہاتھی پر شہر کے دروازے سے نکلے تو اس شخص نے بہ آوازِ بلند کہا، "نواب صاحب! میدانِ حشر میں میرا ہاتھ اور آپ کا دامن ہو گا۔"

نواب صاحب نے ہاتھی روک لیا۔ اُسے قریب بُلا کر واقعہ سُنا اور پھر اس کا مقدمہ اس کی پسند کی عدالت میں منتقل کرنے کے احکام صادر کیے۔ اس کے بعد کہا، "اب میں تمھاری جواب دہی سے بَری ہو گیا ہوں۔"

سمندر اور اُس کے عجائبات

علی اسد

سمندر کی وسعت اور اہمیت کے باوجود اب تک اس کی طرف بہت کم توجہ کی گی ہے، البتہ گزشتہ بیس تیس برسوں سے سائنس دانوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا ہے اور اب دنیا بھر میں تقریباً چھے سو تربیت یافتہ افراد پچاس جہازوں پر سمندر کے بارے میں چھان بین کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ موسموں پر بھی کچھ قابو پایا جا سکے گا اور غذا حاصل کرنے کا ایک نیا ذریعہ ہاتھ آجائے گا۔ شاید یہ سُن کر آپ کو حیرت ہو کہ سمندر میں بھی فی ایکڑ اتنی ہی پیداوار ہوتی ہے جتنی کہ زمین پر، اس کے باوجود انسان ابھی تک اپنی غذائی ضروریات کا صرف دو فی صد سمندر سے حاصل کر رہا ہے۔

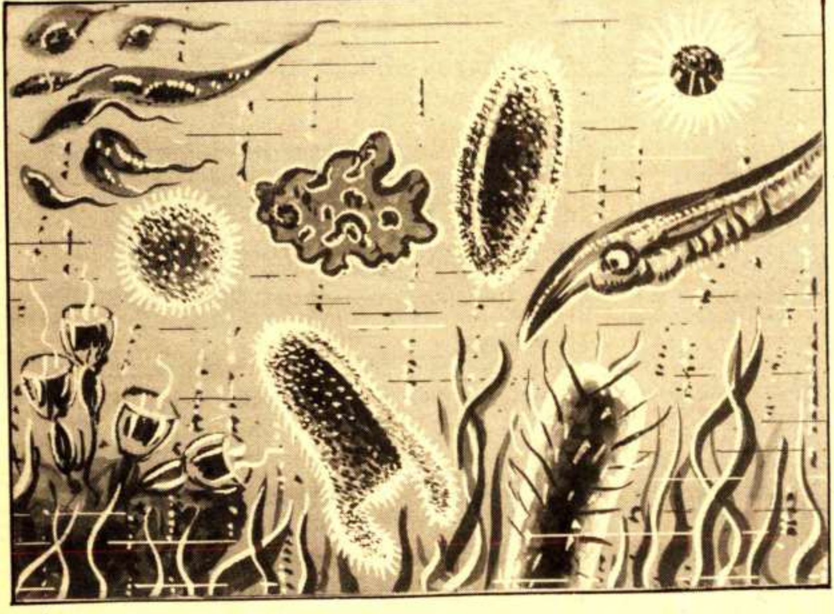

پرانے زمانے میں لوگ شاید سمندر کو ایک دریا سمجھ بیٹھے تھے، لہٰذا انھوں نے اس سیارے کا نام زمین رکھ دیا، اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ اس سیّارے کا تقریباً تین چوتھائی حصّہ پانی ہے تو وہ اس کا نام زمین کے بجائے سمندر رکھ دیتے۔

پانی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ گرمی کو اِکٹھا کر سکتا ہے، اسی لیے سمندر گرمی کا خزانہ بنا رہتا ہے اور زمین کو گرمی کے موسم میں ٹھنڈا رکھتا ہے اور جاڑے میں گرم رکھتا ہے۔

پانی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کو تحلیل کر سکتا ہے، اگر پانی میں یہ خوبی نہ ہوتی تو دنیا میں کوئی چیز زندہ نہ رہ سکتی۔ ہر جان دار چیز خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی دراصل ایک کیمیائی کارخانے کی طرح ہے۔ زندگی مختلف کیمیائی ردِّ عمل کے ذریعے سے قائم رہتی ہے۔ ان میں سے بہت سے ردِّ عمل صرف اُسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ پانی ان چیزوں کو تحلیل کرنے کے لیے موجود ہو۔

تمام زندہ چیزوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ پانی آخر کار سمندر ہی سے آتا ہے۔ تمام سمندر ایک سو اکتالیس ملین مربع میل کا علاقہ گھیرے ہوئے ہیں، یعنی زمین کے دو تہائی رقبے سے بھی زیادہ۔ چاروں بڑے سمندروں میں بحرالکاہل (Pacific Ocean) سب سے بڑا ہے۔ یہ باقی تینوں سمندروں کے مجموعے کے برابر ہے۔ اس کے بعد بحرِاوقیانوس (Atlantic Ocean) ہے۔ پھر بحرِ ہند (Indian Ocean) اور بحرِ شمالی (Arctic Ocean) سمندروں میں تین سو تیس ملین مکعب میل (کیوبک مائلس) پانی ہے، جب کہ سمندر کی سطح کے اوپر زمین کی جسامت صرف اس کا اٹھارھواں حصّہ ہے۔

زمین پر سب سے اونچا پہاڑ ایورسٹ ۲۹۰۲۸ فیٹ بُلند ہے جب کہ مغربی بحرالکاہل میں سمندری چٹان (Mariana Trench) ۳۵۸۰۰ فیٹ گہری ہے۔ اس گہرائی میں کوہِ ایورسٹ ڈوب سکتا ہے۔ اس تمام پانی میں مختلف معدنیات اور کیمیائی چیزیں محفوظ ہیں۔ سمندر کے پانی میں اوکسی جن، کاربن ڈائی اوکسائڈ اور نائٹروجن ملی ہوئی ہیں۔ آبی جانور حل شدہ اوکسی جن کی بہ دولت سانس لیتے ہیں اور حل شدہ کاربن ڈائی اوکسائڈ کو پودے استعمال کرتے ہیں، لیکن حل شدہ نائٹروجن سے سمندر میں کیا کام ہوتا ہے۔ یہ

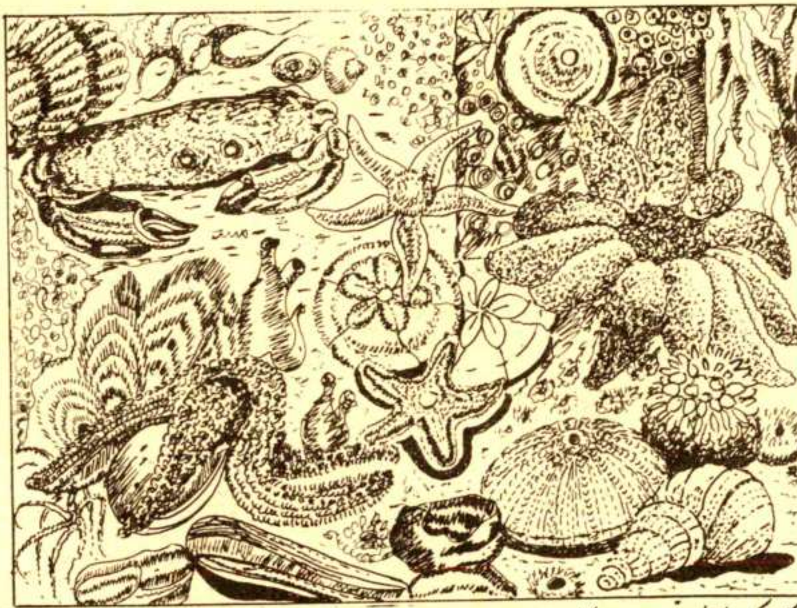

ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ سمندر میں جو چیز سب سے زیادہ ہے وہ ہے سوڈیم کلورائڈ یعنی نمک۔ سوال یہ ہے کہ سمندر میں یہ نمک کہاں سے آتا ہے؟ کچھ تو یوں آتا ہے کہ پالا اور کٹاؤ کی وجہ سے چٹانیں ٹوٹ جاتی ہیں اور چٹانوں میں جو نمک اور دوسری کیمیائی چیزیں ہوتی ہیں وہ بارش کے پانی میں حل ہو کر سمندر تک پہنچ جاتی ہیں۔ باقی نمک ان چٹانوں سے نکلتا ہے جو سمندر کے نیچے ہوتی ہیں۔

سمندر میں صرف کیمیائی چیزیں ہی نہیں اکٹھی ہوتیں، بلکہ دنیا بھر کی قریب قریب ہر چیز سمندر میں پہنچ جاتی ہے اور اس میں خود سمندر کے اندر کا ملبا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ سمندر میں جان دار چیزیں جب مر جاتی ہیں تو وہ بھی نیچے بیٹھنے لگتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تہ تک پہنچنے نہیں پاتیں، کیوں کہ زیادہ گہرائی میں رہنے والی مخلوق ان کو کھا جاتی ہے، یا پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ سمندر کے پانی میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ بہر حال یہ آبی ملبا عرصۂ دراز کے بعد سمندر کی تہ میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ مردہ جانوروں کے خول یا گھونگھے بہر حال سمندر کی تہ میں موجود ہوتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیچڑ میں انتہائی قدیم جانوروں کے

نشانات بھی پائے جائیں۔

انسان نے اب تک صرف سمندر کی سطح پر غور کیا ہے، لیکن گزشتہ چند برسوں سے سمندر کی گہرائی میں تحقیقات شروع کر دی گئی ہیں۔ آدمیوں کے ذریعے سے سمندر کی گہرائی کی تحقیقات ٹریئسٹ (Trieste) نامی جہاز کے عملے نے کی۔ یہ کام ۲۳ر جنوری ۱۹۶۰ء کو کیا گیا۔ اس جہاز نے تقریباً سات میل گہرے سمندر میں بیس منٹ گزارے، لیکن زیادہ تر معلومات مختلف آلات کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہیں۔ ان تحقیقات کی بدولت بہت سی حیرت انگیز معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سمندر کی تہ میں اور زمین میں بڑا فرق ہے۔

تمام برِّاعظم ایک دوسری طرح کی چٹانوں کے بنے ہوئے ہیں جس کو گرانائٹ (Granite) کہتے ہیں۔ جب کہ سمندر کی تہ جس پتھّر کی بنی ہوئی ہے اس کو بسالٹ (Basalt) کہتے ہیں۔ ایک دوسری بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ زمین کی پرت سمندر کے نیچے بہت زیادہ پتلی ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سمندر کے نیچے ایک بہت بڑا پہاڑی سلسلہ ہے جو چالیس ہزار میل تک چلا گیا ہے۔ اتنا بڑا پہاڑی سلسلہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ اس کا نام "مِڈ اوشن رج" (Mid Ocean Ridge) رکھا گیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سمندر میں آئے دن نئے نئے جانوروں کے ملنے کی اطلاعات مل رہی ہیں۔

سمندر بہت پُرانا ہے اور زمین اس سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ زیادہ تر سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین تقریباً چھے ہزار ملین برس پہلے پیدا ہوئی، لیکن سمندر میں بارش کا پانی بعد میں اکٹھا ہوا۔ زمین پر زندگی کی ابتدا کب سے ہوئی، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جدید سائنس کے لحاظ سے سب سے پہلی جان دار چیز سالمہ (Molecule) ہوگا اور یہ سالمہ سمندر میں بنا ہوگا، کیوں کہ اس کی تشکیل کے لیے پانی کی ضرورت ہے، پھر اسی سالمے سے ایک خلیے والی جان دار شے پیدا ہوئی۔ اس نئی مخلوق کو زندہ رہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے مناسب سالموں کو بہ طور غذا استعمال کرنا پڑا۔ پھر کچھ جان دار چیزوں میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ سورج کی روشنی سے توانائی حاصل کر لیں اور اس کے ذریعے سے سمندر میں حل شدہ

کیمیائی چیزوں سے غذا تیار کریں۔ ان جان دار چیزوں نے وہ کاربن ڈائی اوکسائڈ حاصل کرلی جو سمندر کے پانی میں ملی ہوئی تھی اور شکر تیار کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اوکسی جن خارج کرنے لگے۔ اس کار وائی میں جو جان دار شامل تھے وہ تھے پودے۔ دوسری جان دار چیزیں جو یہ کار وائی کرنے سے قاصر تھیں انھوں نے پودے کھا کر اپنی غذائی ضروریات کو پورا کیا، یہ تھے جانور۔

سمندر میں جان دار چیزوں کی پیدائش جس وقت سے شروع ہوئی اسی وقت سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ سب سے پرانی جان دار چیز تھی کائی۔ ان پودوں کے پتھریلے سانچے کینڈا میں پائے گئے ہیں اور یہ کم از کم ایک ہزار ملین سال پرانے ہیں۔ اس کے باوجود سمندر میں پودوں کی نشوونما بہت زیادہ نہیں ہوئی۔ آج سمندر میں سو سے بھی کم اقسام کے پودے پائے جاتے ہیں جب کہ زمین پر تقریباً ڈھائی لاکھ اقسام کے پودے ہیں۔

پانی میں رہنے والے جانوروں کا قصہ اس سے بہت مختلف ہے۔ جوں ہی ایک خلیہ والی مخلوق نے کئی خلیوں کی شکل اختیار کرنا شروع کیا طرح طرح کے جانور پیدا ہونے لگے، ان جانوروں کے جو پتھریلے سانچے

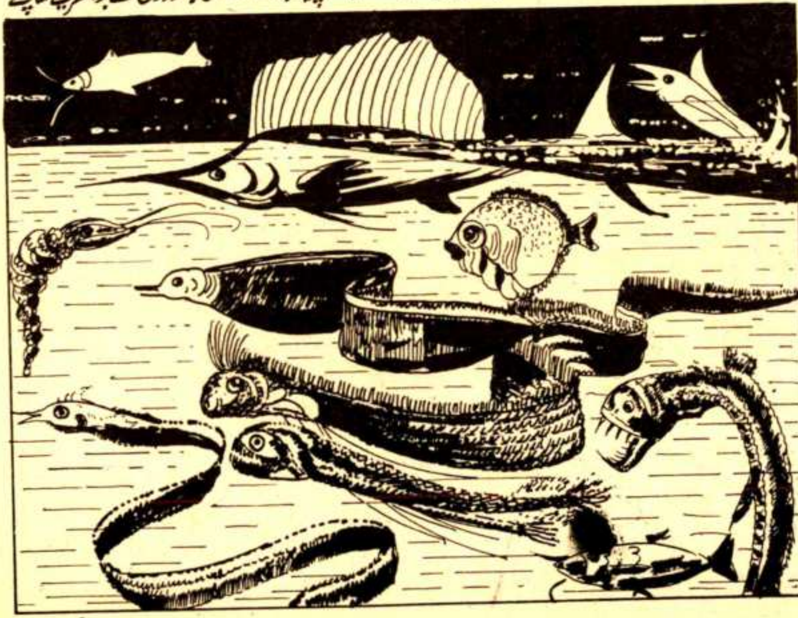

دست یاب ہوئے ہیں اُن سے ان جانوروں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سات سو ملین سال پہلے جیلی فش موجود تھی۔ یہ سب سے قدیم جانور ہے جس کا منھ اور پیٹ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اسی زمانے میں ایسے کیڑے بھی تھے جن کے اعصابی نظام اور دماغ بھی تھے۔

اُس وقت ایسے جانور نہیں تھے جن کی ریڑھ کی ہڈی ہو اور ایسے بھی جانور یا پودے نہیں پیدا ہوئے تھے جو سمندر سے نکل کر زمین پر آجائیں، چناں چہ بہت سے جانور ایسے نمودار ہوتے جن کے جسم پر خول تھے تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت اُن جانوروں کو حاصل ہے جو آج کل کے کیکڑے اور جھینگا مچھلی سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے بعد کے دَور میں یعنی آج سے تقریباً پانچ سو ملین برس پہلے ایسے دیوقامت گھونگھے پیدا ہوئے جو سولہ فیٹ لمبے تھے اور پھر اس کے بعد کے زمانے میں مچھلی نمودار ہوتی۔ یہ پہلا جانور تھا جس کے ریڑھ کی ہڈی تھی۔ پھر اس کے بعد سمندری پودے زمین پر آنا شروع ہو گئے۔ یہ اس طرح ہوا کہ سمندر میں بڑے بڑے پہاڑ نکل پڑے۔ لہٰذا سمندر کے پاس زمین دکھائی دینے لگی۔ اسی زمانے میں سمندری بچھو رینگتا ہوا ساحل پر آ گیا۔ اس کے بعد مچھلی کی طرح کے دوسرے جانور بھی زمین پر آنے لگے، چناں چہ اس دَور کے بعد صحیح معنوں میں زمین پر زندگی کی نشوونما شروع ہو گئی۔ یوں تو سمندر میں بھی زندگی کی نشوونما ہوتی رہے گی اور پرانے جانوروں کی جگہ نئے جانور پیدا ہوتے رہیں گے، مگر زندگی کا اصل ڈراما اب زمین پر شروع ہو گیا ہے۔

اردو کی خدمت

ہر زمانے میں حالت کے مطابق نیکی کی ضرورت بدل جاتی ہے۔ وبا کے زمانے میں بیماروں کی خدمت کرنا سب سے بڑا ثواب کا کام ہے۔ قحط کے زمانے میں بھوکوں کو کھانا کھلانا نماز سے بڑھ کر عبادت ہے۔ اس ابتلا کے دور میں جب کہ اردو پر ہر طرف سے حملہ ہو رہا ہے، اردو کی خدمت کرنا اور اُسے فروغ دینا عبادت ہے۔

—— سرسید احمد خان

محمد سلیم بھٹی، سکھر

سلسلے وار کہانی

قسط دوم

چالاک خرگوش

کرشن چندر

لومڑ بھائی اس بات سے بہت خفا تھے کہ خرگوش نے ان کی دعوت کا ستیاناس کر دیا تھا اور اب وہ بدلا لینے کی فکر میں تھے۔ کیا کریں کس طرح خرگوش کو پکڑیں اور پکڑ کے اپنے پیٹ کی دعوت کریں۔

لومڑ نے بہت سی چالیں چلیں، مگر ہوشیار خرگوش ہتھے نہ چڑھا۔ آخر ایک روز جب خرگوش اپنے راستے پر بھاگا چلا جا رہا تھا لومڑ نے اسے آواز دی اور کہا، "بھائی خرگوش، ٹھیرو۔ ایک ضروری بات ہے، سنتے جاؤ۔" خرگوش بھاگتے بھاگتے رُکا اور بولا "سنتا ہوں لومڑ بھائی، مگر تم میرے زیادہ قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ میرے بالوں میں بہت جوئیں ہیں اِن دِنوں۔" خرگوش نے جلدی سے بہانہ کیا۔ لومڑ جوؤں سے ڈر کر وہیں رُک گیا اور دُور ہی سے بولا "بھائی خرگوش، اُس دن جو ہُوا سو ہُوا۔ اس کا ہم سب لوگوں

لومڑ دیوار کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا اور خرگوش کا انتظار کرنے لگا۔

کو بہت افسوس ہے کہ تمھیں ہم نے خواہ مخواہ پانی میں ڈبونے کی کوشش کی۔ اب اسے بھول جاؤ۔ چچا ریچھ کہہ رہے تھے کہ جنگل کے سب جانوروں کو امن چین سے رہنا چاہیے۔"

خرگوش نے کہا، "مجھے خود امن چین سے رہنا بہت پسند ہے اور میں کسی سے دشمنی مول لینا پسند بھی نہیں کرتا اور جنگ سے صلح ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔"

"تو آؤ صلح کر لیں۔" لومڑ نے کہا۔

"بہت اچھا۔" خرگوش نے کہا، "ایسا کرو کہ اب کے تم مع اپنے بچّوں اور بھابی لومڑی کے ہمارے ہاں اتوار کو کھانا کھاؤ۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں، مگر جو کچھ بھی ہم سے ہو سکے گا تمھاری خاطر اچھی طرح سے کریں گے۔"

لومڑ نے کہا، "اب کے اتوار کی دعوت مجھے منظور ہے۔ ہم سب لوگ ضرور آویں گے۔"

اتوار کے روز خرگوش اور خرگوشنی بہت سویرے اُٹھ بیٹھے اور اپنے باغیچے میں گئے۔ وہاں سے انھوں نے عمدہ عمدہ سبزی اور ترکاری چُن چُن کے توڑی۔ کچن میں آکے خرگوش نے اپنے بچّوں کی مدد سے بہت عمدہ کھانا لومڑ اور اس کی فیملی کے لیے تیار کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد خرگوش کا ایک چھوٹا سا بچّہ ہانپتا ہوا گھر کے پچھواڑے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا، "ماں! ماں! لومڑ اِدھر ہمارے گھر کے پیچھے آرہا ہے۔"

خرگوش اور خرگوشنی نے کھانا سجا کے میز پر رکھا، بچّوں کو جمع کیا اور لومڑ کا انتظار کرنے لگے۔ عرصہ گزر گیا، مگر لومڑ گھر کے اندر نہ آیا۔ تب خرگوش نے آہستہ سے گھر کے پچھواڑے کی طرف جا کے دیکھا۔ واقعی لومڑ ایک دیوار کے پیچھے دُبک کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی دُم دیوار سے باہر نظر آرہی تھی۔ خرگوش دل ہی دل میں مسکرایا، سبزی ترکاری کہاں کھائیں گے! دبک کے بیٹھے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اِدھر سے گزرے تو اسے چٹ کر جائیں۔

خرگوش نے جلدی سے گھر کا دروازہ بند کیا۔ چوں کہ اب اُسے لومڑ کی بری نیت معلوم ہو چکی تھی وہ میز بجا بجا کے گانے لگا:

تا تا تھیّا، تا تا تھیّا
جدھر دیکھی لومڑ کی دُم
اُدھر بیٹھے لومڑ بھیّا
تا تا تھیّا، تا تا تھیّا

لومڑ نے جلدی سے اپنی دُم کی طرف دیکھا تو دیوار سے ذرا باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ خرگوش آج اس کے ہاتھ نہ آئے گا۔ لومڑ چپکے سے اُٹھ کے اپنے گھر چلا گیا۔ وہاں جا کے اس نے اپنے ایک لڑکے کو چٹھی دے کر خرگوش کے گھر بھیجا۔ چٹھی میں لومڑ نے یہ لکھا تھا کہ وہ اتفاقیہ بیمار ہو گیا ہے، اس لیے آج اتوار کو دعوت میں نہ آسکے گا اور بی لومڑی اس کا ئیر دبانے میں مصروف ہے، اس لیے وہ بھی معافی چاہتی ہے، لیکن اچھا ہو اگر اس دعوت کے بدلے میں اگلے اتوار کو خرگوش لومڑ کے ہاں دعوت قبول کرے۔

خرگوش نے لومڑ کے گھر دعوت قبول کر لی اور جب دوسرا اتوار آیا تو اس نے نئے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کی اور چھڑی ہاتھ میں لے کر لومڑ کے گھر دعوت کھانے چلا۔

خرگوش جونہی لومڑ کے گھر کے قریب پہنچا، اُس کے کانوں میں لومڑ کے کراہنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ خرگوش نے دروازے پر پہنچ کر دیکھا کہ لومڑ ایک کرسی پر کمبل اوڑھے بیٹھا ہے اور کراہ رہا ہے۔ قریب ہی ایک میز پر اسٹو رکھا ہے اور اسٹو کے اوپر ایک برتن میں گھی گرم ہو رہا ہے اور قریب ہی میز پر ایک تیز چاقو رکھا ہے۔ چاقو دیکھتے ہی خرگوش دروازے میں رُک گیا۔

"آداب عرض ہے لومڑ بھیا۔"

"آداب خرگوش بھائی! اندر تشریف لائیے نا۔" لومڑ نے کہا، "میرے تو پیٹ میں درد ہے، اُٹھ نہیں سکتا۔"

خرگوش نے چاقو کی طرف دیکھ کر کہا، "آہا! معلوم ہوتا ہے آج دعوت میں مُرغ پکے گا۔"

"ہاں آج تمھیں مرغ کھلائیں گے، اندر آجاؤ نا۔" لومڑ نے بڑی بے تابی سے کہا۔

"مرغ تو مجھے بہت پسند ہے۔" خرگوش نے دروازے پر کھڑے کھڑے جواب دیا، "مگر میں مرغ کو چقندر کے ساتھ کھانا پسند کرتا ہوں۔ آپ یہیں بیٹھیے، آپ کے پیٹ میں درد ہے۔ میں باغیچے سے چقندر لے آتا ہوں۔ جب لومڑ نے دیکھا کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو وہ اپنا درد وغیرہ سب بھول کے خرگوش کے پیچھے بھاگا، مگر خرگوش تب تک بہت دُور نکل چکا تھا۔ اس نے لکڑی کے ایک بہت بڑے گٹھے پر چقندر رکھ دیے اور دُور ہی سے انھیں دِکھا کے لومڑ سے کہنے لگا، "بھیا لومڑ جی! یہ چقندر میں نے یہاں رکھ دیے ہیں۔ انھیں مرغ کے ساتھ پکا کر تم خود کھا لو۔" یہ کہہ کر خرگوش نے چھلانگیں لگائیں اور نظروں سے غائب ہو گیا۔

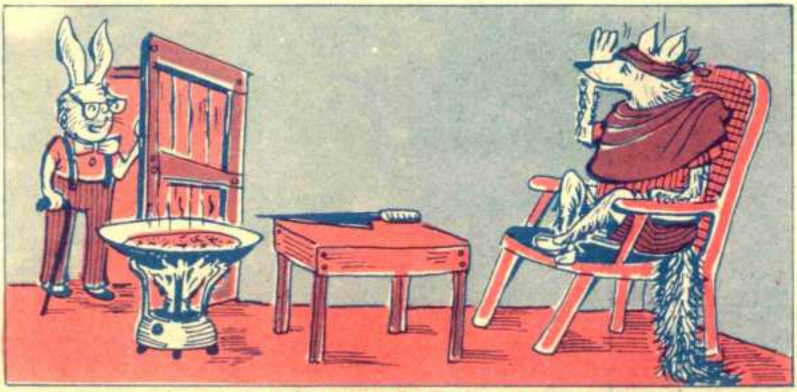

لومڑ پیٹ میں درد کا بہانہ بنا کر خرگوش کو اندر بُلانے کی کوشش کرنے لگا۔

لومڑ نے غصّے سے دانت پیس لیے۔ مگر کیا کرتا، اس کا یہ وار بھی خالی گیا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ لومڑ بڑا چالاک جانور ہوتا ہے۔ اب کے اس نے ایک ایسی ترکیب سوچی جس سے واقعی خرگوش پھنس گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز لومڑ کو سڑک کے کنارے کولتار کا ایک ڈرم پڑا ہوا مل گیا۔ لومڑ نے اس میں سے بہت سی تارکول نکال لی اور اس کا ایک کھلونا بنایا۔ یہ کھلونا بالکل ایک انسان کے بچّے کی شکل کا تھا۔ وہی منھ، وہی ہاتھ پاؤں، وہی کان۔ لومڑ نے اس کے سر پر ایک ٹوپی رکھی۔ اسے جاکٹ اور نیکر پہنائی۔ پھر اُسے سجا کے راستے پر ایک چٹان کے سہارے بٹھا دیا اور خود قریب کی جھاڑیوں میں چُھپ گیا۔ یہ راستہ خرگوش کے گھر سے نکلتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خرگوش اپنے بچّوں اور بیوی سے رخصت ہو کر سگار منھ میں دابے سڑک پر ہو لیا۔ چلتے چلتے جب اس نے سڑک کے کنارے اس عجیب و غریب کالے جانور کو دیکھا تو اس نے ٹوپی اُٹھا کے اسے سلام کیا اور پوچھا:

"کہیے، مزاج کیسا ہے؟"

مگر کالا جانور چپ رہا۔ خرگوش نے پھر بات کی:

"موسم تو آج عمدہ دکھائی دیتا ہے۔"

مگر کولتار کا جانور پھر بھی خاموش رہا۔ قریب ہی لومڑ اور بھی جھاڑیوں کے پیچھے دبک گیا۔ خرگوش دو قدم چل کر کالے جانور کے اور قریب آگیا اور ذرا غصّے سے بولا:

"بہرے ہو؟ کیا اونچا سُنتے ہو؟"

مگر کولتار کے بنے ہوئے انسان نُما کھلونے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر خرگوش نے اور بھی خفا ہو کے کہا، "یہ کہاں کی تہذیب ہے، ہم سلام کریں آپ جواب نہ دیں اور خاموش بیٹھے رہیں۔ مجھے بدتمیز جانور ذرا پسند نہیں۔ اگر اب کے آپ نے ٹھیک سے جواب نہ دیا تو میں آپ کے مزاج درست کر دوں گا۔ سمجھے؟ دیکھیے، اب کے میں پھر آپ سے آداب عرض کروں گا۔ آپ کو جواب دینا ہو گا، تمیز سے، شرافت سے، تہذیب سے۔ اگر آپ نے جواب نہ دیا تو میرا گھونسا آپ کو تہذیب سکھائے گا۔"

خرگوش نے دو تین بار آداب کیا، مگر کالا بچّہ جو کول تار کا بنا ہوا تھا کیسے جواب میں آداب کہتا۔ اس پر خرگوش کو غصّہ آ گیا۔ اس نے بڑھ کر ایک گھونسا جو کولتار کے بے بی کو مارا تو اس کے ہاتھ کول تار کے اندر پھنس گیا اور وہیں دھنس گیا۔ خرگوش نے چلّا کے کہا، "میرا ہاتھ چھوڑو، ورنہ میں دوسرے ہاتھ سے گھونسا لگاؤں گا۔" اب کے پھر کولتار کے جانور نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں جھاڑیوں میں چھپا ہوا لومڑ خوشی سے مسکرا دیا۔

خرگوش نے لپک کر دوسرے ہاتھ سے گھونسا مارا۔ وہ ہاتھ بھی کول تار کے اندر گھُس گیا اور وہیں پھنس گیا۔ اب تو خرگوش بہت گھبرایا، مگر اس نے ہمّت نہ ہاری۔ اس نے گرج کے کہا، "چھوڑو میرے ہاتھ ورنہ میں اپنے سَر سے ٹکّر مار کر تمھارا سر پھوڑ دوں گا۔" مگر جب کول تار کے جانور نے اس کے ہاتھ نہ چھوڑے تو خرگوش نے غصّے میں آ کے اسے زور سے اپنے سر سے ٹکّر ماری جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خرگوش کا سَر بھی کول تار کے گولے میں الجھ کے رہ گیا۔

اب لومڑ جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے اور ہنس کر کہا، "آداب عرض کرتا ہوں خرگوش بھائی۔ کہیے مزاج کیسا ہے؟"

خرگوش کے ہاتھ پاؤں سَر سب کول تار میں پھنسے ہوئے تھے اور وہ کچھ کر نہ سکتا تھا۔ نہ کسی طرح بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا تھا۔

لومڑ خوشی کے مارے ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے سڑک پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ بولا، "بھائی خرگوش، اب کے دعوت خوب رہے گی۔ اب کے میں تمھیں تمھارے دیے ہوئے چقندر کے ساتھ کھاؤں گا۔ واہ! واہ کیا مزا آئے گا!"

خرگوش نے ڈر کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی جان بچانے کی ترکیب سوچنے لگا مگر کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لومڑ نے کہا، "اب کے تم بُرے پھنسے ہو۔ اچھا تم لٹکے رہو۔ میں تو

جاتا ہوں ذرا لکڑیاں اکٹھی کر لوں۔ اب کے تو میں تمھیں بغیر برتن میں گھی ڈالے لکڑیوں ہی پر بھون کے کھا جاؤں گا۔"

خرگوش نے سہم کر کہا، "لومڑ بھیا، تم مجھے ہر طرح سے سزا دے سکتے ہو۔ مجھے بھون کے، کاٹ کے، چبا کے کھا سکتے ہو۔ مگر مجھے خدا کے واسطے ان کانٹوں والی جھاڑیوں میں نہ پھینکنا۔ ان کے لمبے لمبے کانٹے میری نازک جلد میں چھری کی طرح گڑ جائیں گے اور میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔ لومڑ کب سے خرگوش سے بدلا لینے کی سوچ رہا تھا۔ کتنی بار اسے خرگوش سے ہار ماننی پڑی تھی۔ آج جب خرگوش اس کے قبضے میں تھا تو اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ اس نے جب خرگوش کی بات سنی تو اپنا ارادہ بدل دیا۔ بولا، "لکڑیاں اکٹھی کرنے کی محنت کون کرے۔ میرا خیال ہے میں تمھیں رسی سے باندھ کر اس درخت پر پھانسی دے دوں گا۔"

"ہاں بھیا، مجھے تم پھانسی دے دو۔ مجھے تم پانی میں اُس کے گہرے پانی میں پتھر باندھ کر پھینک دو، مجھے آگ پر زندہ جلا دو، مگر مجھے خدا کے لیے ان تیز تیز کانٹوں والی جھاڑیوں میں نہ پھینکو وہاں تو ایک ہزار ایک کانٹے میرے جسم میں چُبھ جائیں گے اور میں تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر ان میں جان دے دوں گا اور جو بھی تمھارا جی چاہے کر لو بس ایک مجھے وہاں مت پھینکو۔"

تب لومڑ نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا، "تمھیں وہیں پھینکوں گا اور ایسی ہی بڑی موت ماروں گا، جس سے تم بچنا چاہتے ہو۔" اتنا کہہ کر لومڑ نے خرگوش کو ایک ٹانگ سے پکڑ کر زور سے جُھلایا

خرگوش نے عجیب و غریب جانور کو دیکھ کر ٹوپی اُتارتے ہوئے سلام کیا۔

اور اُسے کانٹوں والی جھاڑی میں زور سے پھینک دیا۔ خرگوش دھڑام سے کانٹوں والی جھاڑیوں میں جا گرا اور لومڑ نے سوچا، اب خرگوش کے چلّانے کی آواز آئی، اب آئی، مگر جب کئی منٹ گزر گئے اور کوئی آواز نہ آئی تو لومڑ بھاگ کے جھاڑی کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ جھاڑی خالی ہے صرف کول تار کا بچّہ جھاڑی میں اُلجھا پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے کانوں میں آواز آئی، "آداب عرض کرتا ہوں لومڑ بھائی۔"

اس نے دیکھا کہ دُور جنگل میں لکڑی کے ایک کُندے پر خرگوش بیٹھا ہوا بڑے اطمینان سے کول تار اپنے بالوں سے چھُڑا رہا ہے اور ہنس رہا ہے۔ خرگوش نے کہا، "بھائی لومڑ، کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ خرگوش کے بچّے بچپن ہی سے کانٹوں والی جھاڑیوں میں کھیلا کرتے ہیں۔ کانٹوں والی جھاڑیوں میں گرنا ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

لومڑ کو اپنی غلطی پر بڑا غصہ آیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی دُم اپنی بغل میں دبائی اور وہاں سے منھ پھیر کے رخصت ہو گیا۔

خرگوش کے بہت سے جانور دشمن تھے۔ وہ سب جانور جن کے دانت، پنجے اور مونچھیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ وہ سب جانور خرگوش کے دشمن تھے۔ بھیا لومڑ اور چچا ریچھ اور ماموں جان بھیڑیا، یہ سب لوگ خرگوش کے دشمن تھے۔ ان کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی طرح سے خرگوش کو پکڑ کے کھا جائیں۔ مگر خرگوش بہت چالاک تھا۔ ہمیشہ ان کے جال سے بچ نکلتا تھا۔ اس لیے اُوپر ہی اوپر سے دکھاوے کے لیے یہ جانور خرگوش سے محبّت جتاتے تھے۔ اس کے گھر میں کبھی کبھار آ جاتے تھے۔ کبھی دوسرے جانوروں کے گھر پر بھی ملتے تو بڑی خوش اخلاقی سے اور کبھی کسی جانور کے گھر پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ لوگ خرگوش کے پکّے دشمن ہیں۔ ویسے بھی جنگل کے قانون کے تحت کسی جانور کے گھر پر کسی جانور کو پکڑ کے مار دینا منع تھا۔ اس لیے یہ لوگ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ خرگوش انھیں کسی کھیت میں یا جنگل میں یا سڑک پر اکیلا مل جائے تو اسے ختم کر دیں۔ ایک خرگوش ہی پر کیا موقوف ہے۔ جنگل میں جتنے کم زور اور چھوٹے جانور تھے سب ان وحشیوں اور ظالموں سے ڈرتے تھے اور ان سب کم زور اور چھوٹے جانوروں پر جنگل کے ان درندوں کی نظر رہتی تھی، اور یہ لوگ کبھی ان غریب جانوروں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ خرگوش کو یہ کم زور اور چھوٹے جانور بہت پسند کرتے تھے، کیوں کہ وہ بڑا ہمت والا چالاک تھا اور اکثر ان بڑے جانوروں کو اپنی عقل سے

خرگوش کا ئر کول تار کے پتلے سے لگتے ہی لومڑ جھاڑیوں سے نکل آیا۔

زک دے دیتا تھا۔ اس لیے وہ سب لوگ اسے پسند کرتے تھے اور اکثر چھوٹے چھوٹے جانور بڑے بڑے جانوروں کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

خرگوش نے جو کئی بار اوپر تلے لومڑ بھیا کو شکست دی تو لومڑ ذرا بے وقوف سے نظر آنے لگے اور جنگل کے جانوروں میں ان کی عزت کم ہو گئی۔ اب لومڑ اس تاک میں رہنے لگے کہ خرگوش نے تو انھیں بے وقوف بنا ہی دیا ہے اور اب اگر وہ خرگوش کو بے وقوف نہیں بنا سکتے تو کسی اور جانور کو ہی بے وقوف بنائیں، تاکہ لوگوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹ جائے۔ ایک روز لومڑ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا کچھوا آہستہ آہستہ اپنی چال چلتا ہوا پگ ڈنڈی پر جا رہا ہے۔ لومڑ آگے بڑھ کے اس کے پاس گیا اور جھک کے کہا:

"سلام پھوپا جان!"

"سلام بیٹا لومڑ۔"

بڈھے کچھوے نے کچھ گھبرا کے کہا۔

"کہیے صحت کیسی ہے؟"

"کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" کچھوے نے کھانستے ہوئے جواب دیا، "تم کیسے ہو بیٹا؟"

"اچھا ہوں آپ کی دعا سے۔" لومڑ نے مسکرا کے کہا۔ پھر اور بھی جھک کر بولا، "پھوپا جان، آپ کی آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟"

"میں ہر وقت اپنے اِرد گرد مصیبت جو دیکھتا ہوں بیٹا"، کچھوے نے جواب دیا۔ متواتر مصیبت دیکھتے رہنے سے آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔

لومڑ نے مسکرا کے کہا،" ابھی آپ نے اصلی مصیبت کہاں دیکھی ہے پھوپا جان۔ اگر آپ مصیبت دیکھنا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ آئیے۔ میں وہ آدمی ہوں جو آپ کو اصلی مصیبت دکھا سکتا ہوں۔"

"اگر تم وہ آدمی ہو، جو مجھے اصلی مصیبت دکھا سکتا ہے تو میں وہ آدمی ہوں جو اسے دیکھ سکتا ہوں۔" کچھوے نے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کہا۔

لومڑ نے کہا،" آپ خالہ آفت سے کبھی ملے ہیں؟"

"نہیں!"

"تو بس خالہ آفت ہی اصل مصیبت ہے اور خالہ آفت سے بڑی مصیبت دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"مگر میں خالہ آفت کو کہاں دیکھ سکتا ہوں؟" کچھوے نے پوچھا۔ لومڑ نے کہا" پھوپا جان، وہ سامنے جو میدان نظر آتا ہے نا آپ کو۔ وہ میدان جہاں گھاس ہی گھاس اُگی ہوئی ہے۔"

"ہاں! ہاں!" کچھوے نے دیکھ کر کہا۔

"اس میدان کے عین بیچ میں آپ چلے جائیے۔ بس آفت آجائے گی وہیں پر خالہ آفت آپ کو مل جائے گی۔"

"بہت اچھا"، کچھوے نے کہا اور میدان میں آہستہ آہستہ چل کر مرکز کی طرف جانے لگا۔ کچھوے کو معلوم تھا کہ وہ لومڑ سے تیز بھاگ نہیں سکتا ہے۔ وہ اس قدر طاقت ور بھی نہیں ہے کہ لومڑ کا مقابلہ کر سکے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لومڑ بہت چالاک ہے۔ اس سے ضرور کسی قسم کا دھوکا کر رہا ہوگا، مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لومڑ کی بات ماننے میں ہی اپنی بہتری سمجھی اور سوچا شاید قسمت کچھ مدد کرے آگے چل کر!

یہ سوچتا سوچتا کچھوا میدان کے بیچوں بیچ آگے بڑھتا گیا۔ اِدھر لومڑ جھٹ سے ایک گھر میں گیا اور ان سے پائپ سلگانے کے بہانے ماچس مانگ لایا۔ ماچس سے آگ سُلگا کے اُس نے میدان کے چاروں طرف کی گھاس کو جلا دیا۔ جلتی ہوئی گھاس کے شعلے میدان کے باہر سے میدان کے اندر کی طرف بڑھنے لگے اور دھیرے دھیرے آگ میدان کے اندر کی طرف پہنچنے لگی۔ اتفاق سے میدان کے بیچوں بیچ اس وقت خرگوش بھی سو رہا تھا۔ خرگوش ہمیشہ ایک آنکھ کھول کر سوتا ہے۔ جب اس نے

کچھوے کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھا تو جھٹ سے چھلانگ مار کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں دوستوں نے ہاتھ ملائے۔

"کہیے بھائی خرگوش، کیسے مزاج ہیں؟" کچھوے نے بڑے مہذب طریقے سے پوچھا۔

"آپ کی دعا سے اچھے ہیں، اور ہاں آپا کچھوی کی صحت اب کیسی ہے؟" خرگوش نے اس سے بھی زیادہ مہذب طریقے سے دریافت کیا۔

"اب تو ان کی صحت بہت بہتر ہے۔ دو مہینے سمندر میں رہ کر آئی ہیں، اس سے ان کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔ پچھلے سال ہم لوگ نینی تال کی جھیل میں تھے۔ وقت بہت عمدہ گزرا۔ مگر اب کے وہاں نہیں گئے۔ اب کے وہاں بڑے ناپسندیدہ لوگوں کا اژدھام ہے۔"

ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اور کچھوے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد خرگوش نے کچھوے سے ادھر آنے کی وجہ پوچھی۔ کچھوے نے بھیا لومڑ سے ملنے، اصل مصیبت کو دیکھنے اور خالہ آفت سے ملنے کا قصہ سنایا۔ خرگوش نے اپنے لمبے لمبے کان کھڑے کیے۔ اپنے نتھنوں سے ہوا کو سونگھا اور بولا "آپ نے اچھا کیا جو ادھر چلے آئے اور مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ آپ اصلی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم میدان کے بیچ میں کھڑے ہیں اور ہمارے چاروں طرف آگ پھیل چکی ہے۔

لومڑ نے کچھوے سے پوچھا، "بھو بھا جان، آپ کی آنکھیں سرخ کیوں ہیں؟"

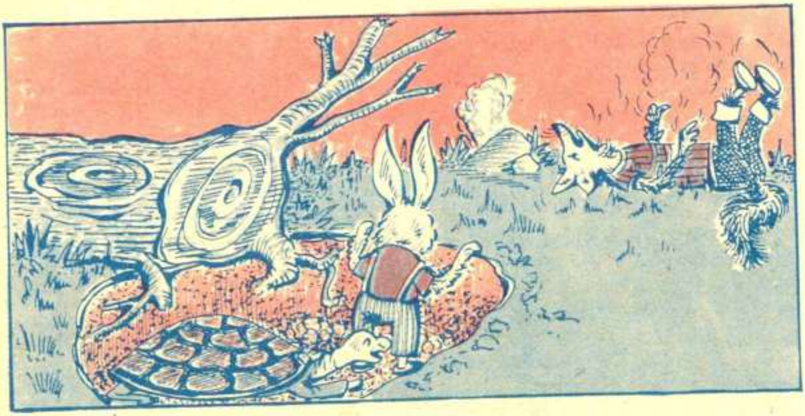

میدان کے اندر جاتے ہی لومڑ کے بدن پر چھالے پڑ گئے۔

بھیّا لومڑ ہمیں اس آگ میں زندہ بھون کے کھا جانا چاہتے ہیں۔"

کچھوا رونے لگا، "مجھے بچاؤ، کسی طرح سے مجھے اس آگ سے باہر نکالو۔ میں آگ میں جل کے مرنا نہیں چاہتا۔"

"آپ فکر نہ کیجیے۔ آپ میرے ساتھ آئیے۔" خرگوش کچھوے کو میدان کے عین بیچ میں لے گیا، جہاں درخت کا ایک تنا کٹا ہوا پڑا تھا اور اس تنے کی جڑ میں ایک بہت بڑی کھوکھی۔ خرگوش نے جلدی سے کچھوے کو اس کھو میں دھکیل دیا اور خود بھی اس کے اندر گھس گیا۔ اُن کے چاروں طرف آگ جلتی رہی اور ساری گھاس جل کے راکھ ہو گئی، مگر خرگوش اور کچھوا اس آگ سے بالکل محفوظ رہے اور انھیں کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

اِدھر میدان کے پرے لومڑ یہ سوچ سوچ کے بہت خوش تھا کہ اب تو کچھوا اس آگ میں بھُن کے سُرخ ہو گیا ہو گا اور بہت لذیذ اور کھانے کے لیے مزے دار ہو چکا ہو گا۔ لومڑ کے منھ میں یہ سوچ سوچ کے پانی بھر آیا۔ لومڑ کو اس طرح خوشی سے ٹہلتے دیکھ کر خرگوش نے آواز بدل کے زور سے کہا، "بھیا لومڑ، یہاں کچھوا ہی نہیں خرگوش بھی بھُن گیا ہے، جلدی سے آ کے کھا لو۔"

وزن اُٹھانے کا صحیح طریقہ

اکثر لوگ وزن اُٹھانے سے گریز کرتے ہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے ان کی پیٹھ یا کمر میں تکلیف ہو جاتی ہے۔ یہ شکایت جسمانی طور پر قوی افراد کو بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ ذیل میں وزنی چیزیں اُٹھانے کے بارے میں چند مفید اور آزمودہ طریقے پیش کیے جا رہے ہیں۔

زمین سے وزن اُٹھاتے وقت

صحیح

غلط

(۱) اپنے گھٹنوں کو اس طرح جھکائیے کہ آپ کی کمر نہ جھکے۔

(۲) وزن کو اس طرح اُٹھائیے کہ جھکے ہوئے گھٹنے سیدھے ہوتے جائیں اور وزن آپ کے جسم سے قریب رہے۔

بھاری صندوق اُٹھاتے وقت

صحیح

غلط

(۱) کمر کو سیدھا رکھیے اور گھٹنوں کو جھکائیے۔

(۲) صندوق یا سُوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ لیجیے۔

(۳) بکس یا سُوٹ کیس کو اس طرح اُٹھائیے کہ گھٹنے سیدھے ہوتے چلے جائیں اور کمر سیدھی رہے۔

کندھے سے اُونچے مقام پر رکھی ہوئی وزنی چیزیں اٹھاتے وقت

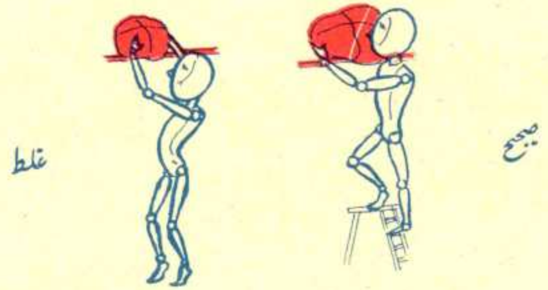

(۱) بلندی سے سامان نیچے اُتارنے کے لیے محفوظ اور چھوٹی سیڑھی استعمال کیجیے۔

(۲) وزنی چیز کو کندھے کے برابر رکھتے ہوئے جسم کی جانب کھسکائیے۔

(۳) کمر بالکل سیدھی رکھیے اور وزنی چیز کو جسم کے قریب لا کر پکڑ لیجیے۔

(۴) سیڑھی سے احتیاط کے ساتھ نیچے اُتر آئیے۔

میز سے بوجھ اُٹھاتے وقت

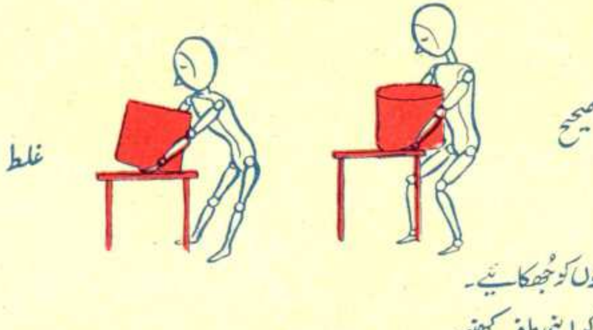

(۱) گھٹنوں کو جھکائیے۔

(۲) بوجھ کو اپنی طرف کھینچیے۔

(۳) کمر کو سیدھا رکھ کر بوجھ اُٹھائیے۔

پانی بھری بالٹیاں اٹھاتے وقت

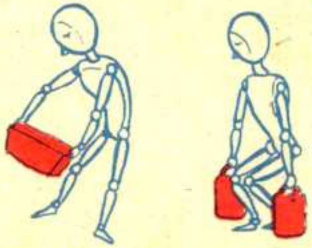

(۱) وزن کو تقسیم اور متوازن کرنے کے لیے دو بالٹیاں استعمال کیجیے۔
(۲) گھٹنوں کو جھکائیے، کمر سیدھی رکھیے۔
(۳) گھٹنوں کو سیدھا کرتے ہوئے بوجھ اُٹھائیے۔

کار کی ڈِکّی سے وزنی چیزیں اٹھاتے وقت

(۱) اگر سامان کا سائز بڑا ہو تو اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیجیے یا ایک اور شخص کی مدد حاصل کیجیے۔
(۲) گھٹنوں کو جھکائیے، کمر سیدھی رکھیے۔
(۳) اُٹھاتے وقت سامان کو جسم سے قریب رکھیے۔ بعض اوقات بوجھ سے نہیں بلکہ سامان کی جسامت (سائز) سے کمر میں تکلیف ہو جاتی ہے۔

یاد رکھیے: وزن اُٹھاتے وقت کمر جُھکنے یا مُڑنے نہ پائے۔ ہمیشہ کمر کو سیدھا رکھ کر وزن اُٹھائیے۔ ان طریقوں کو اپنا کر آپ اپنی کمر کو تکلیف اور درد سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ کمر کی تکلیف اکثر مصیبت بن جاتی ہے۔

بِن کہے

فہمیدہ عتیق

صبح میں سو کر اُٹھتی تو محلے کے سب بچے اسکول جا چکے ہوتے تھے۔ صرف چھوٹے چھوٹے بچے رہ جاتے، جن کے ساتھ کھیل کر مزہ نہیں آتا تھا۔ ایک روز امّی نے پاپا سے کہا، "اب زینو کو بھی اسکول میں داخل کروادیں، اُسے گنتی اور اردو لکھنی آگئی ہے۔ وہ انگلش کے حروف بھی پہچاننے لگی ہے۔"

لیکن پاپا چاہتے تھے کہ میں اسکول جاؤں اور میری بھی خواہش تھی کہ مجھے اسکول کی لال بس لینے آئے اور جب وہ ہارن بجائے تو بستہ لے کر دوڑتی ہوئی بس میں چڑھ جاؤں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھوں اور گھر سے اسکول تک سیر کرتی ہوئی جاؤں، لیکن امّی نے انکار کر دیا کہ زینو ابھی چھوٹی ہے۔

گاڑی رُکنے کی آواز سنتے ہی میں بھاگ کر باہر گئی۔

بیں اور اسد پانی اور پتھروں پر سے چلتے چلتے آبشار تک پہنچ گئے۔

میں اُسے اتنی دُور نہیں بھیجوں گی۔ پھر یہ کہ بس والے صبح منھ اندھیرے بچّوں کو لے کر جاتے ہیں اور دوپہر کو دو بجے واپس پہنچاتے ہیں۔

پھر یہ فیصلہ ہوا کہ میری دوست مونا محلّے کے اسکول میں جاتی ہے مجھے بھی اُس کے ساتھ داخل کر دیا جائے۔ اِس بات کی مجھے بھی خوشی ہوئی کہ اب بیں مونا کے ساتھ اسکول جایا کروں گی۔ دوسرے روز امّی مجھے اسکول لے کر گئیں۔ مِس نے ٹیسٹ لیا تو میں نے فرفر سُنا دیا۔ مِس بہت خوش ہوئیں۔ شام کو پاپا نے فارم بھر کر فیس امّی کو دے دی۔ یونیفارم بھی اسکول سے سِلا سِلایا خرید لیا۔

آج اسکول بیں میرا پہلا دن تھا۔ مونا دوسری کلاس میں تھی۔ میرا داخلہ پہلی کلاس میں ہوا تھا، لہٰذا مونا کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ میں کلاس میں گئی تو مِس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اب ذرا مجھے تسلی ہوئی۔ مِس نے سبق پڑھا کر بچّوں سے سُننا شروع کیا۔ وہ تو بہت آسان آسان پوچھ رہی تھیں۔

میں نے تو فٹافٹ سُنا دیا۔ جن بچّوں کو یاد نہیں تھا اُنھیں سزا ملی۔

ٹیفین کا وقت ہوا تو مونا اپنا لنچ بکس لے کر میری کلاس میں آگئی۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی چیزیں کھائیں۔ ابھی پانی پینے جا رہے تھے کہ وقفہ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ نل پر بہت سی لڑکیاں جمع تھیں، اس لیے ہم واپس آگئے۔ مونا اپنی کلاس میں چلی گئی اور میں مس کے قریب اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چھٹی ہوئی تو میں اور مونا گیٹ پر پہنچ گئے۔ امّی ہمیں لینے آئی تھیں۔ ایک روز میری امّی ہمیں لینے آتیں تو دوسرے دن مونا کی امّی کی باری ہوتی۔

ایک ہفتے بعد دو بچے میری کلاس میں داخلے کے لیے آئے۔ ان میں سے ایک بچّہ بہت پیارا، گول مٹول سا تھا۔ میرا دل چاہا کہ مس سے کہہ دوں کہ اُسے داخل کر لیجیے، میں اسے دوست بنالوں گی۔ جب مس ٹیسٹ لے رہی تھیں تو میں نے اللہ میاں سے دُعا مانگی کہ جو کچھ مس پوچھ رہی ہوں وہ اسے یاد ہو۔ شکر ہے اس بچّے کو داخلہ مل گیا۔ دادی اماّں کہتی ہیں، اللہ میاں بچّوں کی دُعا جلد سُن لیتے ہیں۔ اسی لیے دادی اماّں کو جب دُعا کروانی ہوتی ہے تو مجھ سے ہی کرواتی ہیں۔

نئے ساتھی کو میں نے اپنے برابر جگہ دے دی۔ وہ بھی جلدی سے میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وقفے میں، مَیں نے مونا سے اسد کا تعارف کرایا۔ اب ہم تین دوست ہو گئے تھے۔ وقفے میں ہم نے ساتھ ہی کھایا پیا۔ چھٹّی میں بھی ہم تینوں ساتھ گیٹ پر آئے۔ اسد کے گھر سے گاڑی آتی تھی۔ اس کا گھر ذرا دُور تھا۔ میں اور مونا تو پیدل ہی گھر جاتے تھے۔

میرا نام زینب النسا ہے۔ سب زینو کہتے ہیں، لیکن اسد نے مجھے زینی کہنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا بھی کہ مجھے سب زینو کہتے ہیں، تم بھی یہی کہا کرو۔ مگر وہ نہ مانا، کہنے لگا میں تو زینی ہی کہوں گا۔ میں نے سوچا کہیں یہ کُٹّی نہ کر دے۔ اس لیے میں چُپ ہو گئی۔

اسد اور میری دوستی پکّی ہو گئی۔ میری سال گرہ کے کارڈ چھپے تو میں نے مونا اور اسد کو سب سے پہلے کارڈ دیے۔ سال گرہ کی شام کو میں تیار ہو کر مہمانوں کا انتظار کر رہی تھی۔ دروازے پر گاڑی رُکنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کر گئی۔ سچ مچ اسد کی گاڑی تھی۔ ان کی امّی، پاپا، باجی اور اسد آئے تھے۔ میں ان لوگوں کو لے کر آ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے مونا نے آواز دی۔ اسے بھی ساتھ لے لیا۔ سب مہمان جمع ہو چکے تھے۔ کیک کاٹنے کی رسم ادا ہوئی۔ رنگ برنگے غبارے چھوڑے

گئے۔ بچّوں کو کیک کے ساتھ گفٹ پیکٹ بھی دیے گئے۔ فوٹو گرافر نے بہت ساری تصویریں بنائیں۔ کھانے پینے کے بعد پارسل گیم کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس میں بڑے اور بچّے سب شریک تھے۔ ایک بچّے کی امّی کے پارسل میں لکھا تھا: "دو طریقے سے رو کر دکھائیے۔" ایک صاحب کے پارسل میں سے جو پرچی نکلی تھی اس پر لکھا تھا: "کمرے میں ایک ٹانگ سے چکّر لگائیے۔" دوسری دل چسپ پرچیاں بھی تھیں۔ بڑا مزہ آیا۔ رات دس بجے تک تمام مہمان رخصت ہو گئے۔

اسد میرے لیے بالوں والی گڑیا لے کر آیا تھا، جس میں ٹیپ لگا تھا۔ اس میں دو سیل رکھ کر بٹن دبا دو تو وہ انگلش گانا گاتی تھی اور تماشا بھی کرتی جاتی تھی۔ مجھے یہ تحفہ سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔

اسکول جاتے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ بارشیں شروع ہو گئیں۔ کبھی رات کو بارش ہوتی، کبھی دن کو، مگر صبح اسکول جانے کے وقت بارش رُک جاتی، تاکہ بچّے اسکول جانے سے نہ رُک جائیں۔ ایک روز میں اسکول گئی تو اسد باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی ایک چھوٹی شیشی میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہنے لگا، لو زینی، یہ میں تمھارے لیے لایا ہوں۔ اس میں چار بڑے بڑے سُرخ رنگ کے موتی جیسے نظر آئے۔ میں نے جو ہلا کر دیکھا تو وہ چلنے لگا۔ میں ایک دم ڈر گئی، مگر شیشی نیچے نہیں پھینکی کہ اسد کیا کہے گا۔ میں نے ہمّت کر کے کہا یہ تو چل رہے ہیں۔ یہ سُن کر اسد زور زور سے ہنسنے لگا۔ جب اس کی ہنسی کم ہوئی تو اس نے بتایا کہ یہ موتی نہیں ہیں، انھیں "بیر بہوٹی" کہتے ہیں۔ یہ بارش کے دِنوں میں زمین سے نکلتی ہیں۔ ہمارے گھر کے راستے میں تو بہت ملتی ہیں۔ اسد نے شیشی کھولی اور انھیں زمین پر چھوڑ دیا۔ بیر بہوٹی کے باریک باریک پاؤں تھے۔ وہ خاصی تیز تیز چلنے لگیں۔ ان کی کھال بالکل مخمل جیسی تھی۔

ہم کلاس میں گئے تو مس آچکی تھیں۔ انھوں نے مجھے اور اسد کو دیر سے کلاس میں آنے کی وجہ سے بنچ پر کھڑا کر دیا۔ حاضری کے بعد تاکید کی کہ پھر کبھی دیر سے نہ آنا اور بٹھا دیا۔

اب میں نے مس کو بیر بہوٹیاں دکھائیں۔ انھیں بھی پسند آئیں۔ جب میں نے مس کو بتایا کہ ہم انھیں چلا کر دیکھ رہے تھے اس لیے دیر سے کلاس میں آئے تھے تو مس مسکرا دیں۔

دوسرے دن میں بیر بہوٹی لینے اسد کے ساتھ چلی گئی۔ اسکول سے چھٹّی جلدی ہو گئی تھی۔ بیر بہوٹیاں تلاش کرتے کرتے ہم دونوں بہت دُور نکل گئے۔ اسد نے بتایا کہ سامنے کمہاروں کی بستی میں ایک

آبشار گرتا ہے۔ زینی تم نے کبھی آبشار دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں؛ اب ہم دونوں اپنے اپنے بستے لٹکائے بیر بہوٹیوں کی شیشی پکڑے کمہاروں کی بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں کمہار صُراحیاں بنا رہے تھے۔ کسی گھر میں صرف بچّوں کے کھلونے بنتے دیکھے۔ ایک گھر میں کمہار صراحی بنا رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بچّی بیٹھی اس پر چوڑی کے ٹکڑوں سے بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔

ایک کمہار نے مٹّی کی ٹرین بنائی تھی۔ میں اور اسد پانی اور پتھروں پر سے چلتے چلتے آبشار تک پہنچ گئے۔ ہمیں بہت مزہ آرہا تھا۔ آبشار کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اس کے قریب بہت اُونچے اُونچے پہاڑ تھے۔ درختوں اور گھاس سے پہاڑ ہرے نظر آرہے تھے۔ ان پر بکریوں کے شریر بچّے چَر رہے تھے۔ ہم نے آبشار کے پانی سے خوب منھ ہاتھ دھویا۔ اب ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ لنچ بکس میں صرف ایک ٹوسٹ تھا۔ میں نے اور اسد نے مل کر کھا لیا۔

آبشار کے قریب رنگ برنگ کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہم دونوں انھیں جمع کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسد سے پوچھا کہ ہم کہاں آگئے ہیں۔ اب کیسے واپس جائیں گے۔ میری امّی نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ جب میں اسکول سے گھر جاتی ہوں اُس وقت ہم دونوں ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ اسد نے کہا، "دیکھو زینی، کھانا تو ہم نے بھی نہیں کھایا ہے۔ چلو اب واپس چلتے ہیں۔ امّی تو میری بھی پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

ہم نے اپنے بستے، جمع کیے ہوئے پتھر اور بیر بہوٹیوں کی شیشیاں لیں اور واپس چل دیے۔ اس بستی سے نکلتے نکلتے شام ہو گئی۔ یہ بستی سیّد پور تھی، جو اسلام آباد کے قریب ہی ہے۔ ہم سڑک پر آئے تو اسد کے پاپا بھی ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اسد یہیں آیا ہوگا، کیوں کہ جب بھی پک نِک کا پروگرام بنتا اسد سیّد پور ہی چلنے کو کہتا۔ اسے آبشار بہت پسند تھا۔ اسد کے پاپا نے ہمیں ڈانٹا نہیں، بس کہنے لگے، "اسد بیٹا اور زینی بیٹی، آپ لوگوں کو اگر یہاں آنا تھا تو ہمیں بتا دیتے۔ ہم جمعہ کو پروگرام بنا کر تمھیں سیر کرا دیتے۔ بغیر بتائے آنے سے ہم لوگوں کو پریشانی ہوتی۔ زینی کے امّی اور پاپا بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔" میں نے کہا، "نہیں انکل، ہم تو بیر بہوٹیاں تلاش کرتے کرتے یہاں پہنچ گئے تھے۔ پھر آبشار پر پانی پینے کے لیے آگئے۔ انکل، دیکھیے، ہم نے کیسے پیارے پیارے پتھر تلاش کر کے جمع کیے ہیں۔ اب میں انھیں اپنے شوکیس میں سجاؤں گی۔"

اسد کے پاپا نے ہمیں بسکٹ اور پانی دیا، مگر میں نے کچھ نہیں لیا۔ اب مجھے امّی اور پاپا بہت یاد آ رہے تھے۔ اسد کے پاپا پہلے مجھے پہنچانے ہمارے گھر آئے۔ امّی گلی میں کھڑی تھیں اور پاپا مجھے ڈھونڈنے میری سہیلیوں کے گھر گئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں پاپا بھی آ گئے۔ میں نے امّی اور پاپا کو بیر، بھوٹیاں اور پتھر دکھائے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ میں خوش تھی کہ امّی نے ڈانٹا نہیں۔

رات کو کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹی تو امّی نے کہا، "دیکھو زینو! آج تو پہلی مرتبہ بغیر بتائے ہوئے چلی گئی تھیں، آئندہ نہ جانا۔ اکیلے بچّوں کو آدمی پکڑ کر، بوری میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر سڑک پر بھیک مانگنے کے لیے ڈال دیتے ہیں۔ مارتے ہیں اور کھانے کو بھی نہیں دیتے۔ میں نے امّی سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی آپ کو بتائے بغیر نہیں جاؤں گی۔

اللہ نہ کرے اگر کوئی ہمیں پکڑ کر لے جاتا تو ہم کیسے پڑھ کر قابل بنتے۔

دوسرے دن اسکول میں ہم نے مونا کو سیر کا حال بتایا تو وہ ناراض ہو گئی کہ ہم اسے کیوں نہیں لے کر گئے۔ ہم نے اس سے وعدہ کر لیا کہ جب کبھی جائیں گے تمھیں ضرور لے کر جائیں گے۔ میں مونا کے لیے تھوڑے سے پتھر اور بیر بھوٹیاں لے آئی تھی کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو۔

پڑھائی میں میرا اور اسد کا مقابلہ تھا۔ میری لکھائی بہت اچھی تھی اس لیے میرے نمبر اسد سے زیادہ آتے تھے۔ امتحان کی میں نے خوب تیاری کی تھی، لیکن جب نتیجہ آیا تو اسد اوّل نمبر پر تھا اور میں دوئم نمبر پر تھی، مگر مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میرا دوست اوّل آیا۔

میری کلاس میں ایک لڑکا عباس تھا جو بہت شریر تھا۔ سب کو ستاتا تھا۔ کبھی کسی کا بستہ چھپا دیتا۔ کسی کی فراک میں کاغذ کی دُم لگا دیتا۔ پوری کلاس اس کی شرارتوں سے تنگ تھی۔ میں مانیٹر تھی، اس لیے مس سے شکایت کرتی تو وہ اسے سزا دیتیں، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

وہ میری اور اسد کی دوستی سے جلتا تھا۔ کہتا تھا، زینو، دیکھو میں تمھارے محلے میں رہتا ہوں مجھ سے دوستی کر لو۔ میں کہتی کہ تم شرارتیں کرنا چھوڑ دو تو میں اور اسد تمھیں بھی دوست بنا لیں گے۔

امتحان کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم گھومنے پھرنے کراچی آ گئے۔ دو ماہ بعد جب واپس اسلام آباد پہنچے تو مونا نے بتایا کہ اسد کے پاپا کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ لوگ لندن چلے گئے ہیں۔ اسد مونا سے ملنے آیا تھا تو میرے لیے پرانی تصویروں کی البم دے گیا تھا۔ مونا نے وہ مجھے دے دی۔ اسد

یہ بھی کہہ کر گیا تھا کہ جب خط لکھنا آجائے گا تو تم دونوں کو روزانہ ایک خط لکھا کروں گا۔

دن گزرتے رہے۔ کافی عرصہ ہو گیا۔ ہم اور مونا اکثر البم دیکھا کرتے اور اسد کی باتیں کرتے رہتے اور کہتے کہ کیا اب تک اسد کو خط لکھنا نہیں آیا جو ہمیں وہ خط لکھتا۔ پھر کہتے، "چلو جہاں رہے خوش رہے، کبھی نہ کبھی تو کہیں ملیں گے۔ تب شکایت کریں گے۔"

عید کا دن تھا۔ میں مونا کے ہاں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نئی صورت نظر آئی تو میں نے بھائی جان سے کہا، "آپ کا کوئی دوست ہے۔ بھائی جان گیٹ پر گئے تو اس لڑکے کو لے کر ڈرائنگ روم میں آگئے اور زور زور سے مجھے آوازیں دینے لگے، "زینو، جلدی آؤ، دیکھو کون آیا ہے۔" میں دوپٹا سنبھالتی ہوئی ڈرائنگ روم میں گئی تو مجھے جانی پہچانی صورت لگی۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ وہ خود ہی کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا اور کہنے لگا، "مجھے اسد کہتے ہیں، زینی تم کیسی ہو۔" اب تو پچھلا زمانہ ایک دم نظروں کے سامنے آگیا۔

اب تو سچ مچ میری عید ہو گئی۔ میں دوڑتی دوڑتی امی کے پاس گئی اور انھیں خوش خبری سُنائی کہ اسد کے گھر والے پاکستان واپس آگئے ہیں۔ امی بھی بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے اسد کو عیدی دی۔ میں اسد کو لے کر مونا کے ہاں گئی۔ اسے بھی اسد کے آنے کی بہت خوشی ہوئی۔ کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

کچھ دن بعد کالج کُھلے تو ہم تینوں نے ایک ہی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب ہم ساتھ مل کر پڑھتے اور نت نئی شرارتیں کرتے تھے، لیکن پڑھائی میں اب بھی ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے۔ اس طرح ہنسی خوشی یہ دن گزر رہے ہیں۔

بزم نونہال کے لیے اس کثرت سے خط آنے لگے ہیں کہ سب کا چھاپنا تو کیا پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے اور جن نونہالوں کے خط نہیں چھپتے، وہ شکایت کے خط لکھتے ہیں۔ اس طرح ہماری ڈاک اور بڑھتی ہے، اس لیے آیندہ سے نونہال دو مہینے بیچ میں چھوڑ کر خط لکھا کریں۔ مثلاً جن نونہالوں نے اگست ۸۴ء کے رسالے کے متعلق خط لکھ دیا ہے وہ اب ستمبر اور اکتوبر کے رسالے کے متعلق خط نہ لکھیں بلکہ نومبر ۸۴ء کے رسالے کے بارے میں خط لکھیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح باری باری سب کا نمبر آجائے اور شکایتیں کم ہو جائیں۔

پھوڑے پھنسی اور
خارش کا ایک علاج
مگر فساد خون سے بچنے کے لئے صافی بہتر ہے
خون میں سرایت کئے ہوئے فاسد مادے
پھوڑے پھنسیوں اور کئی دوسری جلدی بیماریوں
کو جنم دیتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے صافی باقاعدگی
کے ساتھ استعمال کیجئے۔ خون کی صفائی اور جلدی
بیماریوں سے محفوظ رہنے کا مفید ذریعہ ہے۔
SAFI
صافی
BLOOD PURIFIER
جڑی بوٹیوں
سے تیار شدہ
صافی
ہمدرد
ے خون بھی صاف، جلد بھی صاف

ایک انوکھا انٹرویو

ذہانت ، مذاق ، معلومات ، بے ساختگی
دس بچّوں کے سوالات کی بوچھار میں حکیم محمد سعید کے شگفتہ و برجستہ جوابات

جولائی کی ایک سہانی، خوش گوار شام تھی۔ ناظم آباد کے آباد علاقے میں ہمدرد سنٹر کی تین منزلہ جدید عمارت میں چند بچّے پوچھ رہے تھے، حکیم محمد سعید صاحب کا کمرا کون سا ہے؟ یہ بچّے ہمدرد نونہال کے قاری تھے اور حکیم صاحب کا انٹرویو لینے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ جی ہاں یہ بچّے حکیم صاحب کا انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ جناب حکیم محمد سعید صاحب ہمارے ملک کی بہت مشہور

اور بہت مقبول شخصیت ہیں، شاید سب سے زیادہ مقبول۔ ان کے انٹرویو آئے دن اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے اخبارات کے علاوہ دوسرے ملکوں کے اخبارات میں بھی حکیم صاحب کے انٹرویو آچکے ہیں، لیکن وہ انٹرویو بڑے بڑے صحافیوں نے لیے تھے۔ حکیم صاحب کو بچے بھی پسند کرتے ہیں اور ان کی تحریروں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کے کارناموں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ حکیم صاحب بھی بچوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس لیے بہت سے بچے حکیم صاحب سے ملنا چاہتے ہیں اور حکیم صاحب سے خود سوال کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ہمدرد نونہال کے مدیر اعلا مسعود احمد برکاتی نے تجویز رکھی کہ بچے خود حکیم صاحب کا انٹرویو لیں۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ بچے تو بہت خوش ہوئے ہی، حکیم صاحب نے بھی قبول کر لی۔

مندرجہ ذیل بچے ہمدرد سینٹر میں حکیم صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔

(۱) ثمرہ نعیم	(۲) طارق زبیری
(۳) ناہید عالم	(۴) عدنان خالد
(۵) صفیہ بانو	(۶) عامر منصور
(۷) صائمہ خالد	(۸) رعنا لطیف
(۹) سلمٰی جبیں	(۱۰) بہزاد عالم

حکیم صاحب کی میز خاصی بڑی ہے، لیکن دس بچے اس کے گرد نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس لیے حکیم صاحب اُٹھ کر خود آگے آگئے اور ان کے دونوں طرف کرسیوں پر یہ بچے بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب کے بائیں جانب برکاتی صاحب بیٹھے تھے۔ سوالات شروع کرنے سے قبل برکاتی صاحب نے بتایا کہ یہ بچے حکیم صاحب سے عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور حکیم صاحب کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اور خود حکیم صاحب کی زبانی ان کی زندگی، ان کے کاموں کے متعلق سُننا چاہتے ہیں۔ برکاتی صاحب نے کہا کہ گویا یہ ایک پینل انٹرویو ہے اور اس پینل کے سب ممبر بچے ہیں۔ حکیم صاحب مسکرائے اور کہنے لگے، "اچھا! لیکن بھئی یہ بڑے خطرے کی بات۔ معلوم نہیں یہ بچے کیا کیا سوال کر ڈالیں۔"

برکاتی صاحب نے کہا کہ جی ہاں خطرہ تو ہے اور اس کی وجہ دو نسلوں کا فرق ہے، جس کو آج کل کی زبان میں جنریشن گیپ کہتے ہیں، تاہم چوں کہ آپ بچوں سے ہمیشہ قریب رہے ہیں اور ان کی محبوب شخصیت ہیں اس لیے ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے اور نہ پہلے سے

کوئی ہدایات دی گئی ہیں، بلکہ ان کو پوری آزادی دی گئی ہے کہ جس موضوع پر جو سوال چاہے کریں، تاکہ پاکستان کے مستقبل کے لیڈروں کا ذہن سمجھنے میں مدد مل سکے۔

حکیم صاحب: جی ہاں، یہ فائدہ تو ہو گا۔ بہر حال میں حاضر ہوں۔ بچے سوالات کریں۔

سب سے پہلے عدنان خالد نے سوال داغا:

انکل! آپ صدر کے مشیر کیسے بن گئے؟

حکیم صاحب: بڑا سخت سوال کر لیا۔ بھئی مشیر اس کو کہتے ہیں جو مشورہ دے۔ مشورہ کرنا اور مشورہ دینا اچھی بات ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ حکومت چلانے کے لیے وزیروں اور مشیروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دونوں برابر ہوتے ہیں، لیکن مشیر ذرا آزاد ہوتے ہیں اور صدر کا مشیر ان لوگوں کو بنایا جاتا ہے جو کسی فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ طبِ اسلامی کی ترقی میرا مشن اور مقصد ہے۔ طب کی ترقی کے لیے مشورے دینے کو صدر صاحب نے میرا انتخاب کیا۔ میں نے اعزازی مشیر بننا قبول کر لیا، یعنی اس عہدے پر کام کرنے کا کوئی معاوضہ قبول

بائیں سے: حکیم محمد سعید، مسعود احمد برکاتی، صفیہ بانو، رعنا لطیف، سلمیٰ جبیں، صائمہ خالد۔

نہیں کیا۔ نہ مکان نہ کرایہ مکان اور آمد و رفت کا کرایہ، لیکن جب دیکھا کہ طِب کے لیے میں جس طرح کام کرنا چاہتا ہوں، اُس طرح نہیں کر سکتا تو میں وزارت سے الگ ہو گیا۔

طارق زبیری جو عدنان کے برابر بیٹھے ہوئے تھے سوال کرنے کے لیے بے چین تھے۔ چناں چہ وہ جلدی سے بول پڑے:

جس زمانے میں آپ پڑھتے تھے، اُس وقت تو طِب کا اتنا چرچا نہیں تھا، پھر آپ نے طِب کیوں پڑھی اور یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ اس سے آپ کو شہرت حاصل ہو گی۔

حکیم صاحب: بھئی بچے تو بڑی دانش مندی کے سوال کر رہے ہیں۔ میں تو گھبرایا جا رہا ہوں۔ اصل میں ہم تو بنیادی طور پر کھلاڑی ہیں۔ بہت کھیلتے تھے۔ کیا کھیل تھا جو ہم نے نہیں کھیلا۔ گنواؤں؟ پتنگ اُڑانے کا میں بڑا ماہر تھا۔ آپ جانتے ہیں مانجھا کیا ہوتا ہے۔ عدنان جلدی سے بولے، ہاں جانتے ہیں دھاگا ہوتا ہے، لیکن بہت سخت ہوتا ہے۔ اس سے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔

حکیم صاحب: کیوں کٹ جاتے ہیں؟

عدنان: سخت اور تیز ہوتا ہے نا۔

حکیم صاحب: ہاں، اس میں شیشہ ہوتا ہے۔

صفیہ: جس سے پتنگ اُڑاتے ہیں وہی ہوتا ہے نا؛ انکل، میرا بھی ہاتھ کٹ گیا تھا۔

حکیم صاحب: ہاں میرے بھی ہاتھ کٹتے تھے بہت۔ اور فُٹ بال میرا نمبر ایک کھیل ہے، میں بہت عمدہ کھیلتا ہوں۔ کرکٹ صرف ایک بار کھیلا ہے۔ بال پھینکی تو ہاتھ سُن ہو گئے۔ ہمارے کالج کی ٹیم بہت اچھی تھی۔ بیڈمنٹن، والی بال، باسکٹ بال، لوڈو۔ لوڈو تو بہت کھیلا ہے۔

عدنان: انکل! آپ لوڈو میں جیتتے تھے یا ہارتے تھے؟

حکیم صاحب: بھئی اس میں چانس ہوتا ہے اور بے ایمانی کرو تو جیت سکتے ہیں اور ہاں شطرنج بھی بہت عمدہ کھیلتا تھا۔

عدنان: انکل، آپ کو کون سا کھلاڑی اچھا لگتا ہے؟

حکیم صاحب: مجھے ہر پاکستانی کھلاڑی اچھا لگتا ہے۔ سمیع اللہ بہت اچھا کھیلتے ہیں۔

عدنان: مجھے تو منظور جونیئر بہت اچھا لگتا ہے۔

حکیم صاحب: ہاں وہ بھی اچھے ہیں، آج کل تو لاس اینجلز گئے ہوئے ہیں۔

بہزاد عالم خاموشی سے سُن رہے تھے۔ آخر انھوں نے ایک بالکل الگ سوال کر ڈالا کہ آپ کو ہمدرد نونہال نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

حکیم صاحب: آپ جانتے ہیں مجھے بچّوں سے بہت محبّت ہے۔ اب اس کا تقاضا تھا کہ بچّوں کی کوئی ٹھوس خدمت کی جائے اور ان سے باتیں کرنے کا مستقل ذریعہ نکالا جائے تو ہمدرد نونہال جاری کر دیا۔

بہزاد عالم: ہمدرد نونہال کا پہلا شمارہ دوبارہ شائع کرنا چاہیے۔

حکیم صاحب: ہاں یہ بہت اچھا خیال ہے، برکاتی صاحب غور کیجیے۔

بہزاد عالم: انکل، اس وقت کیا قیمت تھی ہمدرد نونہال کی؟

حکیم صاحب: بہت سستا تھا۔ چند آنے کا ہوتا تھا ایک شمارہ۔

برکاتی صاحب: جی ہاں، دو آنے کا تھا۔

ناہید عالم: انکل کیا سارے شمارے محفوظ ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں، کوشش تو یہی کی ہے، کیوں کہ انھی سے تاریخ بنے گی اور بچّوں کے ادب کی جو خدمت ہمدرد نونہال نے کی ہے اس کا اندازہ ہوگا۔ اس کا انتخاب بھی شائع کرنا ہے۔ دس دس سال کا انتخاب ہوگا۔ اس طرح تین جلدیں ہوں گی۔

ثمرہ نعیم: آپ ہمیشہ سفید شیروانی پہنتے ہیں، کیوں؟

حکیم صاحب: سفید کپڑا ہمارے حضورؐ کو پسند تھا۔ پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ کئی رنگوں کے کپڑے پہنے جائیں تو ہر روز سوچنا پڑتا ہے کہ آج کس رنگ کی شیروانی پہنیں۔ اس میں توجہ اور وقت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ میں صرف سفید کپڑے پہن کر اپنی توجہ اور وقت مفید کاموں کے لیے بچاتا ہوں۔

ثمرہ نعیم: واہ وا انکل، آپ کتنے اچھے ہیں۔

ناہید: کیا یونیسکو کے رسالے کے تمام ایڈیٹر مسلمان ہیں؟ اور انکل، کیا یہ رسالہ بچّوں کے لیے نہیں نکلتا؟

حکیم صاحب: نہیں، سب تو مسلمان نہیں ہیں۔ ۱۹۸۲ء کی میٹنگ میں جب میں اور برکاتی صاحب گئے تھے تو ہمارے علاوہ ہندُستان کے تامل زبان کے ایڈیٹر اور عربی کے ایڈیٹر بھی مسلمان تھے۔

باقی دوسرے مذہبوں کے ماننے والے تھے۔ بچّوں کے لیے ابھی تو یونیسکو کا رسالہ نہیں نکلتا، لیکن ۱۹۸۲ء کی میٹنگ میں غور ہوا تھا۔ مگر ابھی تک تو اس پر عمل نہیں ہو سکا۔ مشکل بھی تو بہت ہے بچّوں کا اچھا رسالہ نکالنا۔

عدنان خالد: انکل، آپ نے اتنا بڑا ادارہ کیسے قائم کر لیا؟

حکیم صاحب: ہمدرد قائم تو کیا تھا ہمارے والد حکیم عبدالمجید صاحب نے۔ یہ ان کا خواب تھا کہ ملک میں طِب اور دواسازی کا بہت بڑا ادارہ قائم ہو جو طِب اور عوام کی خدمت کرے اور اس میں ہزاروں آدمی کام کریں۔ ہم دونوں بھائیوں نے کوشش کی، محنت کی اور نیک نیتی سے کی۔ ہندُستان میں میرے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید صاحب نے، اور پاکستان میں، میں نے جدوجہد کی۔ بہت محنت کرنی پڑی مجھے اور بہت مشکلات پیش آئیں، لیکن انسان پکّا ارادہ کرے اور مقصد نیک ہو تو اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے۔ ہمارے والد اور والدۂ محترمہ کی دعائیں بھی شامل تھیں۔

عدنان: آپ کے بھائی آپ سے بھی بڑے حکیم ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں مجھ سے بہت بڑے۔ اور بھئی یہ تو لوگ کہتے ہیں کہ میں بڑا حکیم ہوں، ورنہ میں تو خود کو سب سے چھوٹا سمجھتا ہوں۔

بہزاد: انکل، آپ جاگو جگاؤ کب سے لکھ رہے ہیں؟ بہت اچھا ہوتا ہے۔

حکیم صاحب: کئی برسوں سے، اگست ۱۹۶۴ء سے۔ جاگو جگاؤ کی ایک چھوٹی سی کتاب تو شائع ہو چکی ہے۔ اب برکاتی صاحب میرے تمام جاگو جگاؤ جمع کر کے ایک اور بڑی کتاب مرتب کر رہے ہیں اور میں آج کل اس پر نظرِ ثانی کر رہا ہوں۔

صفیہ: آوازِ اخلاق جو آپ نے شروع کی ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ کیا اس میں صرف بچّے شامل ہیں؟ کتنے ممبر ہوں گے اس میں؟

حکیم صاحب: نہیں، اس میں بچّے بڑے سب شامل ہیں اور اس کے اب تک اٹھارہ ہزار ممبر بن چکے ہیں۔ جس کو بھی اخلاق بنانے سنوارنے سے دل چسپی ہے وہ اس کا ممبر بن سکتا ہے اور بن رہا ہے۔ اس میں چیف جسٹس بھی ہیں، وکیل بھی، صحافی بھی، پروفیسر بھی، طالبِ علم بھی، لیکن میرے خیال میں طالبِ علموں کی زیادہ اہمیت ہے۔ پاکستان انھی کو چلانا ہے۔

رعنا لطیف: آپ نے ساری دنیا دیکھی ہے، آپ کو کس ملک کے بچّے سب سے زیادہ پسند آئے؟

دائیں سے: حکیم محمد سعید، عدنان خالد، طارق زبیری، بہزاد عالم، ناہید عالم، ثمرہ نعیم۔

حکیم صاحب: بچّے تو مجھے سب جگہ کے ہی اچھے لگتے ہیں، لیکن پاکستان کے علاوہ چین اور کوریا کے بچّے مجھے زیادہ پیارے لگے۔ وہاں کے بچّے بہت صحّت مند ہوتے ہیں۔

سلمیٰ جبیں: انکل ہمارے ملک میں ملاوٹی چیزیں کھانے کو ملتی ہیں ورنہ ہم بھی صحّت مند ہوتے۔

حکیم صاحب: بہت صحیح بات کہی سلمیٰ نے۔ ملاوٹ کرنا بہت بڑی بات ہے۔ دوسرے ملکوں میں تو ملاوٹ کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تمام چیزیں خالص ملتی ہیں، مگر ہمارے ہاں .... کتنے شرم کی بات ہے۔

صفیہ: مگر حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے۔

صائمہ خالد: ہماری آنٹی جب اوسٹریلیا سے یہاں آتی ہیں تو یہاں کی ملاوٹی غذا سے بیمار پڑ جاتی ہیں۔

سلمیٰ: آپ کو کون سا ملک سب سے اچھا لگتا ہے۔

حکیم صاحب: پیارا تو سب سے زیادہ اپنا وطن ہی ہوتا ہے، لیکن مجھے پاکستان کے بعد ایشیا پر

چین سب سے اچھا لگا۔

ناہید عالم: انکل، آپ نے چین کا سفرنامہ بھی لکھا؟

حکیم صاحب: سفرنامہ تو نہیں لکھا، لیکن "چین میں طِب" پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے۔ چینی طب بھی بڑا مفید طریقِ علاج ہے۔ خاص طور پر ان کا سوئیوں سے علاج کا طریقہ، یعنی ایکوپنکچر۔

بہزاد: آپ کو کھانے میں کون سی چیز پسند ہے؟

حکیم صاحب: پسند تو سب ہی ہے، لیکن میں اس کا قائل ہوں کہ آدمی کھانے کے لیے زندہ نہ رہے بلکہ صرف زندہ رہنے کے لیے کھائے۔ میں نے اور میرے بھائی نے اپنی بیویوں سے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم یہ کھائیں گے اور یہ نہیں کھائیں گے، لیکن ہماری نیک بیویوں نے بھی کبھی ہمیں تکلیف نہیں دی۔

سلمیٰ جبیں: انکل، کون سی غذا مفید ہے۔

حکیم صاحب: مفید تو سب غذائیں ہیں اور صحت قائم رکھنے کے لیے سب غذائیں کھانی چاہییں۔ اور کسی ایک غذا کی کمی یا زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جو غذا کسی کو پسند ہو وہ زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے۔

سلمیٰ: انکل، آپ تو سیرِیس (سنجیدہ) معلوم ہوتے ہیں، مگر اپنی کوئی شرارت بتا دیجیے۔

حکیم صاحب: ہاں بچپن میں تو میں بہت شریر تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک آدمی نماز کے وقت ...... خیر برکاتی صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ خاص نمبر کے لیے اپنی شرارتیں لکھ دیجیے۔ شرارتیں اس میں پڑھ لینا۔

عدنان خالد: کیا طب میں سرطان کا علاج ہے؟

حکیم صاحب: ابھی تو نہیں ہے، لیکن کوشش ہو رہی ہے اور ساری دنیا میں ہو رہی ہے۔ روس اور امریکا جیسے بڑے ملکوں کے ماہرین اور ادارے اس کوشش میں ہیں کہ سرطان کا علاج دریافت کریں۔ صرف واشنگٹن میں ۲۶ ہزار جڑی بوٹیوں اور پودوں پر تحقیق ہو رہی ہے۔

صفیہ: کہتے ہیں کہ "کھیلو گے کودو گے تو ہو گے خراب۔" آپ کی کیا رائے ہے؟

حکیم صاحب: نہیں بھئی، یہ بات تو نہیں ہے۔ کھیل بھی ضروری ہے اور پڑھائی بھی، سب

اپنے اپنے وقت پر ضروری ہے۔ کھیل بھی ضروری ہے صحت کے لیے۔ میں بھی ٹینس کھیلتا ہوں۔ مجھے اس میں بہت کم لوگ ہرا سکتے ہیں۔

سلمیٰ جبیں: انکل، ٹینس کا کون سا کھلاڑی بڑا ہے؟

حکیم صاحب: کئی ہیں، سعید حئی، سعید میر، نادر خاں (ذاکر علی خاں کے بیٹے)۔ اس سال راول پنڈی کے اسلام الحق چیمپین ہیں۔

سلمیٰ: کیا ٹینس میں کسی پاکستانی نے دنیا میں نام پیدا کیا؟

حکیم صاحب: نہیں ابھی اس مرتبے پر کوئی پاکستانی نہیں پہنچا، لیکن کوشش کی جا رہی ہے۔

صفیہ: انکل، کیا آپ کے بچّوں کو بھی ٹینس پسند ہے؟

حکیم صاحب: ہماری تو ایک ہی بچّی ہے سعدیہ۔ آپ نے دیکھا نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھیں، مگر سعدیہ کو ٹینس پسند نہیں۔

صائمہ: ہمیں یہ بتائیے کہ اچھا پاکستانی بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

حکیم صاحب: اللہ اور رسول کی اطاعت کے علاوہ ماں باپ کی عزّت اور خدمت۔ پھر تمام پاکستانیوں کو بھائی سمجھنا۔ آپس میں پیار محبّت سے رہنا، نفرت کسی سے نہ کرنا۔ کسی انسان سے بھی، چاہے وہ کہیں کا ہو، کسی مذہب کا ماننے والا ہو، کسی رنگ کا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ انسان سے نہیں، اس کے بُرے کاموں سے نفرت کی جاسکتی ہے۔

ثمرہ نعیم: انکل، ہمدرد نونہال جتنا ہمیں اچھا لگتا ہے، کیا آپ کو بھی اتنا ہی اچھا لگتا ہے؟

حکیم صاحب: ہاں بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی پورا ہمدرد نونہال پڑھتا ہوں شروع سے آخر تک۔ ایک تو دل چسپ ہوتا ہے دوسرے...... دوسرے (برکاتی صاحب کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے) یہ بُرا مان جائیں گے۔ دوسرے اس لیے کہ غلطیاں نکالوں، لیکن غلطیاں بہت کم ہوتی ہیں، دو چار سے زیادہ نہیں ہوتیں۔

پیرس میں ایک بزرگ ہیں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، بہت قابل فاضل آدمی ہیں۔ میں نے پیرس میں ان کا گھر دیکھا ہے۔ چھوٹا سا کمرا ہے۔ ایک چارپائی بچھی ہوتی ہے وہیں سب کام کرتے ہیں۔ اچھی اچھی کتابیں لکھتے ہیں۔ ایک بار ہم نے اُن کو ہمدرد نونہال کا شمارہ بھیج دیا تھا۔ ان کا خط آیا کہ یہ رسالہ اتنا دل چسپ ہے کہ پورا پڑھے بغیر ہاتھ سے رکھا نہیں جاتا۔ اس لیے میرا وقت

صَرف ہو جاتا ہے، مہربانی کر کے آیندہ ہمدرد نونہال نہیں بھیجیں۔
ناہید عالم: آپ کو کون سا جانور سب سے زیادہ پسند ہے؟
حکیم صاحب: جانور؟..... جانور تو..... اوسٹریلیا کا کینگرو بہت تیز بھاگتا ہے اچھا ہوتا ہے۔ میں نے اسے پیار کیا تھا۔
سلمٰی: انکل، آپ کو سب سے زیادہ کون سا شہر پسند ہے پاکستان کا؟
حکیم صاحب: بھئی مجھے تو پشاور بہت پسند ہے۔ پشاور یونی ورسٹی بھی بہت پسند ہے۔ بڑا سکون ہے وہاں۔ علمی ماحول ہے۔
صفیہ: اور انکل، کراچی نہیں؟
حکیم صاحب: کیوں نہیں، کراچی کے کیا کہنے، مگر کراچی ہنگاموں کا شہر ہے۔
صفیہ: آپ بہت سے ملک گئے ہیں۔ کیا افریقہ بھی آپ گئے ہیں؟
حکیم صاحب: بھئی افریقہ زیادہ نہیں جا سکا۔ سوڈان گیا ہوں۔ افریقہ کی سیر کا بہت شوق ہے، لیکن وقت نہیں ملا اور نہیں ملتا۔
عامر: کیا آپ کو پاکستان کے بچّوں سے محبت ہے؟
حکیم صاحب: بہت، اسی لیے تو میں بچّوں سے ملنے کی، ان کی خدمت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پاکستان کا مستقبل یہی بچّے تو ہیں۔ ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہو جائے تو پاکستان کا بیڑا پار ہے۔
عامر منصور: کیا آپ صرف یونانی دوائیں ہی بناتے ہیں؟
حکیم صاحب: ہاں، ہم یونانی دواؤں کو مفید سمجھتے ہیں، لیکن ہم علم و فن کے معاملے میں تعصب کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اچھی بات جہاں سے بھی ملے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ طبِ جدید نے جو ترقی کی ہے وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔
ناہید: ترقی تو ہر علم میں ہو رہی ہے۔
حکیم صاحب: ہاں دنیا علم کے ہر شعبے میں ترقی کر رہی ہے۔ خاص طور پر سائنس میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ ہمیں سائنس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ آج مغرب سائنس میں، علم میں آگے ہے۔ کل ہم آگے تھے، ہم سبق دیتے تھے۔ اگر آج پھر ہم عزم کر لیں اور محنت کریں تو ہم پھر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں علم کی شمع ہو وہی لیڈر ہوتا ہے۔

طارق زبیری: آپ نے اپنے ادارے کا نام ہمدرد کیوں رکھا؟

حکیم صاحب: آپ کو ہمدرد کے معنی معلوم ہیں، دکھوں کا ساتھی، درد میں شریک، تو چوں کہ ادارے کا مقصد دکھی انسانوں کی خدمت ہے اس لیے اس کا نام بھی ہمدرد ہے۔

ثمرہ نعیم: آپ کے والد کے زمانے میں طِب زیادہ مشہور تھی یا آپ کے زمانے میں ہے؟

حکیم صاحب: اُس زمانے میں طِب سے عقیدت لوگوں کو زیادہ تھی، بیچ میں کم ہو گئی تھی، ہم نے کوشش کی اور طِب کے فوائد بتائے اور کتابیں شائع کیں تو اب پھر طِب کا چرچا خوب ہے۔ لوگ دوسرے علاج کے طریقوں سے مطمئن بھی نہیں ہیں، اس لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں طب کی طرف آرہے ہیں، لیکن آج کل مقابلہ بھی زیادہ ہے۔

رعنا لطیف: انکل، آپ نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی تھی؟

حکیم صاحب: میں نے ساری تعلیم اردو، انگریزی، فارسی اور عربی گھر پر حاصل کی ہے۔ صرف طِب طبیہ کالج دہلی میں پڑھی ہے اور جب طبیہ کالج میں داخلے کے لیے گیا تو چھوٹی عمر کی وجہ سے داخلہ نہیں مل رہا تھا۔ انگریزی بولنے کی مشق مجھے ایئر مارشل ہیکڈ انلڈ کی بیگم نے کرائی تھی۔

ناہید عالم: اب تک ہمدرد نونہال کے کتنے شمارے شائع ہو چکے ہیں؟
حکیم صاحب: بھئی حساب لگالو، ۳۱ سال ہو گئے نونہال کو نکلتے ہوئے۔ ہر سال کے بارہ شمارے ہیں۔ کل ۳۷۲ شمارے ہوئے۔

ناہید عالم: آپ کا کیا خیال ہے، ترقی ایلوپیتھی میں زیادہ ہوئی ہے یا ہومیوپیتھی میں؟
حکیم صاحب: ترقی تو ہر علم و فن میں ہوئی ہے، لیکن یہ زمانہ یورپ کا ہے، کیوں کہ یورپ کے ہاتھ میں علم کی شمع چلی گئی ہے۔ ہماری غفلت کی وجہ سے اور علم سے ہماری محبّت کم ہونے کی وجہ سے اس وقت علم کی شمع مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ شمع ہمارے ہاتھ میں ہو۔ علم کی روشنی جس کے پاس ہوگی وہی آگے بڑھے گا۔ ایک زمانہ وہ تھا اسلامی دَور جب علم میں ہم آگے تھے۔ اس دَور میں تیس لاکھ کتابیں لکھی گئی تھیں۔ چناں چہ اِس وقت دنیا بھر میں اتنی قلمی کتابیں ہیں۔

رعنا لطیف: آپ انگلش بولتے ہیں روانی سے؟ اور کون کون سی زبانیں بول لیتے ہیں؟
حکیم صاحب: بس انگریزی بول لیتا ہوں اور عربی روانی سے نہیں بول سکتا۔
عدنان: اچھا انکل، آپ فارسی بولیے۔
حکیم صاحب: (ٹھیٹھ ایرانی لہجے میں) زبانِ یارِ من فارسی و من فارسی نمی دانم۔
(سب بچّے ہنستے ہیں)
صفیہ: انکل، آپ اپنی سال گرہ کس تاریخ کو مناتے ہیں؟
حکیم صاحب: اوہو بھئی، اس طرح تو آپ کو میری عمر معلوم ہو جائے گی۔ خیر ۹۔ جنوری کو میری سال گرہ کا دن ہے۔

عدنان: اور میری سال گرہ ۱۱ جنوری کو ہوتی ہے۔
حکیم صاحب: اوہو، پھر تو آپ کے ہمارے ستارے ملتے ہیں۔ وہ تھے نا امریکا کے سابق صدر نکسن۔ وہ بھی ۹۔ جنوری کو پیدا ہوئے تھے، اس لیے اُن کی ہماری دوستی ہو گئی تھی۔
صائمہ: انکل، ہم آپ کی سال گرہ منایا کریں گے۔
حکیم صاحب: خوب، اچھا تو پھر مجھے بھی بُلا لیا کرنا۔ مزہ آئے گا کھانے میں۔
رعنا لطیف: آپ نے جو لائبریری بنائی ہے، کتنی کتابیں ہیں اس میں؟ اور کیا صرف اردو کی

کتابیں ہیں؟

حکیم صاحب: بہت تو نہیں ہیں، لیکن پچاس ہزار تو ہوں گی۔ یہاں سب زبانوں کی ہیں۔ اب لائبریری کی بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں وہاں کتابیں بہت بڑھیں گی۔ لاکھوں میں ان شاءاللہ۔

صائمہ: انکل، آپ کو کس زبان سے زیادہ دِل چسپی ہے؟

حکیم صاحب: اردو سے زیادہ ہے، ویسے دوسری زبانوں سے بھی محبّت ہے، لیکن اردو سے سب سے زیادہ محبّت ہے۔

ثمرہ نعیم: آپ کو سندھی آتی ہے؟

حکیم صاحب: ہاں، سمجھ تو خوب لیتا ہوں اور سندھ میں میرے دوست سب سے زیادہ ہیں۔

سلمیٰ جبیں: پاکستان میں سب کو باہر جانے کی فکر ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بہت کچھ ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں، لیکن یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ سب بولتے ہیں ہم باہر جائیں گے۔ آخر کیوں بولتے ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں، یہ تکلیف کی بات ہے۔ اس کی وجہ ملک سے محبّت کی کمی معلوم ہوتی ہے۔

کٹی بچّے: انکل، مگر یہاں تنخواہیں کم ملتی ہیں۔

حکیم صاحب: مگر وطن کا بھی حق ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے وطن کو ترقی نہیں دے سکتے تو پھر مال دار ہونے کا بھی کیا فائدہ؟

سلمیٰ: یہاں "جاب" بھی بہت کم ہیں، ہر جگہ سفارش بھی چل رہی ہے۔ سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہمارے حضورؐ نے طرف داری پسند نہیں کی تھی، مگر یہاں جانب داری چل رہی ہے۔

حکیم صاحب: ہاں یہ بہت بڑی بات ہے۔ جانب داری اور رشوت یا بے جا سفارش سے ملک کو نقصان ہوتا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ بچّے اس بات کو سمجھتے ہیں۔ اب آپ بڑے ہو کر غلط کام نہ کریں۔

بہزاد عالم: آپ کسی ملک جاتے ہیں اور وہاں کی زبان نہیں آتی تو انکل، آپ کیا کرتے ہیں؟

حکیم صاحب: انگریزی تو سب جگہ چل جاتی ہے۔ پھر بھی بعض وقت بڑی دِقّت پیش

آئی۔ پیرس میں ایک ہوٹل میں، میں اور برکاتی صاحب گئے۔ بہت کوشش کی، مگر جب بیرا سمجھا ہی نہیں تو اُٹھ کر چلے آئے اور روکھی ڈبل روٹی کھا کر پانی پی کر سو گئے۔ ایک دفعہ بیرے کو انڈے کا نام سمجھانے کے لیے مرغی کی آواز نکالنی پڑی تھی۔ میں ایک زمانے میں مُرغیاں بہت پالتا تھا اور لڑاتا بھی تھا۔ میں نے مرغی کی آواز نکالی تو بیرا بہت ہنسا اور فوراً انڈا لے آیا۔

صفیہ: اگر آپ کو کبھی بیرونِ ملک بکری کا گوشت کھانا ہوتا ہے تو کیا آپ بکری کی آواز نکالتے ہیں؟

حکیم صاحب: یہ تو بہت مشکل کام ہے..... ہاں ہاں، یاد آیا۔ ایسا ہوا تھا میں جب ماسکو گیا نا، روس، تو وہاں مجھے دودھ چاہیے تھا۔ اب جو لوگ ساتھ تھے وہ تو سمجھتے ہی نہیں تھے۔ تو اب بہت سمجھایا، اشارے کیے، مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر ہم بس میں جا رہے تھے تو مجھے گائے نظر آئی تو میں نے بتایا کہ مجھے وہ چاہیے۔ پھر وہ سمجھ گئے۔ اچھا یہ چاہیے آپ کو۔

سلمیٰ: انکل، ہمدرد نونہال میں بڑے بڑے رائٹر لکھتے ہیں تو وہ کیا سب خود لکھ کر بھیجتے ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں وہ خود بھی بھیجتے ہیں اور ہم بھی خط لکھتے ہیں ان کو، اُن سے درخواست کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لکھنے والوں سے مانگتے ہیں۔

سلمیٰ: جیسے علی اسد صاحب ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں، علی اسد صاحب تو بڑی محنت کرتے ہیں ہمدرد نونہال کے لیے۔ بڑی تلاش سے اچھی اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ بڑی محبت کرتے ہیں ہمدرد نونہال سے۔ حال آنکہ وہ خاصے ضعیف ہو گئے ہیں، لیکن پھر بھی اس کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ عمدہ چیزیں لکھتے ہیں۔

ناہید: انکل، جب سے ہمدرد نونہال شروع ہوا ہے برکاتی صاحب آپ کے ساتھ ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں، اس سے پہلے سے ہی ہیں۔ ہمدرد نونہال سے شروع سے وابستہ ہیں۔ تیس سال سے زیادہ عرصے سے میرے ساتھ ہیں۔

عامر منصور: آپ اسلام آباد جاتے ہیں، وہاں تو درخت بھی بہت ہیں اور سُنا ہے پھل بھی اسلام آباد میں زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔

حکیم صاحب: ہاں سبزہ تو اسلام آباد میں خوب ہے، لیکن پھل تو زیادہ نہیں ہوتے۔ پھل تو سندھ اور پنجاب میں بہت ہوتے ہیں۔ آم بھی بہت ہونے لگا ہے۔ کیلا بھی یہاں خوب ہوتا ہے۔ اب تو کیلا باہر بھی جاتا ہے۔

ثمرہ نعیم: انناس تو یہاں نہیں ہوتا نا؟

حکیم صاحب: ہاں، ہر پھل کے لیے موزوں آب و ہوا اور زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔

سلمیٰ: انکل، ہم نے ملتان پر ایک مضمون لکھا ہے۔

حکیم صاحب: اچھا۔ ملتان تو بڑا پرانا شہر ہے اور تاریخی اور اہم جگہ ہے۔ ہم بھی ملتانی ہیں۔ ہمارا خاندان چین سے پشاور گیا۔ وہاں سے ملتان آیا، ملتان سے دہلی گیا۔ جو مضمون یا کہانی بھی آپ لکھیں مختصر لکھیں، کاغذ کے ایک طرف لکھیں اور..... اور (ہنستے ہوئے) کسی کی کہانی چرائیں نہیں۔

دائیں سے: بہزاد عالم، ناہید عالم، اسماء ثمر خالد، صفیہ بانو، حکیم محمد سعید، عامر منصور، عدنان خالد، مسعود احمد برکاتی سلمیٰ جبیں، رعنا لطیف، ثمرہ نعیم، طارق زبیری۔

عدنان: آم کو پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے، مگر انکل سیب کو بھی تو پھلوں کا بادشاہ کہنا چاہیے؟

حکیم صاحب: ہاں سیب بھی بہت مفید پھل ہے۔ اس میں فولاد بھی ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ "ایک سیب روز کھاؤ اور ڈاکٹر کو بھگاؤ"۔

سلمٰی جبیں: انکل، ہم کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔ کیا آپ کو بھی ہے؟

حکیم صاحب: بھئی، ہمارا تو سارا کام ہی مطالعے پر منحصر ہے۔ مطالعے کے بغیر تو آدمی ترقی کر نہیں سکتا۔ اگر ہم نہ پڑھیں تو کام ہی کیسے چلے، میں بہت تیز مطالعہ کرتا ہوں اور بغیر کچھ پڑھے سو نہیں سکتا۔

صائمہ: انکل آپ حکیم ہیں، مگر کیا آپ کو سائنس داں پسند ہیں؟

حکیم صاحب: بڑی محبّت کرتا ہوں سائنس دانوں سے میں۔ ان کے آگے میں جُھکتا ہوں احترام سے۔

سلمٰی: آپ کو کون سا سائنس داں اچھا لگتا ہے؟

حکیم صاحب: ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ہیں۔ انھوں نے بہت کام کیا ہے۔ بہت بڑے سائنس داں ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام ہیں، انھوں نے بھی پاکستان کا نام روشن کیا ہے، اور بھی سائنس داں میرے دوست ہیں۔

ثمرہ نعیم: سُنا ہے سیب کا بدل گاجر ہے؟

حکیم صاحب: بدل ہو نہ ہو، لیکن گاجر ہے بہت مفید چیز۔ اس کو ضرور کھانا چاہیے۔ جب تک موسم رہے اور گاجر ملتی رہے اس کو کھاتے رہنا چاہیے۔

ناہید: لوگ کہتے ہیں چاول اور روٹی ایک ساتھ نہیں کھانا چاہیے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اور کیا رات کو بھی چاول کھا سکتے ہیں؟

حکیم صاحب: ہاں، دونوں چیزیں ایک وقت کھانے سے ہضم میں ذرا دِقّت ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کو تکلیف ہو جاتی ہے۔ رات کو چاول کھا سکتے ہیں۔

سلمٰی: پیاز کیسی چیز ہے؟

حکیم صاحب: پیاز بہت عمدہ چیز ہے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ یہ ضرور کھانی چاہیے۔

اچھا بھئی، اب اجازت دیں۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ ویسے آپ کی باتیں بڑی مزے دار ہیں۔ بہت لطف آیا۔ آپ نے سوالات بھی بڑے عمدہ کیے۔

سب بچے: انکل، بہت بہت شکریہ، آپ نے اپنا بڑا قیمتی وقت ہمیں دیا۔ بہت دن سے ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہم خود آپ سے مل کر آپ کے متعلق پوچھیں اور بہت سی باتیں کریں۔ آخر میں آپ ہمیں کوئی پیغام بھی دے دیجیے۔

حکیم صاحب: میرا پیغام یہ ہے کہ آپس میں محبت کریں۔ کسی انسان کو تکلیف پہنچانا بہت بڑا گناہ ہے۔ کسی سے نفرت نہ کریں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

"پاکستان سے محبت کریں، پاکستان کی تعمیر کریں" ـــــــ خدا حافظ۔

بچوں کے لیے بہترین اور معیاری کتابیں

پُر اسرار غار (کہانیاں) ہمت بڑھانے اور جوش پیدا کرنے والی کہانیاں" ایک بہادر لڑکی جو وطن کی خاطر پھانسی چڑھی، ایک کتا جس نے اندھے کو موت سے بچایا۔ اس کتاب کی کہانیاں آپ کو بھی بہادر بنا دیں گی۔ قیمت: ۳/۵۰ رُپے

ابو علی کا جُوتا (کہانیاں) حیران کرنے اور ہنسانے والی کہانیاں۔ ایک جوتے نے اپنے مالک کو جیل بھجوایا، ایک آدمی ریچھ بن کر روزی کماتا رہا۔ ایک لڑکا ۲۹ گھنٹے سمندر میں تیرتا رہا۔ سنسنی خیز اور دل چسپ۔ قیمت: ۳/۵۰ رُپے

چند مشہور طبیب اور سائنس داں اس کتاب میں ۲۴ مشہور طبیبوں، سائنس دانوں اور موجدوں کے حالات اور کارنامے درج ہیں جن میں چھے مسلمان طبیب اور سائنس داں ہیں۔ قیمت: ۵ رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی ۱۸

COLOR PRINTS !

Agfa

understands better

AGPL-384

برما کی لوک کہانی

الزام کس پر

محمد حسین حسان

یہ کہانی برما دیس کی کہانی ہے۔
برما میں ایک کسان رہتا تھا۔
اس کسان کا نام چم تھا۔
چم کے گھر کے پاس ناریل کا ایک پیڑ تھا۔
ایک دن چم ناریل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔
یہاں وہ اپنی کلہاڑی تیز کر رہا تھا۔
اتنے میں ایک گھونگھا رینگتے رینگتے اس کے پاس آیا۔
گھونگھے نے چم کے پیر میں کاٹ لیا۔
اس نے غصّے میں آکر ناریل کے پیڑ پر کلہاڑی مار دی۔
ناریل کے پیڑ کے چوٹ لگی۔
اس نے غصّے میں آکر ایک ناریل نیچے گرا دیا۔
پیڑ کے نیچے ایک مُرغ کھڑا تھا۔
یہ ناریل اس کی پیٹھ پر گد سے گرا۔
پاس ہی چیونٹیوں کا گھر تھا۔
مُرغ نے غصّے میں آکر ان کا گھر کھود ڈالا۔
چیونٹیوں میں کھلبلی مچ گئی۔
پاس ہی ایک کالا ناگ جا رہا تھا۔
چیونٹیاں غصّے میں آکر ناگ سے لپٹ گئیں
ناگ کو بھی غصّہ آگیا۔
اس نے ایک جنگلی سُور کے پیر میں ڈس لیا۔
سُور کو بڑا غصّہ آیا۔
سُور نے غصّے میں آکر اپنی تھوتھنی زمین میں گڑو دی۔
اس نے ایک اُونچی سی جھاڑی جڑ سے اکھاڑ دی۔
جھاڑی کی ایک ٹہنی سے ایک چمگادڑ لٹکی ہوئی تھی۔
یہ چمگادڑ مزے میں سو رہی تھی۔
جھاڑی اُکھڑنے پر وہ زمین پر آرہی۔
وہ بہت بے کل ہوئی اور غصّے میں آکر ہاتھی کے کان میں گھُس گئی۔
ہاتھی بے چین ہو گیا۔
پاس ہی پہاڑی پر ایک کھوکھلا پتھر تھا۔
ہاتھی نے غصّے میں آکر اس پتھر کو ڈھکیل دیا۔
پتھر لڑھکتا پڑھکتا نیچے آیا۔
نیچے ایک بُڑھیا کا گھر تھا۔
پتھر گھر کی چھت پر گرا۔ گھر ٹوٹ پھوٹ گیا۔
بڑھیا کو بہت غصّہ آیا۔ وہ بڑی زور سے چیخی:

پتھر رے پتھر، تُو نے میرا گھر ڈھا دیا، تجھے اس کی قیمت دینا ہو گی۔

پتھر نے کہا، نہیں میں کیوں دوں۔ غلطی تو ہاتھی کی تھی۔ اسی نے مجھے نیچے ڈھکیلا ہے۔

بڑھیا غصّے میں بھری ہوئی ہاتھی کے پاس گئی، اس نے کہا،

ہاتھی رے ہاتھی، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

ہاتھی نے کہا، نہیں نہیں میں کیوں دوں، غلطی تو چمگادڑ کی تھی۔ وہ میرے کان میں گھس گئی تھی۔

بڑھیا غصّے میں بھری چمگادڑ کے پاس گئی۔

وہ بولی، چمگادڑ ری چمگادڑ، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

چمگادڑ نے کہا، "نہیں نہیں، میں کیوں دوں، غلطی تو سُور کی تھی، اس نے جھاڑی جڑ سے اکھاڑ دی۔ اس پر مجھے غصّہ آگیا۔

بڑھیا غصّے میں بھری ہوئی سور کے پاس گئی۔ اس نے کہا، سور رے سور، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

سُور نے کہا، نہیں نہیں، میں کیوں دوں۔ غلطی کالے ناگ کی ہے۔ اس نے میرے پیر میں ڈسا تھا۔

بڑھیا غصّے میں بھری ہوئی کالے ناگ کے پاس گئی۔ اس نے کہا، ناگ رے ناگ، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

ناگ نے کہا، نہیں نہیں، میں کیوں دوں، غلطی تو چیونٹیوں کی ہے۔ انھوں نے میری دُم میں کاٹا تھا۔

بڑھیا غصّے سے بھری ہوئی چیونٹیوں کے پاس گئی۔ اس نے کہا، چیونٹیو ری چیونٹیو، تمھیں میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

چیونٹیاں بولیں، نہیں نہیں، ہم کیوں دیں۔ غلطی تو مُرغ کی ہے۔ اس نے اپنی چونچوں سے ہمارا گھر برباد کر دیا۔

بڑھیا غصّے میں بھری ہوئی مرغ کے پاس گئی۔ وہ بولی، مرغ رے مرغ، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

مرغ نے کہا، نہیں نہیں، میں کیوں دوں۔ غلطی تو ناریل کے پیڑ کی تھی۔ اس نے میری پیٹھ پر ناریل دے مارا۔

بڑھیا غصّے میں بھری ہوئی ناریل کے پیڑ کے پاس گئی۔ اس نے کہا، ناریل رے ناریل، تجھے میرے گھر کی قیمت دینی ہو گی۔

ناریل کے پیڑ نے کہا، نہیں نہیں، میں کیوں دوں۔ غلطی تو چم کی تھی۔ اس نے میرے تنے پر کلہاڑی ماری۔

بڑھیا غصّے میں بھری چم کے پاس پہنچی۔ اس نے کہا، چم رے چم، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

چم نے کہا، نہیں نہیں، میں کیوں دوں۔ غلطی تو گھونگھے کی تھی۔ اس نے میرے پیر میں کاٹ لیا تھا۔

بڑھیا غصّے میں بھری ہوئی گھونگھے کے پاس پہنچی۔ اس نے کہا، گھونگھے رے گھونگھے، تجھے میرے گھر کی قیمت دینا ہو گی۔

پر اب گھونگھا کس کی غلطی بتاتا، کس پر الزام دھرتا، وہ چُپ رہا۔ بوڑھی عورت چیختی رہی۔ وہ چُپکے سے چشمے میں کود گیا اور پلک جھپکتے میں تہ میں پہنچ گیا۔ جب سے برابر اس کی کھوج ہو رہی ہے، پر وہ کس منھ سے اپنی صورت دکھائے۔ وہ شرم سے منھ چھپائے چھپائے پھرتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ ان سے تو یہ گھونگھا ہی بھلا۔

اسے اپنی غلطی پر شرم تو آئی۔

صِحّت کی الف بے

مسعود احمد برکاتی

کیا کوئی پھول کی خوش بُو اور رنگ جُدا کر سکتا ہے؟ جس طرح خوش بُو اور رنگ یک جا ہوتے ہیں اسی طرح کردار اور صحت بھی یک جان ہوتے ہیں جس طرح کردار کی بنیاد چند بنیادی صفات مثلاً سچائی دیانت وغیرہ پر قایم ہے۔ صحت کے اصول سادہ اور آسان ہیں، صرف انھیں ذہن نشین کرلنے اور اُن پر عمل کی ضرورت ہے۔ صحت کی الف ب میں صحت و تن درستی کی بنیادی باتیں آسان اور دل کش انداز میں پیش کی گئی ہیں، بچّوں کے مشہور ادیب کے قلم سے۔

باتوں باتوں میں کام کی باتیں، بچّوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی مفید۔ جو شخص بھی یہ کتاب پڑھے گا وہ اپنی ایک قیمتی دَولت کی قدر اور حفاظت کر سکے گا۔

دوسرا ایڈیشن　　۶۴ صفحات　　قیمت: ۳ رُپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد ــــ کراچی ۱۸

ایشین فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کے لئے بین الاقوامی اعزازات

انٹرنیشنل ایشیا ایوارڈ سنگاپور ۱۹۸۳ء
انٹرنیشنل ایوارڈ برائے ایکسپورٹ
ایتھنز ۱۹۸۳ء اور سوئیٹزرلینڈ ۱۹۸۴ء
انٹرنیشنل فوڈ ایوارڈ اسپین ۱۹۸۴ء

مے فیئر سویٹس، ٹافیز اور ببل بنانے والے معروف ادارے ایشین فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کو اپنی اعلیٰ معیاری مصنوعات کے لئے اندرون اور بیرون ملک ہمیشہ امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔

بفضل تعالیٰ مے فیئر مصنوعات کو اُن کی اعلیٰ کوالٹی، بین الاقوامی معیار، بہترین تکنیکی صلاحیت اور وسیع تر برآمدات کے سلسلے میں چار بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا ہے جو نہ صرف ادارے بلکہ ہمارے وطن عزیز کے لئے بھی نیک نامی کا باعث ہے۔

ہم معزز کرم فرماؤں کے پُرخلوص تعاون کے لئے شکر گذار ہیں اور اس عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ ہم اپنی کنفیکشنری کی مصنوعات کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ اور برآمدات کے فروغ میں اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائیں گے۔

mayfair -the sweet favourites

ADARTS /84

اپنا ایپرن خود بنائیے

صالحہ حسن، کراچی

ایپرن پہن کر گھر کی صفائی ستھرائی کرنے سے آپ کے پہنے ہوئے کپڑے خراب نہیں ہوتے۔ ہر لڑکی کے پاس ایپرن ہونا چاہیے۔ آپ اپنا ایپرن خود بھی بنا سکتی ہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایپرن کو بھی صاف رہنا چاہیے۔ اس کے لیے آپ کے پاس دو ایپرن ہوں تو بہتر ہوں۔

ایپرن بنانے کے لیے کسی خوب صورت ڈیزائن کا یا ایک رنگ کا سادہ کپڑا لیں۔ اس کا رنگ نہ زیادہ گہرا ہو نہ بہت ہلکا۔ اپنے گھٹنوں سے کندھے تک لمبائی ناپیں۔ یہ ایپرن کی لمبائی ہوگی۔ پھر چوڑائی سینے پر سے نیچے دونوں بازوؤں کے بیچ تک ناپیں۔ ناپ پہنے ہوئے کپڑوں پر ہونا چاہیے۔ اب نپے ہوئے کپڑے کو میز پر پھیلائیں اور لمبائی کی طرف کے سرے پر اس پر ایک بیضوی شکل کا گریبان کاٹیں۔ بیضوی شکل یا گریبان اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ اس میں آپ کا سر اور گردن آسانی سے آجائے۔ پھر اوپر کے دائیں بائیں طرف کے کونے کاٹ لیں اور گلے میں ڈال کر دیکھیں کہ آیا وہ فِٹ ہے یا نہیں۔ نیز یہ کہ وہ لمبائی میں گھٹنوں تک آتا ہے یا نہیں۔ اب ٹھیک کمر کے اُس حصّے پر پنسل سے نشان کر لیں جہاں تسمے سِیے جائیں گے اور کام کے وقت وہ پیٹی کی طرح کمر پر باندھ لیے جائیں گے۔ پھر دو انچ چوڑے دوہرے کپڑے کے دو تسمے بنا کر پنسل سے نشان کی ہوئی جگہ پر ان کا ایک ایک سرا سی لیں۔ تسمے اتنے لمبے ہوں کہ وہ آسانی سے باندھ لیے جا سکیں۔ اسی کپڑے کی یا کسی دوسرے کپڑے کی جیب بھی سامنے سیدھے ہاتھ کی طرف سی لیں۔ جیب میں کام کے وقت چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد کناروں کو ایک ایک انگل موڑ کر سی لیں یا "ہیم اسٹیچ" کر لیں۔ آپ کا ایپرن تیار ہے۔

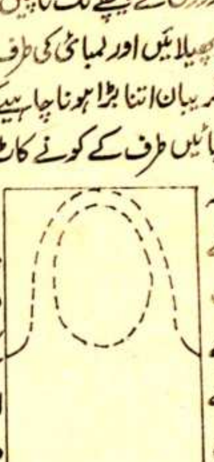

گھریلو چٹکلے

صائمہ کمال، کراچی

★ ناشتے سے پہلے ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیموں کا رس ملا کر پینے سے رنگ نکھرتا ہے۔ اور ہاضمہ اچھا رہتا ہے۔

★ بخار تیز ہو تو بکری کا دودھ ہاتھ، پاؤں، سر پر ملنے سے بخار فوراً اُتر جاتا ہے۔

★ پینٹ کے سُوکھے ہوئے برش کو گرم سرکے میں ایک گھنٹے تک بھگو دیں نرم پڑ جائے گا۔

★ لیموں کو تازہ رکھنے کے لیے اس پر سوکھا نمک رکھ دیجیے۔ لیموں ترو تازہ رہیں گے۔

★ چاولوں کو کیڑے سے محفوظ رکھنے کے لیے ان میں پسا ہوا نمک ملا دیجیے۔ ایک من چاول میں ایک سیر نمک کافی ہوگا۔

★ مرچیں پسنے یا ہری مرچیں کاٹنے سے ہاتھوں میں جلن لگ جاتی ہے۔ یہ جلن دُور کرنے کی آسان ترکیب ہے۔ تھوڑا سا نیل پانی میں ملا کر ہاتھ پر مل لیجیے۔ چند منٹ بعد دھو لیجیے جلن دُور ہو جائے گی۔ یا پھر تھوڑے سے پانی میں گُڑ کی چھوٹی ڈلی ملا کر ہاتھوں پر مل لیں۔ اس سے بھی جلن دُور ہو جاتی ہے۔

★ کھانے کی جن چیزوں میں خمیر اُٹھ سکتا ہو، ان چیزوں کو اونچی جگہ پہ نہیں رکھنا چاہیے۔ تجربہ یہ ہے کہ اس طرح خمیر جلد پیدا نہیں ہوتا۔

★ اچار میں لیموں کا عرق یا سرکہ ڈال دیا جائے تو اچار جلد خراب نہیں ہوتا۔

★ دودھ گرم کرتے وقت دیگچی میں تھوڑا سا مکھن لگا لینے سے دودھ نہیں اُبلتا۔

★ کپڑا رنگنے سے ہاتھ رنگین ہو جاتے ہیں۔ کپڑے رنگنے کے بعد اگر تھوڑا سا چونا مل کر ہاتھ دھو لیں تو رنگ چُھٹ جاتا ہے۔

★ دروازوں کی "چوں چوں" ختم کرنے کے لیے تھوڑا سا سرسوں کا تیل دروازوں کے قبضوں میں ڈال کر دروازے کو کئی دفعہ کھولنے بند کرنے سے آواز بند ہو جائے گی۔

★ اگر قبضوں میں زنگ لگا ہو تو مٹی کے تیل میں نمک ملا کر لگانے سے قبضے صاف ہو جاتے ہیں اور دوبارہ زنگ بھی نہیں لگتا۔

اقوالِ حکیم

حکیم محمد سعید کی تحریروں کے ٹکڑے

مرتبہ: عصمت علی پٹیل

★ آزادی ایک بڑی نعمت ہے۔ اچھے انسان ہر نعمت کی قدر کرتے ہیں۔ آزادی کی قدر کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ آزادی کو باقی رکھنا اور اس سے فائدہ اُٹھانا ہی آزادی کی قدر کرنا ہے۔

★ آزادی کا مطلب غربت، جہالت اور بیماری سے آزادی ہے۔ جب تک پاکستان میں سب کو علم، صحّت اور روزگار میسر نہ ہو، ہم آزادی کے قدر دان نہیں کہے جا سکتے۔

★ سب انسان برابر ہیں۔ بڑا وہ ہے، جسے علم کی نعمت حاصل ہو، جو اخلاق کی دولت سے مالا مال ہو۔ علم انسان کو بڑا بناتا ہے۔ اخلاق انسان کو مقبول بناتے ہیں۔

★ علم، صحت اور اخلاق، یہ تین دولتیں ایسی ہیں، جو انسان کے پاس ہوں تو اسے پھر کسی دولت کی ضرورت نہیں رہتی۔ دین و دنیا کی تمام دولتیں اور نعمتیں اِن تین چیزوں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

★ دوسروں کے کام آکر اور عوام کی خدمت کر کے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری طرح نہیں ہوتی۔ انسان اپنی بھلائی کے لیے جو کام کرتا ہے، وہ بھی اس کی خوشی کا باعث ہوتے ہیں، لیکن بے غرضی کے ساتھ دوسرے انسانوں کی خوشی کے لیے جو کام وہ کرتا ہے اس کے ذریعے سے سچّی اور دیرپا خوشی حاصل ہوتی ہے۔

★ اچھا عمل خود اس کے انجام دینے والے کے لیے بھی اچھا ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھلائی کا سبب بنتا ہے، کیوں کہ وہ بھی اس کو دیکھ کر ویسا ہی عمل کرتے ہیں۔ جس طرح برف خود بھی ٹھنڈا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی ٹھنڈک پہنچاتا ہے، اسی طرح اچھا عمل ہے۔

★ اخلاق و کردار کو دوسروں سے محبّت کر کے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کے احساسات و جذبات کا خاص خیال رکھیں اور کسی وقت منھ سے ایسی کوئی بات نہ نکالیں جس سے دوسروں کا دِل دُکھے۔

کھانسی کا حملہ
نزلہ زکام
کا دور
مناسب احتیاط اور سُعالین کے بروقت استعمال سے
ان تکالیف کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔ جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ
سُعالین نزلہ، زکام اور کھانسی کا مفید علاج بھی ہے
اور اُن سے بچاؤ کی تدبیر بھی۔
سُعالین
نزلہ، زکام اور کھانسی کی مفید دوا
ہمدرد
نوزو
ناک کی پھوار
ناک کے ورم، سوزش اور بندش کے لیے مفید۔
ایک پھوار ناک کھول دیتی ہے
ہمدرد دواخانہ وقف پاکستان

"بیٹے، میرے نام کی تختی کے پاس تم کیا کر رہے ہو؟"
ابو، تختی پر بلب لگا رہا ہوں۔ ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ زندگی میں کوئی ایسا کام کرو جس سے اپنے باپ کا نام روشن ہو۔

یہ کیا چکر ہے؛ کل لنگڑے بن کر اور آج اندھے بن کر بھیک مانگنے چلے آئے؟
"منے میاں، تجربے کر رہا ہوں، جس صورت میں چار پیسے زیادہ مل جائیں اُسی کو اختیار کرلوں گا۔

صحت مند نونہال

محمد رشید، بہاول نگر

طارق احمد، کراچی

مسرت علی ہادی زیدی، خیرپور میرس

جاوید احمد، کراچی

عمران علی بخاری

آفرین سلیم، کراچی

فیض اللہ، لودھراں

ارشد حسین گھانچی

محمد اقبال شاکر، لودھراں

عابد شبیر احمد قریشی، کراچی

سید واصف حسین، کراچی

عبدالجبار قریشی، ٹنڈو محمد خان

حبیب علی شاہ، کراچی

جاوید اقبال، ٹنڈو محمد خان

بنیش عرف بلی، کراچی

عبدالحق، حیدرآباد

ذوالفقار علی، کراچی

سعد رحیم خاں

افتخار احمد اعوان، کراچی

عبدالمتین، کراچی

اختر زماں اعوان، کراچی

عمران قاسم، کراچی

محمد اعجاز رفیق، کراچی

شاہد حمیدی، کراچی

محمد راشد نظیر، کراچی

عارف سعید، کراچی

محمد علی، کراچی

رضوان احمد زیدی، کراچی

اسد سعید، ہری پور

محمد وقاص سلاوٹ، کراچی

لحمیات (پروٹینز) کے وجود سے روئے زمین پر حیات ممکن ہوئی!

حیات انسانی اور صحتِ جسمانی کے لئے لحمیات (پروٹینز) خوراک کا ناگزیر حصہ ہیں۔
انسان کی انفرادیت وشخصیت اور اعمال ووظائف کی تکمیل اور
خیالات کی توانائی لحمیات کے بغیر ممکن نہیں۔ لحمینا چنیدہ جڑی بوٹیوں،
پروٹینز، کاربوہائیڈریٹس اور دیگر غذائی اجزا کا ایک متوازن مرکب ہے۔

روزانہ کے تھکا دینے والے کام جب جسم انسانی کے کل پرزوں کو کمزور
کر دیتے ہیں، تو وہ صرف پروٹینز سے دوبارہ نشوونما حاصل کرتے ہیں۔

لحمینا بجا طور پر جسم انسانی کے لئے ایک مفید اور قابلِ اعتماد
غذائی معاون ہے۔

لحمینا کا روزمرہ باقاعدگی سے استعمال جسم انسانی کی نشوونما کو
برقرار رکھتا ہے اور جسم میں توانائی پیدا کرتا ہے۔

خاندان کے ہر فرد کے لئے ایک مکمل غذائی ٹانک

لحمینا — برائے اسٹیمنا

ہمدرد

احسان کا بدلہ نہ ادا کر سکو تو شکریہ ادا کرو۔

Adarts LA-1/81

مُلّا نصر الدین کا انصاف

محمد عامر محمود

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مُلّا نصر الدین بہت عرصے کے بعد اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے کے لیے کسی دوسرے شہر گئے۔ ان کا دوست انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مُلّا کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس نے رات کے کھانے کے لیے جلدی جلدی ایک بڑی موٹی تازی بطخ کو سالم بھنوایا، پھر مُلّا، ان کا دوست اور دوست کا خاندان کھانے کے لیے بیٹھے۔ مُلّا کے دوست نے مُلّا سے کہا کہ آپ اس بطخ کے ٹکڑے کر کے پورے گھر میں تقسیم کر دیجیے۔ مُلّا نے سب سے پوچھا کہ کسی کو میرے تقسیم کرنے پر کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ جب سب کی طرف سے اطمینان بخش جواب ملا تو مُلّا نے سب سے پہلے اپنے دوست سے کہا، "آپ گھرانے کے سربراہ ہیں اس لیے بطخ کا سر آپ کی خدمت میں۔" پھر دوست کے دو بیٹوں سے بولے، "بیٹے ہی خاندان کا دست و بازو ہوتے ہیں، اس لیے تم دونوں کے لیے بھی بطخ کے بازو۔" اس کے بعد دوست کی بیٹیوں سے بولے، "بیٹیوں پر ہی گھر کھڑا ہوتا ہے، اس لیے تم دونوں کے لیے یہ بطخ کی دو ٹانگیں۔" اور سب سے آخر میں اپنے دوست کی بیگم سے کہنے لگے، "آپ ہی خاندان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے بطخ کی کمر کا حصّہ آپ کے لیے۔" اور اس طرح جو باقی بچا وہ مُلّا خود کھا گئے۔

دوسرے روز دوپہر کے کھانے میں پانچ چوزوں کا سالن تھا۔ اب پھر دوست نے مُلّا کو یہ سالن انصاف سے تقسیم کرنے کو کہا۔ چناں چہ مُلّا نے سب سے اجازت مانگی اور بولے، "آپ لوگ ان چوزوں کی تقسیم طاق اعداد میں چاہتے ہیں یا جُفت اعداد میں؟" سب نے کہا، "طاق اعداد کی صورت میں۔" اب مُلّا نصر الدین نے سب سے پہلے ایک چوزہ اپنے دوست اور اس کی بیوی کو دیتے ہوئے کہا، "آپ دونوں اور یہ ایک چوزہ کل ہوئے تین جو کہ ایک طاق عدد ہے۔" پھر ایک چوزہ دوست کے دونوں بیٹوں کو دیتے ہوئے کہا، "تم دونوں اور ایک یہ چوزہ، کل ہوئے

تین جو کہ ایک طاق عدد ہے۔" پھر ایک چوزہ دوست کی دونوں بیٹیوں کو دیتے ہوئے کہا، "تم دونوں اور یہ ایک چوزہ، کل ہوئے تین جو کہ ایک طاق عدد ہے۔" پھر بڑے اطمینان سے کہنے لگے،" اور باقی بچا ایک میں اور یہ دو چوزے، جو ملا کہ ہوئے تین، جو کہ ایک طاق عدد ہے۔"

اس طرح مُلّا نے اپنی عقل مندی سے ہر ایک کو آدھا آدھا چوزہ دیا اور خود دو چوزے ہڑپ کر گئے۔

پُراسرار غار

(کہانیاں)

مصنف

میرزا ادیب و دیگر

بہادری، جاں نثاری اور وطن کے لیے قربانی دینے کے کارنامے صرف دوسرے لوگ ہی نہیں آپ بھی انجام دے سکتے ہیں۔ اس کتاب کی کہانیوں کو پڑھیے۔ ہر کہانی آپ میں ایک نیا ولولہ بیدار کرے گی۔

★ آپ کو کتاب پڑھ کر معلوم ہوگا کہ کس طرح ایک رُوسی لڑکی نے دشمن کے مقابلے میں اپنے وطن کو کام یاب بنانے کے لیے اپنی جان کی قربانی دی۔ ★ کس طرح ترکی کی ایک بہادر خاتون جنگ کے میدان میں بم باری کے باوجود زخمی سپاہی کی تیمارداری کرتی رہی ★ اور کس طرح ایک کتے نے ایک اندھے بھکاری لڑکے کو آتش فشاں پہاڑ کے بہتے ہوئے لاوے سے بچایا۔

پُرعزم لوگوں کی ہمت و جرات کے یہ واقعات آپ کو نڈر اور بہادر بنادیں گے۔ جلد ہی کتاب لے کر پڑھیے۔

دوسرا ایڈیشن ——— ۶۴ صفحات ——— قیمت: ۳/۵۰ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد

کراچی ۱۸

کام کی لذّت

ریحانہ رجب علی

ایک شخص نے اپنے بیٹے کو ایک کارخانے میں داخل کر دیا اور تاکید کی کہ ہر شام کو جو اُجرت ملے وہ لاکر حوالے کر دے۔ لڑکے کی ماں جہالت کے ساتھ اپنے بچّے پر جان چھڑکتی تھی، اسے یہ گوارا نہیں ہوا کہ اس کا بچّہ کارخانے میں کام کرے اور محنت و مشقت کی زندگی بسر کرے۔ اس نے بچّے سے کہہ دیا: "تُو خوب کھیلا کر، میں شام کو اُجرت دے دیا کروں گی، تُو اپنے باپ کو دے دیا کرنا۔"

کچھ عرصے تک یہی ہوتا رہا۔ لڑکا دن بھر اِدھر اُدھر گشت کرتا، طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتا، شام ہوتے ہوتے گھر آجاتا، ماں سے مزدوری لیتا اور چُپ چاپ جاکر باپ کو دے آتا۔ باپ اُجرت لے کر زور سے کھڑکی کی طرف پھینک دیتا۔ گویا اس نے یہ اُجرت ضائع کر دی، لیکن آنکھ بچا کر اسے اپنے پاس رکھ لیتا اور پھر حفاظت اور احتیاط کے ساتھ ایک صندوق میں بند کر دیتا۔

اسی طرح بہت دن گزر گئے۔ یہاں تک کہ ماں کی جمع جتھا ختم ہوگئی اور اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی۔ ایک روز ماں نے اپنے بچّے کو بُلایا اور کہا: "بیٹا، میرے پاس جو کچھ پونجی تھی وہ بالکل ختم ہوگئی۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اب تُو کارخانے جایا کر، بغیر اس کے کام نہیں چلے گا۔"

باپ کے ڈر سے مجبور اُبیٹے کو ماں کی یہ بات ماننی پڑی اور وہ کارخانے جانے لگا۔ دن بھر لڑکے نے کارخانے میں کام کیا، شام کو اُجرت لے کر آیا اور باپ کو دی۔ باپ نے حسبِ معمول وہ رقم مٹھی میں لے کر کھڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ دیکھ کر وہ لڑکا چیخا: "ابّا ایسا نہ کیجیے، اسے نہ پھینکیے، یہ رقم میں نے پسینا بہا کر کمائی ہے۔ میری محنت اکارت نہ کیجیے۔"

باپ نے کہا: "بیٹے، تُو نے سچ کہا، جب تک محنت نہ کی جائے کام کی لذّت اور کام کی راحت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔" پھر باپ نے شفقت سے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار بھرے لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہا: "زندگی صرف سانس کے آنے جانے کا نام نہیں ہے۔ اصل زندگی تو فکر و عمل کی زندگی ہے۔"

Habib Bank Limited

قائم شدہ ۱۹۴۱

هم
ان کے
درخشاں
مستقبل
کے خواهاں
هیں!

حبیب بینک ایک ترقی پسند، متحرک،
جدید بینک ملک کے اندر ۱۹۰۰ سے زیادہ
اور بیرون ملک ۴۶ شاخوں، ۱۸۰۰ سے
زیادہ غیر ملکی نمائندوں، کمپیوٹر تنصیبات،
نت نئی اسکیموں اور سہولتوں کے ذریعے ملک
کے مستقبل کے لئے حتی المقدور کوشاں ہے۔
ہماری بچت کی اسکیمیں اور طالب علموں
کا مخصوص شعبہ بچوں اور طالب علموں میں
بچت کی عادت ڈالنے کے لئے ہمہ وقت
سرگرم عمل ہے۔
حبیب بینک ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے
نئی نسل کی سرپرستی کرتا ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (I)/HBL/80/1 U

manhattan international

ایمیزن کے جنگلوں میں

مناظر صدیقی

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ جنگل میں راستہ روکنے والی گھنی جھاڑیوں پر میچٹ لگنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میچٹ کسی بڑے سے چھُرے کی طرح ایک تیز دھار والا ہتھیار ہوتا ہے۔ میچٹ چلانے والے جوز، ایمیلیانو اور ان کے ساتھی تھے۔ یہ سب جنوبی امریکا کے رہنے والے لوگ تھے، جنھیں وہاں ہندی کہا جاتا ہے۔ جوز اور ایمیلیانو یورپ کے دو سیاحوں آلین اور ہیرے کو ایمیزن کے جنگلوں میں راستہ دکھانے والوں کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہ اس وقت جنگلی درختوں اور جھاڑیوں کی اُن شاخوں کو اپنے ہتھیاروں سے کاٹ رہے تھے، جو یا تو ان سیّاحوں کا راستہ روکے ہوئے تھیں یا بڑے بڑے سانپوں کی طرح اُن کے سامنے لہرا رہی تھیں۔

ایمیزن برِاعظم جنوبی امریکا کا بہت بڑا دریا ہے۔ یہ دریا جنوبی امریکا کے ملک برازیل میں واقع ہے، لیکن اس کی کئی شاخیں ہیں ان میں سے کچھ تو جنوبی امریکا کے ملک کولمبیا سے نکلتی ہیں اور کچھ ایکویڈور، پیرو، بولیویا اور کولمبیا سے۔ یہ ملک بھی برِاعظم جنوبی امریکا ہی میں ہیں۔ اس دریا کے دونوں طرف گھنے جنگل ہیں۔ ان جنگلوں میں وحشی قبیلے آباد ہیں۔ ان جنگلوں میں بعض علاقے تو ایسے ہیں جن کے متعلق ابھی لوگوں کو تفصیل سے نہیں معلوم۔ چناں چہ ۱۹۵۲ء میں یورپ سے ان جنگلوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے کچھ سیّاح کولمبیا گئے تھے۔ انھی میں آلین اور ہیرے بھی تھے۔ وہاں انھوں نے اپنی رہنمائی کے لیے کچھ ایسے ہندیوں کو اپنے ساتھ سفر میں شامل کر لیا، جو مہذب انسانوں کے تھوڑے بہت دوست بن چکے تھے۔ انھی میں جوز اور ایمیلیانو بھی تھے، جنھوں نے آلین اور ہیرے کو جنگل کے آخری سرے تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسی لیے وہ اس وقت جنگل میں ایسی جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں کاٹ رہے تھے جن کی وجہ سے راستہ رُک گیا تھا۔

آلین اور ہیرے ہندیوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ جھاڑیوں سے جھانک کر دوسری طرف بھی دیکھ لیتے، لیکن وہاں انھیں اونچے اونچے اور گھنے درختوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اُسی وقت ہیرے آلین کے پاس پہنچا اور کان میں بہت آہستہ سے کہا، "جوز کو خود بھی راستہ نہیں معلوم۔ ہم تو گواہار بیو قبیلے کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔"

ایمیزن کے جنگلوں میں رہنے والے گواہار بیو قبیلے کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بالکل وحشی قبیلہ ہے اور اجنبی آدمیوں کو دیکھتے ہی مار ڈالتا ہے۔ ہیرے کی بات سُن کر آلین نے جوز کی طرف دیکھا، لیکن جوز اپنے کام میں جُتا ہوا تھا۔ جوز کی میچیٹ ایک شاخ پر پڑی تو وہ شاخ زمین پر گِر پڑی۔ اب ایک دوسری شاخ سامنے تھی۔ اس شاخ پر نظر پڑتے ہی جوز کے ہاتھ رُک گئے، کیوں کہ سامنے ایک ایسی شاخ تھی جسے کسی نے کاٹنے کے بجائے پہلے ہی ہاتھ سے چیر دیا تھا۔ اس شاخ سے تازہ تازہ رس ٹپک رہا تھا۔ اب جوز نے پلٹ کر ہیرے اور آلین کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ یہ شاخ دیکھ کر پریشان ہو گیا ہو۔ پھر اُس نے اپنی میچیٹ سے اس چری ہوئی شاخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آلین اور ہیرے سے کہا:

"یہ شاخ کسی نے اپنے ہاتھوں سے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس علاقے میں صرف گواہار بیو قبیلہ ایسا ہے جس کے پاس میچیٹ تک نہیں ہوتے۔ ہتھیاروں میں صرف تیر کمان استعمال کرتے ہیں۔

وہی لوگ یہ شاخ توڑ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم گواہار یبو قبیلے کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔"

اس طرح جوز نے وہی بات کہہ دی تھی جس کا پیرے کو شبہ تھا، یعنی وہ اب ایک ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جس کے متعلق ۱۹۵۲ء تک لوگوں کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ جغرافیہ کی کتابوں میں اسے نامعلوم علاقہ لکھا جاتا تھا۔ جوز کی زبان سے یہ بات سُن کر آلین اور پیرے پریشان ہو گئے، کیوں کہ اس علاقے میں صرف وہی دو آدمی مہذّب تھے۔ یورپ سے ان کے ساتھ آنے والے اُن کے باقی ساتھی پیچھے رہ گئے تھے اور میکو بیٹیر قبیلے کے مہمان تھے۔

جوز جنگلوں ہی کا رہنے والا تھا۔ اس کی پریشانی کا مطلب یہ تھا کہ گواہار یبو قبیلہ واقعی وحشی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں اپنے اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ یورپ سے یہاں تک وہ صرف اسی لیے تو آئے تھے کہ ایمیزن کے گھنے جنگلوں اور ان میں رہنے والے قبیلوں کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ اب اگر وہ اس قبیلے سے ڈر کر لوٹ گئے تو یہاں تک آنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آخر اپنے دل میں کوئی فیصلہ کر کے آلین نے جوز سے کہا:

"جوز! ہم گواہار یبو قبیلے کے لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔"

جوز نے آلین کو کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اُس نے دونوں کو مشورہ دیا کہ اب انھیں اسی جگہ آرام کرنا چاہیے، کیوں کہ شام ہو چکی ہے اور جلد ہی رات ہو جائے گی۔ رات میں وہ لوگ کسی بھی وقت وحشی قبیلے کے ہاتھوں پکڑے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ اُن کے آرام کرنے کے لیے درختوں کے تنوں سے جال باندھ دیے گئے۔ دو دو درختوں سے ایک ایک جال باندھا گیا یعنی جال کا ایک سرا ایک درخت سے اور دوسرا سرا دوسرے درخت سے باندھا گیا۔ یہ جال خاص قسم کے تھے اور اس طرح بنائے گئے تھے کہ ہر جال پر ایک آدمی لیٹ سکتا تھا۔ جنگل میں سفر کرنے والوں کے لیے یہ جال اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر لیٹنے کے بعد آدمی جنگلی جانوروں سے بچ سکے۔ یہ جال درخت پر اتنے اونچے باندھے جاتے ہیں کہ کوئی جنگلی جانور اُچھل کر بھی ان جالوں تک نہ پہنچ سکے۔ آلین اور پیرے کو درختوں پر چڑھ کر ان جال نُما بستروں تک پہنچنا پڑا۔

آلین اور پیرے اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے تو جوز اپنے میکو بیٹیر قبیلے کی طرف لوٹ گیا، لیکن جوز کے بیٹے ایمیلیانو کو آلین اور پیرے نے اپنے پاس روک لیا تاکہ جوز انھیں دھوکا نہ دے سکے اور اپنے وعدے کے مطابق واپس آجائے۔ ایمیلیانو تیسرے جال پر چڑھ گیا۔

جوزے کے واپس ہونے تک آلین اور پیرے کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ لوگ رات بھر آرام سے سو بھی نہ سکے، کیوں کہ ہر طرف سے جھینگروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی جیگور کی دہاڑ بھی سنائی دیتی۔ یہ جیگور بڑا تیندوا ہوتا ہے۔ جو عام طور پر جنوبی امریکا ہی میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کے بدن پر چیتے کی طرح کالے دھبے پڑے ہوتے ہیں، لیکن قد میں چیتے سے بڑا ہوتا ہے۔ جیگور کی دہاڑ سے ان کی آنکھ کھل جاتی۔ غرض اسی طرح سوتے جاگتے پوری رات گزر گئی۔

صبح ہونے لگی تو اچانک ایک شور سنائی دیا۔ اسی شور سے ایمیلیانو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ تیزی سے اپنے جھولے میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید گواہار یبو قبیلے نے حملہ کر دیا ہے، لیکن ذرا سی دیر میں یہ شور ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد قریب بہنے والے دریا سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی کشتی میں بیٹھ کر چپّو چلا رہا ہو۔ ایمیلیانو نے کہا" چپوؤں کی آوازیں آرہی ہیں۔ شاید میرے بابا واپس آرہے ہیں۔" وہ اپنے جھولے سے اُترا اور ندی کی طرف بھاگا۔ آلین اور پیرے بھی اس کی طرف بھاگے، لیکن ندی کے قریب پہنچتے ہی ایمیلیانو ٹھٹھک گیا۔ اس نے دیکھا ایک چھوٹی سی کشتی میں ایک ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا ہوا اُن کی طرف آرہا ہے اور دریا کے دوسرے کنارے پر

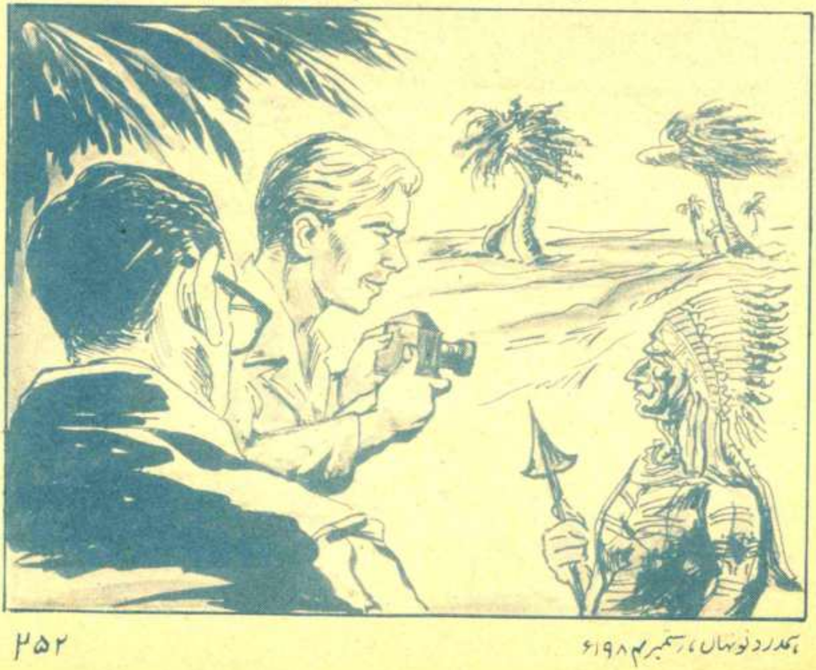

ایک اور آدمی تیر کمان لیے بیٹھا ہے، جیسے وہ کشتی میں آنے والے کی حفاظت کر رہا ہے۔ گواہار بیو قبیلے کے آدمیوں کو دیکھ کر ایمیلیانو نے چاہا کہ وہاں سے فوراً بھاگ جائے، لیکن آلین نے اسے روک لیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اُن میں سے کسی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تو گواہار بیو قبیلے والوں کو شبہ ہو جائے گا۔ پھر پیئرے نے ایمیلیانو سے کہا، "آنے والوں سے چیخ کر کہو کہ ہم اُن کے دوست ہیں۔"

ایمیلیانو نے چیخ کر گواہار بیو زبان ہی میں کچھ کہا۔ آلین اور پیئرے نے بھی اُس کی نقل کی اور اپنا سینہ پیٹ کر یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ اُن کے دوست ہیں، دشمن نہیں۔ اتنی دیر میں گواہار بیو قبیلے کے اُس آدمی نے جو دوسرے کنارے پر تیر کمان لیے بیٹھا تھا پیئرے کو اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ آدمی جو ایک چھوٹی سی کشتی میں دریا پار کر رہا تھا۔ پیئرے اور آلین کی طرف بڑھا۔ وہ قریب پہنچا تو آلین اور پیئرے نے دیکھا کہ اُس کے بدن پر مختلف رنگوں کی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ اصل میں یہ دھاریاں ایمیزن کے جنگلوں میں رہنے والے قبیلے فیشن کے طور پر بنایا کرتے تھے۔

تھوڑی دیر میں گواہار بیو قبیلے کا آدمی آلین، پیئرے اور ایمیلیانو کے قریب پہنچ گیا۔ پیئرے نے ایک سگرٹ جلائی اور تحفے کے طور پر اُس کی طرف بڑھا دی۔ اجنبی نے اُسے پینے کی کوشش کی، لیکن صرف آدھی سگرٹ منھ میں رکھ کر کاٹ لی۔ پھر اُس نے کسی عجیب زبان میں کچھ کہا۔ آلین اور پیئرے کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ البتہ ایمیلیانو سمجھ گیا۔ اُس نے دونوں کو سمجھایا کہ آنے والا سگرٹوں کا پورا پیکٹ مانگ رہا ہے۔ پیئرے نے فوراً ہی پیکٹ اُسے دے دیا۔

جنگل کے اس علاقے میں گرمی بہت تھی۔ اس گرمی کی وجہ سے آلین اور پیئرے نے صرف ایک ایک پاجامہ اور جیکٹ پہن رکھے تھے۔ سگرٹوں کا پیکٹ لینے کے بعد گواہار بیو نے اُچھل اُچھل کر پیئرے کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرنا شروع کر دیا۔ ایمیلیانو کے بتانے پر کہ گواہار بیو اُن کے کپڑے مانگ رہا ہے دونوں نے اپنی اپنی جیکٹیں اُتار کر اُسے دے دیں۔ گواہار بیو قبیلے کا آدمی یہ تحفے لے کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے ہنستے ہوئے اپنے تین تیر آلین اور پیئرے کو دیے۔ گویا یہ اُن کی طرف سے تحفہ تھا اور اس طرح دونوں میں دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد وحشی اپنی کشتی کی طرف واپس لوٹنے لگا تو پیئرے نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر اس طرح اشارہ کیا کہ جیسے وہ بتانا چاہتا ہو کہ وہ کئی دن سے بھوکا ہے۔ پیئرے کے اشارے کے جواب میں گواہار بیو نے اپنے ایک ہاتھ کو آہستہ سے دائرے کی شکل میں گھمایا، پھر سورج کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد مشرق کی طرف انگلی اٹھائی اور اپنی کشتی میں

جا بیٹھا۔ گواہار یبو کے جانے کے بعد آلبن نے ایمیلیانو سے پوچھا کہ گواہار یبو کیا کہہ رہا تھا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ وہ کل صبح اپنے پورے قبیلے کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ اب شاید ہم زندہ بچ کر نہ جاسکیں۔" ایمیلیانو نے جواب دیا۔

دوسرے دن صبح واقعی پورا قبیلہ پہنچ گیا۔ ان کے ساتھ قبیلے کا سردار جادوگر بھی تھا۔ ایمیلیانو نے آلبن کو بتادیا کہ قبیلے کا سردار کون ہے۔ آلبن اور پیرے نے سردار اور قبیلے کے آدمیوں کو دیکھ کر اس طرح ہنسنا شروع کر دیا جیسے وہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہوں۔ یہاں تک کہ قبیلے کا سردار بھی ایک بار ہنس دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں قبیلے کی عورتیں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ آلبن اور پیرے کے ساتھ رنگین کپڑے کی گانٹھیں بھی تھیں۔ قبیلے کی عورتیں اور مرد فوراً ہی ان گانٹھوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں کھول کر آپس میں تقسیم کرنے لگے۔ اُسی وقت آلبن نے پیرے سے کہا "ان لوگوں کو کسی نہ کسی مشغلے میں الجھائے رکھو ورنہ یہ لوگ ہمارے سر پھاڑ دیں گے۔"

یہ بات پیرے کی سمجھ میں آگئی۔ اُس نے انھیں مختلف کرتب دکھانے شروع کیے۔ قبیلے کے تمام لوگ ہی چھوٹے قد کے تھے۔ ان میں کوئی بھی چار یا ساڑھے چار فیٹ سے زیادہ لمبا نہیں تھا۔ آلبن اور پیرے دونوں ہی لمبے قد کے آدمی تھے۔ ان کا قد ساڑھے چھے فیٹ کے قریب تھا۔ پیرے نے ان میں سے دو تین آدمیوں کو اُوپر اُٹھایا اور پھر آہستہ سے نیچے رکھ دیا۔ اس طرح وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ بہت طاقت ور ہے۔ قبیلے کا سردار بھی چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ پیرے نے اپنا ایک ہاتھ سیدھا کر لیا اور سردار کو اشارہ کیا کہ وہ اس ہاتھ سے لٹک جائے۔ سردار نے یہ اشارہ سمجھ لیا اور ذرا سی دیر وہ پیرے کے ہاتھ سے لٹک کر جھولتا رہا۔ اب پیرے نے سوچا کہ ان سے دوستی تو ہو ہی چکی ہے اب اس چھوٹے قد کے ننگ دھڑنگ قبیلے کی تصویریں اُتار لینی چاہییں تاکہ یورپ واپس پہنچ کر لوگوں کو دکھائی جاسکیں اور دنیا کو معلوم ہو سکے کہ ایمیزن کے جنگلوں میں اب تک کس قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے سامان میں سے کیمرا نکالا۔ آلبن نے اسے تصویریں لینے سے روکنے کی کوشش کی، کیوں کہ وہ ایسے کئی قصے سُن چکے تھے کہ اس علاقے کے وحشیوں کی تصویریں اُتارنے کی کوشش کی گئی وحشیوں نے کیمرے کو کوئی خطرناک چیز سمجھ لیا اور تصویریں اُتارنے والے کو مار ڈالا۔ آلبن کے کہنے پر پیرے کو بھی یہ قصے یاد آگئے۔ اس نے کیمرا گلے میں ڈالا اور سردار کو اُٹھا کر ایک درخت کی نچلی شاخ پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد اس نے کیمرا سردار کی

طرف بڑھایا اور منظر دیکھنے والے شیشے کی طرف اشارہ کیا کہ سردار اس میں سے سامنے کا منظر دیکھے۔ ہیرے کا مقصد سردار کو یہ دکھانا تھا کہ اس آلے سے آدمی کو کتنا چھوٹا کیا جا سکتا ہے تاکہ دوستوں کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھا جا سکے۔ سردار اپنے ساتھیوں کو بہت چھوٹا چھوٹا سا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس لیے اُس نے خوشی خوشی کھڑے ہو کر کئی کئی تصویریں اتروائیں۔

آلین اور ہیرے کا مقصد تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ گواہار بیو قبیلے کو بھی بہت سے کپڑے اور تحفے مل گئے تھے۔ اس لیے وہ لوگ بھی واپس جانے لگے، البتہ لوٹتے وقت سردار کو ہیرے کے سامنے اس کا ایک پاجامہ مل گیا۔ گواہار بیو قبیلے کے لوگ کپڑے تو پہنتے ہی نہیں تھے اس لیے سردار کو معلوم ہی نہیں تھا کہ پاجامہ کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نے پاجامے کے دونوں پائنچے پھاڑ کر الگ کر دیے اور ایک پائنچے کو ٹوپی کی طرح پہن لیا۔

گواہار بیو قبیلہ تو اپنی کشتیوں پر بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جوز بھی اپنے ساتھیوں کی کشتیاں لے کر آگیا اور آلین اور ہیرے بھی واپس ہو گئے۔ پھر کئی مہینوں تک جنگل میں گھومنے کے بعد وہ یورپ واپس پہنچے۔ اس طرح ۱۹۵۲ء میں دنیا کو معلوم ہوا کہ ایمیزن کے جنگلوں میں اب تک انسان کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔

بچّوں کی کتابیں

یہ کتابیں ختم ہوگئی تھیں۔ اب اِن کے نئے ایڈیشن شائع کیے جا رہے ہیں۔ جلد ہی یہ کتابیں آپ خرید سکیں گے۔

جاگو جگاؤ ــــــ از حکیم محمّد سعید

جوہر قابل ــــــ از مسعود احمد برکاتی

البیرونی کہانی اور کارنامے ــ از خاطر غزنوی

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

ہمدرد سنٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی نمبر ۱۸

خُوباں

صحت کے لئے
ایک خُوب غذا

تازہ پھلوں اور خشک میوہ جات کا نفیس و لطیف اور خوش ذائقہ سنہرا شربت
خُوباں جس میں شامل ہاضم، مقوّی جسم و جاں اور حیات بخش اجزائے غذائی نے اسے
ایک منفرد ٹانک بنا دیا ہے۔ خُوباں دواؤں سے بڑھ کر انسانی جسم کی حقیقی
اور فطری غذائی ضرورتوں پر ہمدرد کے طویل تجربہ کا ماحصل ہے۔

خُوباں بچوں کو چاق و چوبند اور بڑوں کو چست و توانا رکھتا ہے۔
خُوباں استعمال کرنے والے بچے تعلیم اور کھیل کود میں بڑے جی جان سے حصّہ لیتے ہیں۔
صحت مند لوگوں کے لئے خُوباں کا استعمال یوں بھی مناسب ہے کہ اس سے
جسم و جاں کو خوب اجزائے غذائی میسّر آتے رہتے ہیں اور شب و روز کی ذہنی محنت
یا جسمانی مشقت سے کوئی تھکن یا سُستی پیدا نہیں ہوتی۔ لاغر اور
بیماری سے اٹھے ہوئے لوگوں کے لئے خُوباں ایک مفید اور مؤثر غذائی ٹانک ہے۔

کھلاڑیوں کے لئے خُوباں ایک ضرورت ہے۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے اس کے دو چمچے پینے سے
جسم میں مناسب طاقت و چستی پیدا ہوتی ہے اور کھیل کے بعد خُوباں توانائی بحال کرتا ہے۔

خُوباں گھر کے ہر فرد کے لئے ہر موسم میں تن درستی اور توانائی بہم پہنچاتا ہے۔
خُوباں کے دو چمچے غذا کے بعد آپ کی توانائی برقرار رکھتے ہیں۔

ہمدرد

خُوباں خوش ذائقہ سنہرا شربت

انعامی سوالات

پورے تیس سوالات کے صحیح جوابات پر مبلغ دو ہزار رُپے انعام دیا جائے گا۔ایک سے زیادہ نونہالوں کے صحیح جوابات موصول ہوئے تو انعام کی رقم برابر تقسیم کردی جائے گی۔کم سے کم ۲۵ صحیح جوابات والوں کو جناب حکیم محمد سعید کی دستخط شدہ ایک ایک کتاب دی جائے گی۔۱۶یا زیادہ صحیح جوابات والوں کی تصویریں یا نام شائع کیے جائیں گے۔ادارہ جو بھی فیصلہ کرے گا وہ قطعی اور آخری مانا جائے گا۔جوابات بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ستمبر ۸۳ء ہے سوالات کے آخر میں لگا ہوا کوپن صاف صاف بھر کر سوالات کے ساتھ بھیج دیجیے۔کوپن سوالات کے آخر میں چپکا دیجیے۔ناقص اور نامکمل تحریر کو مقابلے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سید الانصار کا لقب کسے عطا فرمایا تھا؟

۲۔ پاکستان کے پہلے صدر تو جناب سکندر مرزا تھے، دوسرے صدر کا نام بتائیے۔

۳۔ آپ قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ بتائیے قرآن کے سب سے پہلے مفسّر کون تھے؟

۴۔ کیا آپ برِاعظم افریقہ کے سب سے بڑے دریا کا نام جانتے ہیں؟

۵۔ پاکستان کے کس شہر کو سورج کا گھر کہا جاتا تھا؟

۶۔ محسن صاحب کا قد ان کی بیگم سے ایک فُٹ لمبا ہے۔اگر دونوں کے قدوں کی لمبائی جمع کی جائے تو گیارہ فیٹ چھے انچ (″۶ ۔′۱۱) ہوتی ہے۔ بتائیے بیگم محسن کا قد کتنا ہے۔

۷۔ بیٹری (ٹارچ) کے ایک عام سیل (DRY CELL) کا وولٹیج کتنا ہوتا ہے؟

۸۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ ۱۹۶۰ء میں امریکا کے صدر کون صاحب تھے؟

۹۔ بیگم حسن کی چار لڑکیاں ہیں اور اُن چاروں لڑکیوں کے ایک ایک بھائی ہے۔ بتائیے کُل کتنے بہن بھائی ہوئے۔

۱۰۔ کیا آپ کو صحیح معلوم ہے کہ "کہرام" کس زبان کا لفظ ہے؟

۱۱۔ "قاضی جی" اردو ادب کا ایک مشہور کردار ہے۔ بتائیے یہ کردار کس ادیب یا شاعر نے تخلیق کیا تھا۔

۱۲۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ کبڈّی کو کس سَنہ (سال) میں اولمپک کھیلوں میں شامل کیا گیا؟

۱۳۔ بتائیے سانپ کس پرندے کی پسندیدہ غذا ہے؟

۱۴۔ ایک لڑکی نے پولیس کو فون کیا کہ اس کی بہترین سہیلی مَر گئی۔ اس نے بتایا کہ مجھے اپنی سہیلی کا ایک خط ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خودکُشی کی۔ پولیس کے پوچھنے پر لڑکی نے بتایا کہ سہیلی کا خط اُسے اپنی بائیبل کے صفحہ ۹۳ اور صفحہ ۹۴ کے درمیان ملا ہے۔ پولیس کو لڑکی کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ کیا آپ کا ذہن کام کرتا ہے کہ پولیس کیوں یقین نہیں کر رہی ہے۔

۱۵۔ شطرنج ایک پرانا، دل چسپ اور دماغی کھیل ہے۔ اس کو پاکستان و ہندُستان کے ایک خاص دورِ حکومت میں زیادہ فروغ ملا۔ کیا آپ بادشاہوں کے اس خاندان کا نام بتا سکتے ہیں؟

۱۶۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ مراکش میں پاکستان کی سفیر رہی ہیں۔ بتایئے اُس وقت پاکستان کا صدر کون تھا؟

۱۷۔ ایک ڈاکٹر صاحب اردو کے بہت مشہور مزاح نگار ادیب بھی ہیں۔ ان صاحب کا نام اور ان کی دو کتابوں کے نام بھی بتائیے۔

۱۸۔ ایک شوہر نے بیان دیا کہ اس کی بیوی نے خواب میں دیکھا کہ وہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔ اس کی دہشت سے اس کا سوتے ہی میں انتقال ہو گیا۔ سراغ رساں شوہر کی بات کو غلط بتاتے ہیں۔ اگر سراغ رساں صحیح ہیں تو کیوں؟

۱۹۔ ایک بیرونی ملک میں ایک مشہور شخصیت نے ایک حکیم صاحب کو ڈاکٹر اوف سائنس کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ بتایئے یہ حکیم ڈاکٹر کون صاحب ہیں؟

۲۰۔ میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی اور غالب، تینوں اردو کے بڑے شاعر ہیں۔ ان تینوں میں ایک بات اور مشترک ہے۔ وہ کیا بات ہے؟

۲۱۔ "بوعلی سینا" کی کتاب "القانون فی الطب" قانون کی چند عمدہ کتابوں میں سے ہے۔ کیا یہ

بیان غلط ہے؟

۲۲۔ مشہور شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کا اصل نام کیا ہے؟

۲۳۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اولمپک کھیل کن کن شہروں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ہو چکے ہیں۔ بتائیے۔

۲۴۔ "طیورِ آوارہ" ایک کتاب کا نام ہے۔ بتائیے یہ نثر کی کتاب ہے یا نظم کی؟

۲۵۔ ایک کسان روزانہ صبح ایک انڈا کھاتا تھا، لیکن نہ اس کے پاس کوئی مرغی تھی نہ وہ انڈے خریدتا تھا اور نہ کوئی اسے مفت دیتا تھا۔ بتائیے وہ ایک انڈا روز کہاں سے کھا لیتا تھا؟

۲۶۔ گھوڑا دس سال کی عمر ہونے کے بعد کیا ہو جاتا ہے؟

۲۷۔ عورتوں کی پسلیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے یا مردوں کی؟

۲۸۔ باغ و بہار میر امن کی کتاب کا نام ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ "باغ اردو" بھی ایک کتاب کا نام ہے۔ کیا یہ خیال صحیح ہے؟

۲۹۔ کراچی میں میونسپل کمیٹی پاکستان بننے سے پہلے قائم ہوئی تھی یا بعد میں؟ اگر سنہ بھی بتا سکیں تو کیا کہنے۔

۳۰۔ جاپان کے سکّے کا نام تو آپ آسانی سے بتا سکتے ہیں۔

انعامی معلومات عامہ ۲۲۱ ۶۸۴
نام ________________
والد کا نام ________________
پتا ________________
____

آج کا نونہال - کل کا دانشور

اسے تیار کیجیے کہ فکر و شعور کا اُجالا کر سکے

قوموں کو جہالت کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے اس کے دانش ور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ کا یہ ننھا منا بچہ وطنِ عزیز کے روشن مستقبل کا امین ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس میں ایک بڑی شخصیت پوشیدہ ہے... ہوسکتا ہے کل یہ ایک دانشور کی حیثیت سے ملک و ملت کے لیے مشعلِ راہ بنے۔

اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے اور شخصیت کو نکھارنے کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے پورا کیجیے۔ اپنے بچے کی پرورش نہایت محنت، محبت اور توجہ سے کیجیے تاکہ کل یہ ایک مضبوط و توانا جسم، بہتر تعلیم اور صحت مند ذہن کے ساتھ وطنِ عزیز میں فکر و شعور کا اجالا کر سکے۔

نونہال ہربل گرائپ واٹر بچوں کی تکالیف مثلاً بد ہضمی، قبض، اپھارہ، اسہال، قے، بے خوابی، پیاس کی شدّت وغیرہ کے لیے مفید و مؤثر دوا ہے۔ دانت آنے کے زمانے میں اس کا استعمال ضروری ہے۔

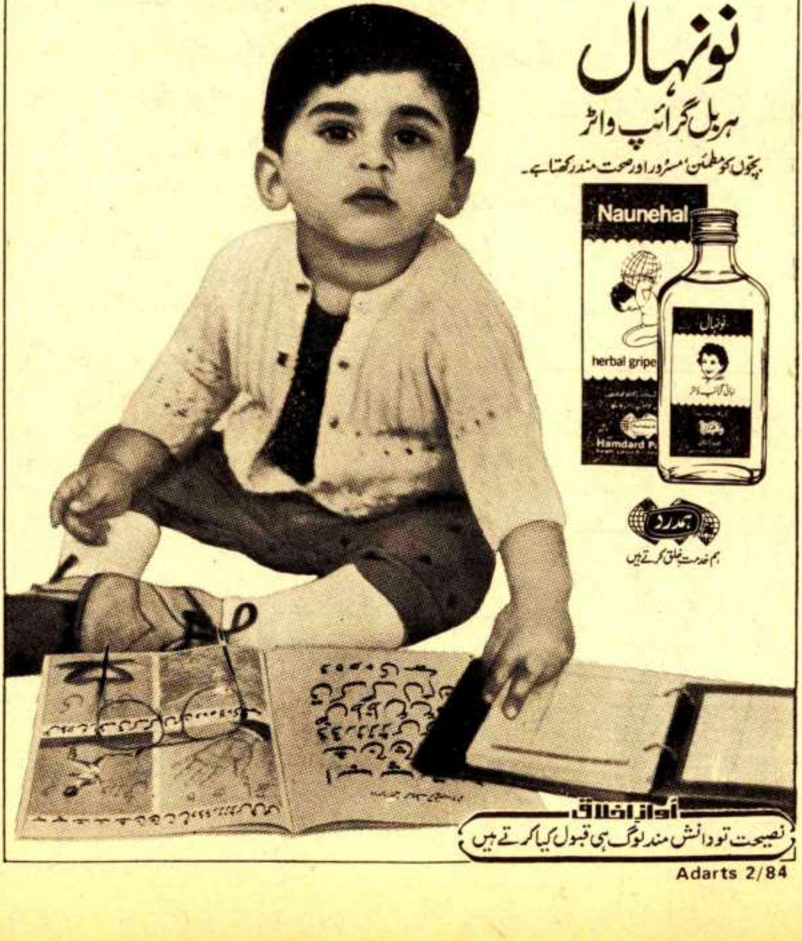

Adarts 2/84

خط کی کہانی

زبیدہ جبیں

ہم میں سے اکثر لوگوں کو ہر روز ہی اپنے کسی دوست، کسی عزیز کے خط کا انتظار رہتا ہے۔ کبھی کوئی خاص خط آنے والا ہو تب تو آنکھیں دروازے پر ہی لگی رہتی ہیں۔ دروازے کا ہر کھٹکا، گلی کی ہر آہٹ بس ڈاکیے کی آمد ہی معلوم ہوتی ہے۔

اب ذرا کسی دیہات کا ایک منظر دیکھیے ـــ آج ڈاکیے کی آمد کا دن ہے، لوگ کچّی سڑک کے کنارے، پیڑ تلے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے خط کا انتظار ہے۔ کسی کو اپنے بیٹے کے خط کا اور کسی کو اپنے دوست کے خط کا انتظار ہے۔ دُور ایک سایہ نظر آتا ہے۔ یہی ڈاکیا ہے۔

موٹے موٹے جوتے، گٹّوں سے اوپر گھٹنوں تک خاکی پٹّی کسی ہوئی، خاکی وردی اور کندھے پر تھیلا، جس میں خط بھرے ہوئے ہیں۔ آج سے اُسّی نوّے سال پہلے کا ڈاکیا یہی تھا۔ یہی ڈاکیا ہمارے دادا پَر دادا کے خط لاتا تھا، کچھ لوگوں کے لیے خوشیاں لاتا اور کچھ لوگوں کے لیے غم اور دُکھ۔

آج کل تو خط ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے پہنچ جاتے ہیں، کیوں کہ ڈاک ہوائی جہازوں، ریلوں اور موٹروں کے ذریعہ سے بھیجی جاتی ہے، لیکن کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ پرانے زمانے میں جب نہ ہوائی جہاز تھے اور نہ ریلوں اور موٹر کاروں کا وجود تھا، خط کس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے جاتے تھے۔ اس دَور میں خط بھیجنے کے کئی ذریعے تھے۔

خط پہنچانے کا ایک ذریعہ کبوتر تھے۔ یہ پالتو کبوتر سَدھائے ہوئے ہوتے تھے اور ان کبوتروں کے ذریعہ سے خط کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا تھا اور کبوتر اس فرض کو بڑی کام یابی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ پرانے زمانے میں بعض اوقات پیغام رسانی کا ایک اور طریقہ بھی استعمال کیا جاتا تھا وہ یہ کہ حبشی غلاموں کے جسم پر پیغام گُودا جاتا تھا۔ جس شخص کے پاس پیغام بھیجنا مقصود ہوتا غلام کو اس کے پاس روانہ کر دیا جاتا۔ غلام منزلِ مقصود پر پہنچتا تو مکتوب الیہ (جس کے نام خط لکھا گیا) اس کے جسم کو غور سے دیکھتا اور پیغام پڑھ لیتا۔ گویا "خط" اس تک پہنچ جاتا۔

جوں جوں انسان زندگی بسر کرنے کے بہتر طریقے سیکھتا گیا پیغام رسانی اور خطوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کے نئے طریقے اختیار کیے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران کے بادشاہ سائرس نے سب سے پہلے ڈاک کا باقاعدہ انتظام کیا۔ اُس نے جگہ جگہ چوکیاں بنوائیں۔ ایک گُھڑسوار ڈاک لے کر روانہ ہوتا، وہ دن بھر سفر کرنے کے بعد جب اگلی چوکی پر پہنچتا تو ایک اور گُھڑسوار تیار کھڑا ہوتا اور وہ ڈاک لے کر آگے روانہ ہو جاتا۔ اِس طرح ہر چوکی پر نیا گھڑسوار اگلی چوکی تک ڈاک لے جانے کے لیے تیار ہوتا۔ یوں ڈاک اپنے اصل مقام تک پہنچ جاتی۔ رات ہو یا دن، بارش ہو یا آندھی، سردی ہو یا گرمی ڈاک والوں کو بہر حال اپنا فرض انجام دینا پڑتا تھا۔ ڈاک کا یہ نظام اتنا اچھا تھا کہ آہستہ آہستہ یہ طریقہ ساری دنیا میں اپنایا جانے لگا۔ مشہور سیاح مارکو پولو نے لکھا ہے کہ چین میں جس زمانے میں قُبلائی خان کی حکومت

تھی ملک میں دس ہزار چوکیاں تھیں اور دو لاکھ گھوڑے ہر وقت تیار کھڑے رہتے تھے۔ ہر چوکی پر ایک منشی ہوتا تھا، جو آنے والے ہر کارے کی رسید دیکھ کر نئی رسید اُسے دیتا تھا۔ اس طرح پوری ڈاک کے متعلق یہ بھی معلوم رہتا تھا کہ وہ کس کس کے ہاتھ سے گزری ہے۔ مارکوپولو نے لکھا ہے کہ اُس وقت عام ڈاک دس دن کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے کر لیتی تھی۔ گھڑسوار جب کسی چوکی کے پاس پہنچتا تو زور سے نفیری بجاتا اور دوسرا گھوڑا اُس کے لیے تیار کھڑا کر دیا جاتا۔ گھڑسوار سرپٹ دوڑتا ہوا آتا اور کود کر دوسرے گھوڑے پر چڑھ جاتا۔ دریاؤں پر کشتیاں بھی بالکل تیار کھڑی رہتیں۔

مشہور مسلمان سیاح ابنِ بطوطہ نے محمد شاہ تغلق کے زمانے کی ڈاک کے بارے میں لکھا ہے کہ ملتان سے دِلّی تک کا راستہ پچاس دن میں طے ہوتا تھا، لیکن ڈاک کا انتظام اس قدر عمدہ تھا کہ خط پانچ دن میں پہنچ جاتا تھا۔ شیر شاہ سوری نے اپنے زمانے میں ڈاک کو بہتر بنانے کے لیے بہت سی سڑکیں بنوائیں۔ اگر کسی ملک میں سڑکیں زیادہ ہوں تو ڈاک کا سفر بھی آسان ہو جاتا ہے۔ شیر شاہ سوری نے اپنے دورِ حکومت میں بہت سی سرائیں بنوائی تھیں اور ان میں گھوڑے اور پیدل چلنے والے ہر کارے تیار رہتے تھے۔ اس طرح ڈاک کا سفر بہت آسانی سے اور جلدی طے ہو جاتا تھا۔ شیر شاہ سوری کے دَور میں خط کی رفتار ایک دن میں تین سو میل بتائی جاتی ہے۔

آئیے اب دیکھتے ہیں کہ یورپ میں ڈاک کا نظام کیا تھا۔ یورپ میں جب شہروں کی آبادی بڑھی اور وہاں شہروں میں کالج اور یونی ورسٹیاں قائم ہو گئیں تو تعلیم کا شوق بھی بڑھنے لگا۔ طالبِ علم گاؤں اور قصبوں سے شہروں میں آکر رہنے لگے۔ اس زمانے میں ریل گاڑیوں اور موٹروں کا وجود نہ تھا۔ یہ طالبِ علم مہینوں بلکہ بعض صورتوں میں کئی کئی سال تک گھر نہ جا سکتے تھے، کیوں کہ بعض طالبِ علموں کے گھر دُور دراز گاؤں اور دیہی علاقوں میں واقع تھے، اور بعض تو دوسرے ملکوں سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ اپنے گھروں سے ان کے رابطے کا ذریعہ محض خط تھے۔ اس ضرورت نے ڈاک کا ایک اور طریقہ پیدا کیا۔ اسے "یونی ورسٹی ڈاک" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پہلے پہل یہ طریقہ پیرس یونی ورسٹی نے اختیار کیا۔ پیرس یونی ورسٹی کی ڈاک کا نظام خاصا کام یاب ثابت ہوا۔ اس کا آغاز تیرھویں صدی میں شروع ہوا، اور

چودھویں صدی تک اسے بہت مقبولیت حاصل ہو گئی۔ شروع شروع میں تو ڈاک لے جانے والے ہرکارے صرف طالب علموں اور اُستادوں کے خط لاتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے چھپ کر عام آدمیوں کے خط لے جانے کا کام بھی شروع کر دیا، مگر یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکی اور چودھویں صدی میں اسے ہر آدمی تک خط پہنچانے کا طریقہ مان لیا گیا۔ اب یونی ورسٹی نے عام آدمیوں کی ڈاک کا کام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس آمدنی سے یونی ورسٹی کا بہت سا خرچ پورا ہونے لگا۔

۱۳۰۵ء میں اٹلی کے ایک شخص نے ایک ڈاک کمپنی کھولی۔ جلد ہی اس کمپنی کی طرح کی اور کمپنیاں یورپ کے دوسرے ملکوں مثلاً فرانس اور جرمنی میں بھی کھل گئیں۔ یہ کمپنیاں شروع شروع میں صرف بادشاہوں کے خطوط پہنچاتی تھیں، لیکن چوں کہ یہ ڈاک کم ہوتی تھی اس لیے اِس سے بس تھوڑی سی آمدنی ہوتی تھی۔ عام لوگوں کے خطوط کی تعداد خاصی زیادہ ہوتی تھی اور یہ خط آمدنی کا بڑا ذریعہ بن سکتے تھے۔ اس لیے ان کمپنیوں نے عام آدمیوں کی ڈاک بھی لانا لے جانا شروع کر دی۔ اس سے انھیں معقول آمدنی ہونے لگی۔ ان کمپنیوں نے ڈاک کے نظام کو صحیح طریقے سے چلایا۔ اسی زمانے میں ڈاک گاڑیوں کے ذریعے سے لوگوں کا سامان بھی جانے لگا اور لوگ بھی ان میں سفر کرنے لگے۔ گاڑیاں وقتِ مقررہ پر اسٹیشنوں سے چھوٹتیں اور وقتِ مقررہ

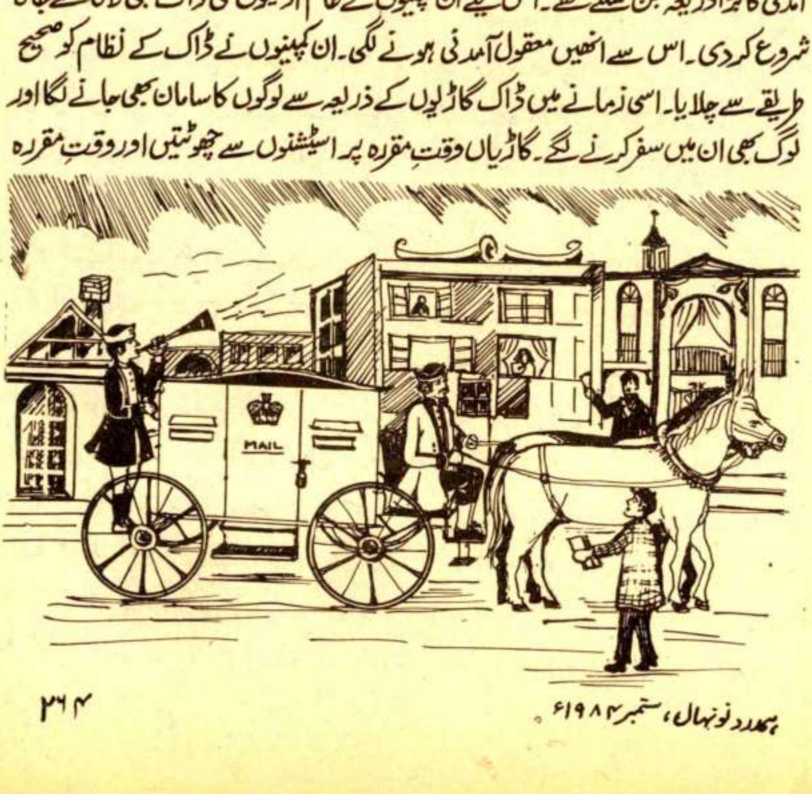

پر منزلِ مقصود پر پہنچتیں۔ اگرچہ یہ گاڑیاں کبھی کبھی راستے میں لُوٹ لی جاتیں، پھر بھی یہ کمپنیاں امریکا اور یورپ میں کام کرتی رہیں۔ آہستہ آہستہ یورپ کی بعض حکومتوں نے ڈاک کا یہ سلسلہ تجارتی کمپنیوں سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ڈاک کا یہ نظام بہت اچھے طریقے سے چلایا، کیوں کہ اُن کے پاس طاقت تھی اور فوج اور پولیس بھی۔ ڈاک گاڑیاں بروقت روانہ ہوتیں اور وقت پر پہنچتیں۔ ان کی حفاظت بھی ہوتی اور ڈاک جلدی منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی۔ سترھویں صدی میں سڑکوں پر چار گھوڑوں والی گاڑی چلنے لگی۔ اس کی رفتار کافی تیز ہوتی تھی۔ اس میں ڈاک کا الگ خانہ ہوتا تھا اور بیٹھنے کی جگہ بھی ہوتی تھی۔ کوچوان کے پاس ایک چمڑے کا کوڑا ہوتا تھا اور سینگ کی ایک نفیری بھی ہوتی تھی جسے وہ حسبِ ضرورت بجاتا جاتا اور لوگ اس کی آواز سُن کر گاڑی کے گزرنے کا راستہ خالی کر دیتے تھے۔ یہ گاڑی صرف اُس جگہ رُکتی جہاں کوچوان بدلنا ہوتا یا پھر گھوڑے تبدیل کیے جاتے۔ گاڑی کے ساتھ ایک یا دو ہتھیار بند سپاہی بھی ہوتے تھے۔ شروع شروع میں تو ڈاک کا یہ نظام صرف ملک کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں ہی رہا۔ کسی شہر کے اندر گھروں میں خط نہیں پہنچائے جاتے تھے، مگر کچھ عرصے بعد یہ کام بھی شروع ہوا۔ سب سے پہلے ۱۶۵۳ء میں پیرس شہر کے اندر ڈاک بانٹنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پھر کوئی تیس سال بعد لندن نے بھی اسے اپنا لیا۔ اس طریقے میں ایسی ترقی ہوئی کہ ہر جگہ سے دن میں بارہ مرتبہ ڈاک جمع کی جاتی اور لندن کے اندر ہی اندر صبح کے بھیجے ہوئے خط کا جواب شام تک آجاتا۔ البتہ گاؤں میں خط بانٹنے کا رواج نہ تھا۔ گاؤں والے خود ہی بے چارے جا کر اپنے خطوں کی پوچھ تاچھ کر لیتے تھے۔ بہت دن بعد کہیں ۱۸۶۳ء میں پہلی بار فرانس کے گاؤں والوں کو اُن کے خط گھر بیٹھے ملنے شروع ہو گئے، مگر جلد ہی یورپ کے سارے ملکوں نے اِس طریقے کو بھی اپنا لیا۔

پرانے زمانے کی ڈاک میں ایک خرابی بھی تھی، اور وہ یہ کہ خط بہت مہنگا تھا خط بھیجنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ سر والٹر اسکاٹ برطانیہ کے ایک بہت بڑے شاعر اور ناول لکھنے والے تھے۔ ایک بار ان کے کسی شاگرد نے اپنا ایک ڈراما پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھیجا۔ معلوم ہے سر والٹر اسکاٹ کو خط وصول کرتے وقت ڈاکیے کو کتنے پیسے دینے پڑے تھے؟ پانچ پاؤنڈ یعنی سوا سو رُپے۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اُس زمانے میں خط لکھنے والا

شخص ڈاک کا خرچ ادا نہیں کرتا تھا، بلکہ جسے خط لکھا جاتا تھا اُسے خط وصول کرتے وقت رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس میں بڑی خرابیاں تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک بوڑھی عورت کے پاس اس کے بیٹے نے کہیں سے خط بھیجا۔ بے چاری کے پاس پیسے نہیں تھے کہ اُسے لے لیتی اس نے کئی ہفتے تک اپنے کھانے کے پیسوں میں سے پیسے بچائے، پھر اللہ کے ایک نیک بندے نے اس کی کچھ مدد بھی کی۔ یوں اس کے پاس اتنی رقم جمع ہوئی کہ وہ ڈاک خرچ ادا کر کے خط حاصل کر سکے۔ لیکن جب وہ خط لینے ڈاک خانے پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کا خط ضائع کیا جا چکا ہے، کیوں کہ بہت دِنوں تک خط لینے کے لیے بڑھیا نہ آئی تھی۔ سوچو کہ بے چاری بڑھیا کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

ڈاک کے اس نظام میں خود ڈاک خانے والوں کو بھی نقصان ہوتا تھا۔ غریب لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا تھی۔ اچھی خاصی آمدنی والے آدمی کے لیے بھی خط وصول کرنا مشکل ہوتا تھا۔ کچھ لوگوں کو اپنے دوستوں سے کہنا پڑا کہ بھائی، مت بھیجا کرو خط۔ چناں چہ شروع شروع میں تو یہ بات دو چار آدمیوں نے ہی کی، لیکن کچھ دن بعد سچ مچ بہت سے لوگ خط لینے اور بھیجنے سے بچنے لگے۔ بس اُسی وقت خط بھیجتے جب خط بھیجے بغیر کام ہی نہ چلتا۔ چناں چہ برطانیہ کی حکومت نے دیکھا کہ ۱۸۳۴ء میں ڈاک کے ذریعہ سے اتنی آمدنی بھی نہیں ہوئی جتنی بیس سال پہلے ہو جاتی تھی۔ اب تو حکومت کو بڑی پریشانی ہوئی۔ یہ تو کام ہی سارا اس بنیاد پر چل رہا تھا کہ حکومت اس سے پیسے کمانا چاہتی تھی۔ دوسری طرف لوگ الگ پریشان تھے۔ خط کی عادت پڑ چکی تھی اور وہ خط کی آسانیوں کا مزہ چکھ چکے تھے۔ اب اُسے چھوڑیں کیسے؟ اور اگر نہیں چھوڑتے تو اتنے مہنگے خط لیں کیسے؟ اس پریشان کُن صورتِ حال میں برطانیہ کے ایک شخص رالینڈ ہل نے ڈاک کے نظام میں خرابی کا جائزہ لیا اور بتایا کہ کس طرح اِن خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

اُس زمانے میں ہوتا یہ تھا کہ ڈاک خانے میں ہر خط کو رجسٹر میں درج کیا جاتا پھر تمام خطوں کو فہرست کے ساتھ دوسرے ڈاک خانے میں بھیج دیا جاتا، وہاں بھی رجسٹر میں ہر خط کا اندراج ہوتا۔ اس کے بعد ہر خط کو غور سے دیکھا جاتا۔ اگر کوئی خط زیادہ وزنی محسوس ہوتا تو اسے تولا بھی جاتا۔ اس زمانے میں آج کی طرح لفافے نہیں تھے، صرف لمبے لمبے کاغذ موڑ کر

چپکا دیے جاتے۔ اب ڈاک خانے سے ڈاکیا خطوط لے کر چلتا تو اس کے پاس بھی ایک لمبی چوڑی فہرست ہوتی تھی جس میں خط بھیجنے والے کا نام اور پتا، خط پانے والا کا نام اور پتا خطوں کی تعداد، خط کس شہر سے آیا ہے اور یہاں سے اُس کا فاصلہ کتنا ہے اور خط پانے والے سے بہ طور ڈاک خرچ کتنی رقم وصول کرنی ہے اور نہ معلوم کیا کیا کچھ لکھا ہوا ہوتا۔ اب ڈاکیا بے چارہ خط پانے والوں کے مکان ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ مکان مِل گیا تو پتا چلا کہ خط پانے والے صاحب گھر میں موجود نہیں ہیں۔ ڈاکیے کو چوں کہ رقم لے کر ہی خط دینا ہے۔ اس لیے اُسے دوبارہ آنا پڑتا۔ اُس زمانے میں ڈاکیے ایمان دار بھی ہوتے تھے۔ اگر کوئی خط پانے والا ان پڑھ ہوتا تو ڈاکیے کے ساتھ جھک جھک کرتا کہ پیسے زیادہ ہیں۔ کبھی کبھی مکتوب الیہ خط لینے ہی سے انکار کر دیتا۔ اِس طرح یہ بڑا مشکل طریقہ تھا۔ رالینڈ ہل نے کہا کہ اصل میں زیادہ خرچ ان بے کار کاموں پر ہوتا ہے جن کا خط کے آنے جانے سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ڈاک کا خرچ خط لکھنے والا ادا کرے اور یہ خرچ سب خطوں کے لیے برابر ہو، چاہے وہ قریب کے شہروں میں بھیجے جائیں یا کسی دور دراز ملک میں۔ پھر رجسٹروں میں لکھنے کی جھنجھٹ بھی ختم کر دی جائے۔ ڈاکیا خط کو مکتوب الیہ کے گھر میں ڈال کر آگے روانہ ہو جائے۔ ہل صاحب کا کہنا تھا کہ ڈاک کے نظام کا اصلی مقصد پیسہ کمانا نہیں، لوگوں کو ایک سہولت بہم پہنچانا اور ان کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔

ہل صاحب کی تجویزیں بہت مفید تھیں، لیکن اُس کے لیے ڈاک کے پورے نظام کو بدلنا ضروری تھا۔ انگلستان میں اس پر بہت بحثیں ہوتی رہیں۔ آخر ان تجویزوں کو قبول کر لیا گیا۔ ۱۰ جنوری ۱۸۴۰ء کو ڈاک کا وہ نظام نافذ ہوا جو آج بھی نافذ ہے۔ اِس نظام کے تحت پہلے دن صرف لندن میں ایک لاکھ بارہ ہزار خط لکھ کر ڈاک میں ڈالے گئے، جب کہ اس سے پہلے ایک دن میں اس کے ایک تہائی خط بھی نہیں بھیجے جاتے تھے۔ سب سے پہلے ڈاک ٹکٹ پر انگلستان کی ملکہ وکٹوریا کا چہرہ کالے رنگ میں چھاپا گیا تھا۔ ڈاک کا نیا نظام اس قدر فائدہ مند ثابت ہوا کہ لوگ بہت خوش ہوئے اور خاص طور پر غریب لوگوں کے دل میں ہل صاحب کی بڑی عزت ہو گئی۔ انھیں روزانہ شکریے کے بہت سے خط پہنچتے۔ آہستہ آہستہ خط کا یہ نیا طریقہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اپنا لیا گیا اور یہی طریقہ معمولی ردّوبدل کے ساتھ آج بھی ساری دنیا میں رائج ہے۔

مزے دار حکایت

دو مٹکے بھر فارسی

سیکڑوں برس پہلے دُرّانیوں نے جب ہندوستان کو فتح کر لیا تو ایک گاؤں ایسا بھی تھا جس میں صرف جولاہے رہا کرتے تھے۔ چوں کہ دُرّانی فارسی بولتے تھے اور ان جولاہوں کو صرف پنجابی آتی تھی، لہٰذا جب بھی کوئی نیا حاکم مال گزاری وصول کرنے آتا تو یہ غریب دیہاتی اس کو اپنی تکالیف نہ بتا پاتے اور چُپ چاپ جو کچھ مانگا جاتا وہ دے دیتے۔ آخر اُن جولاہوں نے یہ طے کیا کہ سب لوگ دس دس رُپے چندہ کریں اور دو ہوشیار آدمیوں کو کابل روانہ کیا جائے تاکہ وہ وہاں سے فارسی زبان کا کچھ ذخیرہ خرید لائیں۔

چناں چہ دو بوڑھے آدمیوں کو منتخب کیا گیا، جن کی عقل مندی پر سب کو اعتماد تھا۔ یہ دونوں پشاور اور درّہ خیبر ہوتے ہوئے افغانستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے گاؤں گاؤں دریافت کرنا شروع

کر دیا، "کیا آپ کے پاس فارسی بکاؤ ہے؟" لوگ ان کو حقارت سے بھگا دیا کرتے تھے، کیوں کہ یہ بے چارے جولاہے تھے۔ آخر یہ لوگ شہر جلال آباد پہنچ گئے اور شہر میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ انھیں ایک ایسا آدمی مل گیا جو بڑا چالاک بھی تھا اور سفّاک بھی۔ بے چارے جولاہوں نے اس سے کہا، "ہم لوگ اپنے گاؤں کے لیے کچھ فارسی خریدنا چاہتے ہیں۔" یہ سُن کر وہ آدمی سمجھ گیا کہ یہ لوگ پرلے درجے کے بے وقوف ہیں۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ ان سے رقم بھی وصول کرلی جائے اور انھیں مطمئن کرکے واپس بھی بھیج دیا جائے۔ چناں چہ اس نے کہا، "آؤ میرے ساتھ چلو، اور مجھے معقول رقم دو۔ میں تم کو دو مٹکے بہترین قسم کی فارسی دے دوں گا۔" پھر وہ ان کو اپنے گھر لے گیا تاکہ رات وہیں بسر کریں۔ اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بھڑیں چھت کے شہتیروں میں اپنے چھتّے لگاتی ہیں، چناں چہ اس چالاک آدمی نے دو مٹکوں میں کوئی میٹھی چیز ڈال دی اور مٹکوں کو بھڑوں سے بھر دیا، پھر اس نے مٹکوں کے منھ پر خوب اچھی طرح کپڑا باندھ دیا۔ اس کے بعد یہ مٹکے ان جولاہوں کو دے دیے اور کہا، "دیکھو راستے میں ان مٹکوں کو ہرگز نہ کھولنا۔ جب گھر پہنچ جاؤ تو کسی جمعرات کو اپنے تمام دوستوں کو بُلا لینا۔ پھر تم سب ایک اندھیرے کمرے میں اکھٹے ہو جانا۔ دروازے اور کھڑکیاں سب بند کر دینا۔ پھر اپنے کپڑے اُتار کر ان مٹکوں کو کھول دینا۔ اس طرح ہر آدمی اپنے حصّے کی فارسی حاصل کرلے گا۔"

چناں چہ یہ بے وقوف لوگ ہندستان واپس آگئے اور اپنے گاؤں پہنچے۔ وہاں انھوں نے اپنے تمام دوستوں کو بُلایا اور یہ خوش خبری سُنائی۔ اس کے بعد سب لوگ ایک اندھیرے کمرے میں اکھٹے ہو گئے۔ دروازے اور کھڑکیاں سب بند کر لیں اور جسم کے کپڑے اُتار کر مٹکوں کو کھول دیا۔ بھڑیں جو اتنے عرصے سے بند تھیں آزاد ہوتے ہی باہر نکل پڑیں اور ہر آدمی کو کاٹنے لگیں۔ لوگ چیخ مار کر اِدھر اُدھر اندھیرے میں دروازے کو تلاش کرنے لگے۔ آخر بڑی مشکل سے دروازہ مل گیا اور سب لوگ باہر آگئے۔ اب جو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ہر ایک کا منھ سُوجا ہوا ہے۔ ایک آدمی کی ماں کھو گئی تھی۔ وہ چلّانے لگا، "کسی نے میری ماں کو دیکھا ہے؟" لوگوں نے جواب دیا، "تمھاری ماں کو ہم نے بھاگتے دیکھا ہے اور اس کے جسم پر بہت سی فارسی بھی چپکی ہوئی تھی۔"

بڑی تلاش کے بعد وہ بوڑھی عورت مل گئی۔ اس کا سارا جسم سُوجا ہوا تھا۔ پھر وہ سخت بیمار ہو گئی۔ اس خوف ناک تجربے کے بعد اس گاؤں کے جولاہوں نے پھر فارسی کا نام بھی نہیں لیا۔

ایک نرالی ڈاک کمپنی

"وِیلس فارگو" ایک ایسا نام ہے جو ان بے شمار قصّوں میں سنائی دیتا ہے جن کا تعلق امریکا کے وحشی مغربی علاقے سے ہے۔ ممکن ہے آپ نے ایسی کہانیاں پڑھی ہوں اور ٹیلے وژن پر بھی دیکھی ہوں۔

وِیلس فارگو کی کہانی ۱۸۵۲ء میں شروع ہوئی اس وقت کیلی فورنیا میں سونا دریافت کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا ہزاروں آدمی قسمت آزمائی کے لیے وہاں پہنچ رہے تھے۔ ان لوگوں میں سے بہت کم لوگ دولت کما سکے، لیکن ایک شخص ہنری ویلس نے دولت کمانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اس زمانے میں ڈاک خانے کی خدمات صرف کیلی فورنیا کے ساحلی علاقوں تک پہنچی تھیں۔ لیکن سونا اندرونی علاقوں میں دریافت کیا گیا تھا۔ چناں چہ جو لوگ پہاڑ کے دامن میں سونا تلاش کر رہے تھے وہ اپنے بال بچّوں اور عزیزوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بڑے بے چین تھے۔ ہنری ویلس اور ولیم جارج فارگو نے مل کر ایک خصوصی ڈاک کمپنی کا آغاز کیا جس کا نام "وِیلس فارگو" رکھا گیا۔ چناں چہ تھوڑے ہی دِنوں میں ان کے ساٹھ دفاتر اس علاقے میں کُھل گئے۔ ان کی گھوڑا گاڑیاں قیمتی خطوط کو لے کر دشوار گزار پہاڑی اور ریگستانی علاقوں سے گزرنے لگیں۔ گاڑی بانوں اور کان کنوں میں دوستی ہو گئی۔ لہٰذا اگر کوئی کان کن کسی دُور دراز علاقے میں منتقل ہو جاتا تو یہ گاڑی بان اس کو ڈھونڈ نکالتے۔ یہ گاڑی بان ان کان کنوں کو ان کے عزیزوں اور دوستوں کے خطوط پہنچاتے تھے اور اکثر اوقات انعام میں سونے کی بھدّی سی انگوٹھی بھی حاصل کر لیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ وِیلس فارگو کمپنی ان کان کنوں کے سونے کو ایمان داری سے تولتی تھی اور ملک کے مشرقی حصّے کو روانہ کر دیا کرتی تھی تاکہ وہاں سونا فروخت کیا جا سکے۔ اس کمپنی کی دیانت داری کا یہ ریکارڈ ہے کہ اگر ایک ڈالر کا بھی کمپنی کی وجہ سے نقصان ہو گیا تو اس

نے تاوان ادا کر دیا۔

تھوڑے ہی عرصے میں اس کمپنی کی "کونکورڈ" (CONCORD) گاڑیاں سارے مغربی علاقے میں مشہور ہو گئیں۔ یہ گاڑیاں نیو ہیمپ شائر کے مقام کونکورڈ میں تیار کی جاتی تھیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ یہ پہاڑی علاقوں کی دشواریوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ان گاڑیوں میں چار یا چھے گھوڑے ہوتے تھے۔ اس گاڑی کے اندر تو نو مسافر بیٹھ سکتے تھے، لیکن کئی ایک باہر بھی بیٹھ سکتے تھے۔ گاڑی کے اوپر اس کا ڈرائیور ہوتا تھا اور اس کے برابر ایک بندوقچی ہوتا تھا جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ سیلاب، آندھی، ڈاکو یا ریڈ انڈین کسی سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ بندوقچی دراصل اس خزانے کے بکس کی حفاظت کے لیے ہوتا تھا جو ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے رکھا ہوتا تھا۔ سبز رنگ کا یہی مشہور بکس تھا جس کی وجہ سے اس کمپنی کی کہانی خطرات اور دلیری کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اس بکس میں اکثر ہزاروں ڈالر کا سونا بھرا ہوتا تھا۔ اس بکس کا قفل اس قدر مضبوط ہوتا تھا کہ ڈاکو اس کو صرف کلھاڑی سے توڑ سکتے تھے یا بارود سے اُڑا سکتے تھے۔ اور اس میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ لہٰذا ڈاکو پکڑ لیا جاتا تھا، لیکن یہ لٹیرے بھی بڑے جانباز تھے۔ چودہ برسوں کے دوران ویلس فارگو کے ڈرائیوروں کو تین سو سینتالیس مرتبہ اس للکار کا سامنا کرنا پڑا کہ: "بکس کو نیچے پھینک دو!"

ویلس فارگو کے آدمی بھی آسانی سے قابو میں نہیں آتے تھے۔ ایک مشہور ڈرائیور تھا "سینڈی ڈین" (SANDY DAN) ایک بار ایک نقاب پوش ڈاکو نے جب اس کا راستہ روکا تو ڈین نے اس سے پوچھا کہ تمھارے ساتھ اور کون کون ہے۔ کوئی ڈاکو اکیلا تو راستہ روک نہیں سکتا۔ اس پر ڈاکو نے شیخی مارنے کے لیے کہا کہ میں تو بالکل اکیلا ہوں۔ ڈین نے کہا، "تو پھر تمھارے پیچھے وہ کون تھا؟" یہ سُن کر ڈاکو نے ایک لمحہ کے لیے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ بس پھر کیا تھا۔ ڈین کا کوڑا ڈاکو کے سَر پر پڑا۔ ڈاکو کو جب ہوش آیا تو اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور وہ دس سال قید کی سزا بھگتنے جا رہا تھا۔

کئی برسوں تک کیلی فورنیا کی ڈاک گاڑیوں کے لیے "بلیک بارٹ" (BLACK BART) نامی ایک ڈاکو بلائے آسمان بنا رہا۔ وہ اچانک جنگل میں سے نمودار ہو جاتا تھا۔ اپنے سَر

اور چہرے پر ایک تھیلا چڑھائے ہوتا تھا جس میں سے اس کی دو آنکھیں سوراخوں میں سے چمکتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بڑے اطمینان سے سڑک پر آکر کھڑا ہو جاتا تھا اور گاڑی کے اگلے گھوڑے کو اپنی ڈھال بنا کر ڈرائیور پر پستول تان لیتا تھا۔ اس ڈاکو پر کئی بار گولیاں ماری گئیں اور وہ زخمی بھی ہوا، لیکن ہر بار وہ بچ کر نکل گیا۔ وہ اتنی چالاکی سے ڈاکے ڈالتا تھا کہ جس وقت ویلس فارگو کے جاسوس اُس کو اس جگہ تلاش کر رہے ہوتے جہاں اس نے ابھی ڈاکا ڈالا تھا، وہ سو میل کے فاصلے پر کسی دوسری گاڑی کو لُوٹ رہا ہوتا تھا۔

اس کمپنی کے جاسوسوں کا یہ مقولہ تھا کہ ویلس فارگو والے کبھی بھولتے نہیں۔ چناں چہ "بلیک بارٹ" کے بارے میں بہت سی باتیں یاد تھیں۔ ایک جائے واردات پر یہ ڈاکو اپنا رومال بھولے سے چھوڑ گیا جس سے اس کا پتا چلانے میں بڑی مدد ملی۔ اس رومال پر لانڈری کا نشان (FXO7) تھا۔ ویلس فارگو کے جاسوسوں نے اکیانوے لانڈریوں میں جا کر پتا چلانا چاہا، مگر ناکامی ہوئی۔ کوئی بھی اس نشان کو نہ پہچان سکا۔ آخر کار ایک لانڈری سین فرانسسکو میں مِل گئی جس کا یہ نشان تھا۔ معلوم ہوا کہ ایک صاحب ہیں مسٹر چارلس بولٹن (MR CHARL-ES BOLTON) ان کے کپڑوں کے لیے یہ نشان استعمال کیا جاتا ہے۔ مسٹر بولٹن کے بارے میں معلوم ہوا کہ بڑے شریف آدمی ہیں۔ پڑوسیوں نے ان کی تعریف کی اور بتایا کہ وہ کوئی کاروبار کرتے ہیں اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر کئی کئی روز تک باہر رہتے ہیں، لیکن جاسوسوں نے پتا چلا لیا کہ مسٹر بولٹن کے جسم پر گولیوں کے بہت سے نشانات بھی ہیں جو ایک پُر امن کاروباری آدمی کے جسم پر ہرگز نہ ہونے چاہییں۔ چناں چہ "بلیک بارٹ" کو چھے سال کے لیے جبری طور پر آرام کرنے جیل بھیج دیا گیا۔

ویلس فارگو کے ڈرائیوروں میں "اولڈ چارلی" پارک ہرسٹ ("OLDCHARLIE PARKHURST") غالباً سب سے زیادہ ہوشیار ڈرائیور تھا۔ وہ اندھیری راتوں میں بھی خطرناک راستوں سے اپنی گاڑی نکال لے جاتا تھا۔ اگر کوئی مسافر ہمت کر کے اس کے قریب بیٹھ جاتا تھا تو وہ طرح طرح کے بھیانک واقعات سُنا کر اس کو خوب ڈراتا تھا۔ خود اپنے بارے میں کہا کرتا تھا کہ جب کبھی مجھے ذرا بھی ڈر لگتا ہے تو میں تمباکو منھ میں ڈال کر اس کو زور زور سے چبانے لگتا ہوں، لیکن اولڈ چارلی کی گاڑی پر نہ تو کبھی ڈاکا پڑا اور نہ اس کی گاڑی کہیں اُلٹی۔ جب وہ بہت

بوڑھا ہو گیا تو سکون سے ایک فارم میں رہنے لگا، لیکن بعد میں جب لوگوں کو اس کی حقیقت کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ دنگ رہ گئے۔ معلوم ہوا کہ اولڈ چارلی دراصل ایک عورت تھا۔

رفتہ رفتہ گھوڑا گاڑیوں کا زمانہ ختم ہونے لگا۔ سنٹرل پیسیفک ریلوے نے پورے امریکا میں لائنیں بچھانا شروع کر دیں۔ دس مئی ۱۸۶۹ء کو جب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اب ویلس فارگو کا کاروبار ختم ہو جائے گا، لیکن ویلس فارگو نے ریلوے کو استعمال کرنے کی بھی اجازت حاصل کر لی۔ اِدھر ویلس فارگو نے ریلوے کو استعمال کرنا شروع کیا اُدھر ڈاکوؤں نے بھی ریلوں پر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔ سب سے زبردست ڈاکا جنوری ۱۸۸۲ء میں پڑا۔ یہ واقعہ نیواڈا (NEVADA) کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ہوا۔ ویلس فارگو کا جو آدمی خزانے کی حفاظت کر رہا تھا اس کا نام "راس" (ROSS) تھا۔ جب ڈاکوؤں نے ریل گاڑی روک لی اور راس کو باہر نکلنے کا حکم دیا تو اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ چناں چہ تین گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں اور اس نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا۔ مغرب کی جانب جانے والی گاڑی عن قریب گزرنے والی تھی۔ راس یہ دعائیں مانگتا رہا کہ اس ریل گاڑی کا عملہ یہ دیکھ لے۔ اسی دوران ڈاکوؤں نے انجن ڈرائیور سے کہا کہ ویلس فارگو کے ڈبّے کو گاڑی سے الگ کر کے اسے دوسرے ڈبوں سے ٹکرائے۔ انجن ڈرائیور نے بہ ظاہر ڈاکوؤں کے حکم کی تعمیل کی، مگر اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اتنے میں مغرب جانے والی گاڑی کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔ ڈاکو چھپ گئے، مگر رُکی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی بندوق کی زد میں رکھا اور اس سے کہا کہ وہ ہر گزرنے والی گاڑی کو چلے جانے کا اشارہ کرے۔ اس وقت ویلس فارگو کے آدمی کا کلیجا منھ میں آگیا ہو گا۔ راس کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مغرب جانے والی گاڑی کے گارڈ نے بھانپ لیا ہے کہ ڈاکا پڑ گیا ہے۔ چناں چہ اس نے اگلے اسٹیشن پر سب کو بتا دیا اور تھوڑی ہی دیر میں پولیس کے سواروں نے آکر ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا۔

امریکا کی "ویسٹرن اسٹوری" کی سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ ہیرو کو کوئی نہیں مار سکتا۔ آج ویلس فارگو کی بکتر بند گاڑیاں نیویارک میں عام طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں روزانہ لاکھوں ڈالر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاتے ہیں۔ اس کمپنی کا ارادہ ہے کہ

پورے امریکا میں اس کی شاخیں قائم کر دی جائیں۔ ماضی کے شان دار کارناموں کو سین فرانسسکو کے ایک بینک میں بہ طور میوزیم رکھا گیا ہے۔ یہ بینک پہلے کبھی ویلس فارگو ہی کا تھا۔ وہاں آپ پرانے زمانے کے ڈاکوؤں کی چیزیں بھی دیکھ سکتے ہیں اور سونا تلاش کرنے والے دلیروں کی یادگاریں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں پرانے زمانے کی ایک گھوڑا گاڑی بھی رکھی ہوئی ہے۔ جس وقت آپ اس گاڑی کو دیکھتے ہیں تو آپ کو کانوں میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور گاڑی بان کے کوڑے کی تڑاخ پڑاخ کے ساتھ ساتھ بندوق کی گولیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگتی ہیں اور ڈاکوؤں کی یہ للکار بھی سنائی دیتی ہے کہ "اس بکس کو نیچے پھینک دو۔"

سنہرے اصول

حکیم محمد سعید

آج کے بچے کل کے معمار ہیں۔ اگر یہ تن درست رہیں گے تو ٹھیک طرح سے پڑھ سکیں گے اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو کام میں لاسکیں گے۔ ان کی صحت پر پوری قوم کی خوش حالی اور ترقی کا دار و مدار ہے۔

اس کتاب میں چھوٹے بچوں میں صحت کا شعور اور ذمہ داری پیدا کرنے کے لیے بیماریوں اور حادثات سے بچنے کے سنہرے اصول دل کش تصویروں کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ یہ سب باتیں بچوں کی روزانہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔
حکیم محمد سعید نے اچھی اور صحت مند زندگی گزارنے کے سنہرے اصول بیان کرکے بچوں اور ماں باپ دونوں کے لیے ایک بے نظیر تحفہ بنادیا ہے۔

قیمت ۳ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی ۱۸

مُسکراتے رہو

ایک دن ایک نواب کے وزیر نے ایک دیوانے سے کہا "میں تجھے خوشی کی ایک خبر سناتا ہوں، تجھے نواب صاحب نے کتوں اور گدھوں پر حاکم بنا دیا ہے۔"

دیوانہ بولا "خبردار، اب میری مرضی کے بغیر کچھ نہ کرنا، کیوں کہ اب تو میری رعایا میں ہو گیا ہے۔"

مرسلہ: قیصر علوی

ایک شخص نے اپنے ملک کے وزیرِ صنعت کو جاہل، احمق اور اَن پڑھ کہہ دیا تو اس پر دو الزام عائد کیے گئے اور جرموں کی سزا دی گئی۔ ایک تو سرکاری وزیر کو گالی دینا اور دوسرا ایک سرکاری راز فاش کرنا۔

مرسلہ: سید آصف مصطفیٰ نقوی، کراچی

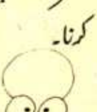

مالک: (نوکر سے) دیکھنا برابر والے کمرے میں چور تو نہیں ہے۔

نوکر: اس وقت تو نظر نہیں آرہا، صبح اور دیکھ لوں گا۔

مرسلہ: نعیم رضا، کراچی

اُستاد: اموینیا اور نمونیا میں کیا فرق ہے؟

شاگرد: جناب، ایک بوتل میں ہوتا ہے اور ایک سینے میں۔

ماں نے بیٹے کو صبح جلد اُٹھنے کے فوائد بتاتے ہوئے کہا "دیکھو بیٹا، جو پرندے صبح جلد اُٹھ جاتے ہیں ان کو کھانے کو زیادہ چوگے ملتے ہیں۔

بیٹے نے جلدی سے جواب دیا، "اور امی، جو چوگے صبح جلد اُٹھ جاتے ہیں اُن کو کیا ملتا ہے؟"

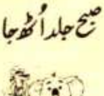

ایک عورت (دوسری سے) "پچھلی چھٹیوں میں ہم ساحلِ سمندر پر گئے تھے۔ پہلے انھوں نے مجھے ریت کھود کر ریت میں دبا دیا تھا، پھر میں نے ان کو ریت میں دبا دیا، اب کے میں جاؤں گی تو کھود کر نکال لوں گی۔"

مرسلہ: نائلہ وسیم، کراچی

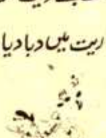

مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ردیف اور قافیہ تھا "خوگر میں ہوں"۔ ایک صاحب بار بار "میں ہوں" کا نعرہ لگا کر شعر کا مزا کرکرا کر دیتے تھے۔ ایک شاعر نے اپنا

کلام سُنانا شروع کیا۔

رنج نہ کر تُو کہ بڑے رنج کا خوگر میں ہوں

حسبِ عادت ان صاحب نے "میں ہوں" پکار کر داد دینی شروع کی۔ اس پر شاعر چڑ گیا، اس نے یہ مصرع پڑھا:

ناریل ہاتھ لگا جس کے وہ بندر ......

وہ صاحب زور سے بولے، "میں ہوں"۔

مرسلہ: شمائلہ ناز ملک، فیصل آباد

ایک پادری اپنی بچّی کو کہانی سُنا رہا تھا۔ کہانی سُن کر بچّی بولی، "کیا پاپا، کہانی واقعی سچی ہے یا آپ واعظ کر رہے تھے"۔

ایم ایس ناز، ایم این ناز، ایم اے ناز، فیصل آباد

مالک: (ملازم سے) آج میرے لیے تم شبو کا جو پانی لائے تھے وہ بہت میلا تھا۔

ملازم: شبو کا پانی؟ جناب، میں تو آپ کو چاے کا پیالہ دے گیا تھا۔

مرسلہ: رحیم بخش بھٹو، شکارپور

سپاہی: (کوئلے کے بیوپاری سے) تم کوئلا بلیک کرتے ہو؟

کوئلے والا: اجی صاحب، ہم کہاں بلیک کرتے ہیں یہ تو قدرتی طور پر بلیک ہوتا ہے۔

مرسلہ: صالحین رضا، کراچی

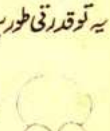

بنجمن فرینکلن کفایت شعاری میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ایک دن ایک غریب شخص نے اُن سے پچاس ڈالر اُدھار مانگے۔ فرینکلن بڑی منّت سماجت کے بعد جب رقم دینے پر آمادہ ہوئے تو اُس غریب شخص نے اپنے اس قول کی صداقت دکھانے کے لیے کہ "رقم جلد ہی واپس کر دی جائے گی"، فرینکلن سے کاغذ اور قلم طلب کیا۔ فرینکلن نے پوچھا "تمھیں کاغذ اور قلم کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

اس شخص نے جواب دیا، "دیکھیے جناب، میں ایک کھرا اور سچّا آدمی ہوں۔ آپ کاغذ اور قلم دیں تاکہ میں اس پر تحریر کر دوں کہ میں رقم جلد واپس کر دوں گا"۔

اس پر فرینکلن بولے، "یہ کیوں، کیا آپ میری رقم کے ساتھ ساتھ کاپی کا ورق بھی برباد کرنا چاہتے ہیں"۔

مرسلہ: محمد اسماعیل، کراچی

ایک نوکر روتا ہوا اپنے مالک کے پاس آیا۔ مالک نے رونے کا سبب پوچھا تو نوکر نے بتایا کہ بیگم صاحبہ نے مارا ہے۔ اس پر مالک بے ساختہ بولا، "تو پھر روتا کیوں ہے، کیا تُو نے ہمیں کبھی روتے ہوئے دیکھا ہے؟"

مرسلہ: علی محمد، کراچی

ایک چوہے اور ہاتھی کی دوستی ہو گئی۔ ایک دن ہاتھی صبح ہی صبح نہا رہا تھا کہ چوہا دریا کے کنارے آ پہنچا اور اُسے پکارنے لگا، "ہاتھی، ہاتھی، ذرا پانی سے باہر آؤ"۔

ہاتھی نے بہت پوچھا کہ کیا بات ہے۔ پانی میں ہی بتا دو، لیکن چوہے نے اپنی رَٹ جاری رکھی کہ پہلے پانی سے باہر آؤ۔ خیر ہاتھی پانی سے باہر آیا۔ اب چوہے نے اُسے حکم دیا، "واپس پانی میں چلے جاؤ"۔

ہاتھی کو بہت غصّہ آیا کہ پہلے تو نہاتے ہوئے مجھے

پانی سے باہر نکالا اور اب کہتا ہے کہ واپس جاؤ۔ خیر اس نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا، "بات کیا تھی؟"

"بات کیا ہوتی، صبح سے میں اپنی جوتی تلاش کر رہا ہوں، مگر مل نہیں رہی۔ میں نے سوچا کہ کہیں تم نے نہ پہن رکھی ہو۔" مرسلہ: فرحت شکور، کراچی

ناصر: احمد، ٹی وی پر سگریٹ کے خلاف جو بھیانک اشتہار آتا ہے اُسے دیکھ کر مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

احمد: پھر کیا تم نے سگریٹ پینی چھوڑ دی؟

ناصر: نہیں، میں نے اپنا ٹی وی بیچ دیا۔

مرسلہ: طاہر جاوید، طارق عبید، کراچی

مولوی صاحب کسی دعوت پر گئے تو میزبان نے کھانے کے ساتھ شہد دیا۔ مولوی صاحب نے کھانا کھا کر شہد کی طرف دیکھا اور روکھا شہد ہی کھانے لگے۔ میزبان نے کہا، "مولوی صاحب، روکھا شہد کھانے سے دل جلتا ہے۔"

مولوی صاحب نے کہا، "دلوں کی باتیں خدا جانتا ہے کہ میرے شہد کھانے سے کس کا دل جلتا ہے۔"

شوخ طالبِ علم نے استاد سے پوچھا، "عورت کی کشش اور زمین کی کشش میں کیا فرق ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔" اُستاد نے سنجیدگی سے جواب دیا، "دونوں ہی آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔"

مرسلہ: راجا محمد نوشاد اکبر بھٹی، کراچی

ایک عورت کو گھر کی ملازمہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی کہ صاحب دروازے کے پاس بے ہوش پڑے ہیں، ان کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ ہے۔

عورت چہک کر بولی، "بہت خوب! میری نئی ساڑھیاں آگئی ہیں۔"

ایک شخص نے جوتے خریدنے کے بعد دکان دار سے نئے سال کا کیلنڈر طلب کیا تو دکان دار نے معذرت کرتے ہوئے کہا، "جناب، کیلنڈر تو ختم ہوگئے ہیں کل کسی وقت رسید دکھا کر کیلنڈر لے جانا۔"

وہ شخص بولا، "اگر رسید گم ہوگئی تو جوتا دکھا کر لے جاؤں گا۔"

پہلا دوست: اگر دنیا میں پانی نہ ہوتا تو؟

دوسرا دوست: تو پھر ہم خالص دودھ پیا کرتے۔

"کیا تم نے لوگوں سے کہا ہے کہ میں احمق ہوں؟" افسر نے ڈانٹ کر کلرک سے پوچھا۔

کلرک نے خوف سے کانپتے ہوئے جواب دیا، "ہرگز نہیں جناب! میں نے نہیں کہا، وہ لوگ تو پہلے ہی سے یہ بات جانتے ہیں۔"

مسافر شہر میں نیا نیا آیا۔ تنہائی سے تنگ آکر ایک ریستوران میں جا بیٹھا۔ بیرے نے آکر پوچھا، "آپ کو کیا چاہیے؟"

"ایک پلیٹ تلی ہوئی مچھلی اور ہمدردی کے دو بول۔" مسافر نے کہا۔ بیرا خاموشی سے باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد

مطلوبہ کھانا لاکر میز پر رکھ دیا اور مسافر کے کان میں کہنے لگا:

"مچھلی نہ کھانا، باسی ہے۔"

اُستاد: جب خوب بادل آئیں تو ہمیں کس چیز کی توقع کرنی چاہیے؟

شاگرد: جناب چھٹی کی۔

مرسلہ: دلعزیز صدیقی، کراچی

عدالت میں ایک مقدمہ پیش تھا۔ ملزم کے وکیل نے فیصلہ کیا کہ جج کو رشوت دی جائے۔ چناں چہ اس نے سو سو کے دس نوٹ کتاب میں رکھے اور کتاب جج کی میز پر رکھ دی اور دلائل دینے شروع کیے:

"مائی لارڈ! اس قسم کے کیس میں ملزم کو کوئی سزا نہیں مل سکتی، کیوں کہ آج تک اس قسم کے چار کیس ہوئے ہیں، جن میں سے ایک کی مثال آپ کے سامنے رکھی ہوئی کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر ہے۔"

جج نے کتاب کھولی اور خوش ہو کر کہا، "یہ تو ایک مثال ہے، اس کی تین مزید مثالیں بھی پیش کی جائیں۔"

مرسلہ: رُبیسہ کوثر حامد، کراچی

استاد: "کون کون سے بچے جنت میں جانا چاہتے ہیں؟" سب بچے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں صرف ایک نہیں اُٹھاتا۔ استاد اس سے پوچھتے ہیں:

"کیا تم جنت میں جانا نہیں چاہتے؟"

وہ بچہ کہتا ہے "نہیں، اس لیے کہ امی نے جلد گھر آنے کو کہا تھا۔"

مرسلہ: کاشف اسلم، کراچی

کسی شخص نے ایک قمیص چرائی اور اپنے بیٹے کو دی کہ بازار میں جاکر بیچ آئے۔ لڑکا بازار کی طرف گیا، مگر قمیص کسی نے راستے میں چُرالی۔

جب وہ خالی ہاتھ گھر واپس پہنچا تو باپ نے بیٹے سے پوچھا، "کہو بیٹا، قمیص کتنی قیمت پر بیچی؟" لڑکا بولا، "جس قیمت میں آپ نے خریدی تھی اسی قیمت میں بکی۔"

مرسلہ: ندیم احمد خان زادہ، دولت پور

ماں: ارے مُنّے! یہ پانی میں صابن گھول کر کیوں پی رہے ہو؟

منا: امی امی! میں اس میں صابن نہیں گھول رہا۔ اصل میں پانی گندا تھا اور میں اس کو صابن سے دھو کر پی رہا ہوں۔

ایک نابینا حافظ جی سڑک پر چلے جا رہے تھے کہ سامنے سے گزرنے والی ایک بھینس سے ٹکرا گئے۔ حافظ جی گھبرا کر بولے، "محترمہ، معاف کیجیے گا۔"

جواب میں بھینس نے زور سے منھ کھول کر آواز نکالی: "بھاں بھاآں۔"

حافظ جی شرمندہ ہو گئے اور کھسیانے ہو کر آگے چلے ہی تھے کہ اب ایک موٹی عورت سے ٹکر ہو گئی۔

حافظ جی جھلا کر بولے، "نالائق لوگ اپنی بھینس کھلی چھوڑ دیتے ہیں۔"

مرسلہ: محمد اسماعیل، کراچی

بزمِ نونہال

● سال نامے کی آمد کے باوجود جولائی کے شمارے کی حیثیت سال نامے کی سی تھی، کیوں کہ یہ کسی طور بھی دل چسپی اور معلومات میں سال نامے سے کم نہ تھا اور یہ طریق بھی صرف نونہال ہی میں پایا ہے ورنہ سُنا ہے کہ اکثر ماہ نامے جب سال گرہ نمبر چھاپتے ہیں تو اس سے پہلے کہ ایک دو شمارے اس بہانے کے ساتھ غیر دل چسپ شائع کرتے ہیں کہ سال نامے کی تیاری کی وجہ سے توجہ نہ دی جاسکی۔

محسن رجب علی، نواب شاہ

● میں آپ سے اور جناب حکیم محمد سعید سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں اس کا طریقۂ کار کیا ہے۔ آپ نے مقابلہ معلومات عامہ کو انعامی بنانے کے بارے میں سوچا کہ نہیں۔ آپ لوگ زیادہ تر ایسی کہانیاں چھاپتے ہیں جو پہلے سے شائع شدہ ہوں یا پھر نقل شدہ ہوں اور ہماری کاوشیں چھپنے سے رہ جاتی ہیں۔ جولائی کا نونہال معیاری تھا۔

محمد شاہد اقبال صدیقی، کراچی

آپ کسی دن فون کر کے وقت طے کر لیجیے اور مل لیجیے۔

● کہانیوں میں "خواب سچّا ہو گیا" اور "بھوت میجر" اچھی تھیں۔ اولمپک کھیلوں پر مضمون پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ حکیم محمد سعید صاحب کا مضمون "کم کھائیے" پڑھ کر کم کھانے کے فوائد معلوم ہوئے

محمد زاہد، کوثر ناز، کراچی، امجد علی زبیری، حیدر آباد

● خاص طور پر جاگو جگاؤ نے بہت متاثر کیا۔ یوں تو نونہال کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے، اگر ستمبر میں خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان باعثِ مسرت ہے۔ دو مہینے بعد دو مسافر دو ملک پڑھ کر بہت مزا آیا۔ آپ بذاتِ خود کہانیاں بہت کم لکھتے ہیں۔ اس بار خاص نمبر میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھیے گا مثلاً اپنے بارے میں کچھ لکھیے۔ بچپن کی شرارتوں سے ادیب بننے تک کی داستان یا پھر نونہال کے لیے کوئی خوب صورت سا ناول لکھیے گا۔ محمد سجاد اصغر، شاہدرہ لاہور۔ محمد اسحاق انجم، ڈگری

لیجیے میں نے کئی تحریریں لکھ ڈالیں۔

● بہت سے لڑکے ٹیلی وژن میں نونہال کی مشہوری سُن کر اشتیاق سے میرے پاس نونہال لینے کے لیے آتے ہیں اور میں ان کو نونہال پڑھنے کے لیے دیتا ہوں جب میں اپنے اسکول میں نونہال کو لے جاتا ہوں تو ہر لڑکا چاہتا ہے کہ وہ نونہال پہلے پڑھے۔

محمد انور سعید، ساہی وال

● دو مسافر دو ملک" بہت اچھا سلسلہ ہے اگر اسے بند کرنا ہے تو اس کی جگہ مختلف ممالک کے متعلق معلوماتی مضامین کا سلسلہ شروع کر دیں۔ معلومات عامہ کے مقابلے میں حالاتِ حاضرہ کے متعلق ایک دو سوالات ضرور شامل کر لیا کریں۔ میں نونہال ایک سال کے لیے جاری کروانا چاہتا ہوں اور اس میں اپنا ایک ناول بھی شائع کروانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے۔

مبسم شہزاد، ٹوبہ ٹیک سنگھ

نہیں میاں، فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ناول شائع ہو۔

● سب کہانیاں مزے دار تھیں۔ خواب سچّا ہو گیا اور خرگوش بادشاہ بن گیا۔ اچھی کاوشیں تھیں۔ عید کی آمد ایک بہترین نظم تھی۔ مسکراتے رہو کے لطیفے اس مرتبہ خاصے اچھے تھے۔

ندیم احمد خان زادہ، مبشر اقبال خان زادہ، سکرنڈ

● اس بار اوّل تو جاگو جگاؤ اور کم کھائیے تھے اور پھر وہی پہلی بات اور دو مسافر دو ملک خاص کر دو مسافر دو ملک خوب تھا۔ کہانیوں میں خواب سچّا ہو گیا خوب تھی۔ اولمپک کھیل اور ریل گاڑی کافی جان دار اور معلوماتی تھے۔ تحفے کچھ پھیکے تھے۔ محمد اقبال خالدی، نواب شاہ

● مضمون کم کھائیے خوب تھا۔ کہانیوں میں خواب سچّا ہو گیا، کھلونے جان دار ہوتے ہیں۔ خرگوش بادشاہ بن گیا اور بھوت میجر خوب تھیں۔ لطیفے بھی ہمیشہ کی طرح مزے دار تھے۔ نونہال ادیب میں سب کہانیاں اچھی تھیں۔ نوید، عدنان منگی، گل رعنا منگی، گل زرین منگی، گُل صبا، گل ہما، آفتاب احمد منگی، سعید احمد منگی، نور محمد منگی، لاڑکانہ

● جولائی کا شمارہ کافی عمدہ تھا۔ سب سے زیادہ مجھے "دو مسافر دو ملک" نے متاثر کیا۔ یہ کافی عمدہ مضمون تھا۔

عابد حسین بھٹی بھاشور و کالونی۔ شوکت علی قریشی، جیکب آباد

● جولائی کا شمارہ اچھا تھا تمام مضامین معلومات عامہ، طب کی روشنی میں اور ننھے نونہال ادیب اور سب سلسلے اچھے تھے۔

سعید احمد عابد، دھنوٹ

● کہانیوں میں خواب سچا ہو گیا، خرگوش بادشاہ بن گیا، ریل گاڑی کی آپ بیتی، دو مسافر دو ملک اور مسکراتے رہو بہت پسند آئیں۔

محسن علی خان، لاہور

● سورج خاص نہ تھا۔ جاگو جگاؤ اور جناب حکیم محمد سعید کا مضمون "کم کھائیے" رسالے کی جان تھے۔ پہلی بات بھی خوب تھی۔ کہانیوں میں جناب مناظر صدیقی کی "خواب سچا ہو گیا"، جناب منظر امکانی کی "کھلونے جان دار ہوتے ہیں"، "بھوت میجر" اور "دو مسافر دو ملک" بہت شاندار تھیں۔ نظمیں تمام اچھی تھیں۔ البتہ نونہال ادیب میں سید محمد علی نقوی کی نظم "تتلی"، بچوں کے ایک کیسٹ سے نقل کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جناب فتح علی انوری کا مضمون "ریل گاڑی کی آپ بیتی" بہت اچھا تھا۔ ایک بات بتائیے، صفحے کے ایک جانب کیوں لکھنا چاہیے اس طرح تو لفافے کا وزن زیادہ ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ مجیب ظفر انوار، کراچی

> (۱) سید محمد علی نقوی — ایک سال تک ...... (۲) اس سے بڑی سہولت رہتی ہے۔

● اس ماہ کا رسالہ بے حد پسند آیا۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔

شبینہ انجم، شبانہ پروین، عقیل احمد اگریا، صبیحہ انجم، صدف، نسیم احمد، وسیم احمد، ذکیہ، شاہدہ۔ اسد رحمان، کراچی

● تمام مضامین دل چسپ تھے۔ حکیم محمد سعید صاحب کی ذات گرامی کے جواہر شادات بھی شامل رسالہ ہوں۔ ہیرے اور موتی سے کم نہیں ہوتے۔ خدا ایسے مردِ مومن کا سایہ ہمیشہ ہم نونہالوں کے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کے مضمون "دو مسافر دو ملک" میں ایک امکانی غلطی نظر آتی ہے: میری یا اپنی اصلاح فرمائیں: "اس سلطنت کا صدر مقام تھا جس میں سورج کبھی طلوع نہ ہوتا تھا۔"

فرحت رشید رومی، شورکوٹ کینٹ

> جی ہاں، لفظ "غروب" کے بجائے "طلوع" چھپ گیا۔ غروب ہونا چاہیے۔ آپ کا شکریہ۔

● آج کل معلومات عامہ بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں جس کسی شخصیت کا قول، یا آخری الفاظ کے بارے میں سوال پوچھا جاتا ہے تو اس کے لیے بڑی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں، مگر پھر بھی ایسے سوال کا جواب نہیں ملتا ہے۔ خالد مجید مغل، کراچی

> ایسا تو کم ہی ہوتا ہے۔ خیر خیال رکھیں گے۔

● میں نعت خواں ہوں اور بڑی دل چسپی سے ماہ نامہ نونہال کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں جامعہ ملیہ اسکول آف ٹیکنیکل سائنس میں نویں جماعت میں پڑھتا ہوں اور دس سے زیادہ مقابلہ حسن و نعت کے مقابلوں میں اول انعام حاصل کر چکا ہوں۔ نعت خوانی پر اسکول اور دوسری تنظیموں سے سرٹی فکیٹ بھی ملے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات میں کئی بار میری تصاویر اور نام بھی آ چکا ہے، لیکن میری خواہش ہے کہ میری تصویر نونہال میں بھی شائع ہو۔ کیا آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے؟ کیا میں اپنا مختصر تعارف لکھ کر بھیج دوں؟ سید تنویر سہیل، کراچی

> لیجیے، آپ کا مختصر تعارف تو یہی شائع ہو گیا۔

● کم کھائیے ایک عمدہ تحریر تھی۔ سورج اور عید کی آمد دونوں بے حد پسند آئیں۔ دو مسافر دو ملک بہت دل چسپ تھا۔ جناب ساجد علی ساجد صاحب کی تحریر "اولمپک کھیل" بہت ہی زیادہ پسند آئی اور اس سے ہمیں اولمپک کھیل کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ اخبارِ نونہال، تحفے، ہمدرد انسائکلو پیڈیا، مسکراتے رہو اچھے تھے۔ نونہال ادیب میں عدنان جہانگیر شیخ کی تحریر "شہری دفاع" بہت معلوماتی تھی۔

فوزیہ جیلانی قریشی، کراچی

● اس مرتبہ اگر میرا خط شائع نہیں ہوا تو میں کبھی بھی خط نہیں لکھوں گا۔ دلشاد ابراہیم، کراچی

● جناب حکیم محمد سعید کا کم کھائیے اور طب کی روشنی میں بہت اچھی تھی۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کی پہلی بات اور دو مسافر دو ملک بہت اچھے تھے۔ عاصمہ، فیض، نجم مصباح، سعدیہ، حیدرآباد

● کہانیوں میں خواب سچا ہو گیا اور کھلونے جان دار ہوتے ہیں۔ لاجواب کہانیاں تھیں۔ نظموں میں عید کی آمد اور پیارا پاکستان بہترین نظمیں تھیں۔ نظم "سچے لفظوں کی مہک" نگہت شکور زندا نے چوتھی کی اردو کتاب سے نقل کی تھی۔ "خواب سچا ہو گیا" کہانی لکھنے پر مناظر صدیقی کو ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد

پہنچادیں۔ نوشین اعجاز عظمیٰ، صائمہ، کراچی

نگہت شکور ندا، ایک سال تک نونہال میں شائع نہ ہوسکیں گی۔

● ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ جاگو جگاؤ بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں "خرگوش بادشاہ بن گیا"، "کھلونے جان دار ہوتے ہیں" اچھی تھیں۔ خیال کے پھول میں اکثر پرانے اقوال ہوتے ہیں۔ جو ہم نے سُنے ہوئے ہیں۔ لطیفے بور تھے۔ میری عمر دس سال ہے اگر میں اپنی تصویر بھیجوں تو چھپ جائے گی؟ ادم، صدف، قدسیہ، عالیہ، بلال، جنید، قاسم، تنزیلہ، مریم، کرن، آصف، خاور، ناصر، آسیہ، ریاض، نظر، کنیز، عزیز احمد، نذیر احمد، شاہ الطاف حسین، اسلام آباد

آپ میں سے کس کی عمر؟ دس سال تک کے بچّوں کی تصویریں صحت مند میں شائع ہوسکتی ہیں۔

● ہم سب بہن بھائی پچھلے چھے سال سے نونہال کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ آپ نے قلمی دوستی کا سلسلہ بند کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس سلسلے کو دوبارہ شروع کریں۔ اس میں آپ لڑکیوں کو بھی موقع دیں، کیوں کہ اسلام مساوات کا حکم دیتا ہے۔ پھر آپ نے انھیں کیوں محروم کیا ہوا ہے۔ سلمان، جواد، لامعہ، سعدیہ، فیڈرل بی ایریا

ابھی ذرا ہمارے معاشرے کو اور "مہذب" ہوجانے دو۔

● میں اس پورے نونہال میں لاکھ کوشش کے باوجود کہیں بھی کوئی تنقیدی پہلو نہ نکال سکی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پورا نونہال قابلِ تعریف ہے۔ اب میں اس دُعا کے ساتھ خط ختم کرتی ہوں کہ خدا کرے ہر نونہال کے ہاتھ میں ہمدرد نونہال کا رسالہ ہو۔ راشدہ حمید، کراچی

● میں اس پیارے رسالے کا خاصا پرانا قاری ہوں، سونا مُسافر دو ملک جو ہمدرد نونہال میں قسط وار شائع ہو رہا ہے مجھے بے حد پسند ہے۔ یہ اس قدر دل چسپ سلسلہ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آپ کے بیان میں بے ساختگی اور روانی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم وہاں خود موجود رہے ہوں جہاں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ میری پہلی تجویز اسی کے متعلق ہے کہ ازراہِ کرم جب اسے کتابی شکل میں شائع کریں تو اس کی تصاویر میں کمی نہ کیجیے گا بلکہ اسی ترتیب سے چھاپیے گا جس ترتیب سے یہ رسالے میں چھپ رہی ہیں، اضافہ ہوجائے تو سبحان اللہ! دوم یہ کہ چند ماہ بیش تر ٹیلے وژن کے ایک کھیل میں ایک نیا لفظ "خوفیانا" متعارف کروایا ہے یہ لفظ "خوف زدہ ہونے" کے معنوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان اردو کو جدید بنانے اور جدید الفاظ استعمال کروانے میں مثالی حیثیت کا حامل ہے، امید ہے کہ اس لفظ کو عام کرنے کے بارے میں ضرور غور کرے گا۔ سید عبدالقادر، کراچی

● کہانیوں میں خواب سچا ہوگیا، کھلونے جان دار ہوتے ہیں، خرگوش بادشاہ بن گیا، ریل گاڑی کی آپ بیتی اور اولمپک کھیل پسند آئے۔ تحفے میں وہ لذت و خلوص نہ رہا جو پہلے تھا۔ البتہ لطیفے کچھ معیاری تھے۔ کیا "نیل کے بچّے" "آپ کے جسم میں کیا کیا ہے" کتابی شکل میں چھپ گئی ہیں؟ سید مشتاق احمد شاہ، گوٹھ عبدالرحیم کنڑانی

ابھی تو یہ دونوں کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔

● ہمدرد ادارے کے عید کارڈ بھی موصول ہوگئے تھے۔ عید کے موقع پر نونہالوں کو یاد رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ خدا کرے ہمدرد نونہال ایسی ہزاروں عیدیں دیکھے۔ میں حکیم محمد سعید صاحب کی تحریک "۲۷ رمضان المبارک اور پاکستان" سے فکری طور پر متفق ہوں۔ جولائی کا شمارہ بہترین تھا۔ طاہرہ خانم جعفر علی، کراچی

● اس مرتبہ کا خوب صورت نونہال بہت پسند آیا۔ خدا محترم حکیم محمد سعید صاحب کا سایہ ہم پر، آپ پر اور پورے پاکستان پر قائم رکھے اور آپ یونہی فلاحی کام انجام دیتے رہیں۔ پچھلے دِنوں حکیم صاحب ہمارے شہر بہاول پور تشریف لائے تھے۔ بہت خوشی ہوئی۔ ابو کے ساتھ ہم بھی اسلامیہ یونی ورسٹی گئے تھے حکیم صاحب کو دیکھنے اور سُننے لیکن افسوس پورا ہال بھر چکا تھا۔ ہم کچھ دیر پہلے اپنے آپ کو خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہے تھے، لیکن جگہ نہ ملنے سے منھ لٹکائے واپس آئے۔ حکیم صاحب جب بھی موقع ملے بہاول پور ضرور تشریف لائیں۔
فوزیہ تبسم اعوان، بہاول پور

● خیال کے پھول پسند آئے۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کا "دو مسافر دو ملک" پڑھا اب تو ہمیں بھی شدید خواہش ہوگئی ہے کہ اے خدا ہمیں بھی پیرس دکھانے کی توفیق عطا فرما۔ کرشن چندر کی "چالاک خرگوش" دل چسپ تھی، لیکن لمبی ناک والا کہانی پسند نہیں آئی۔
جمیلہ رانی، شہداد پور

● نونہال میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ محمد شکور، ڈیرہ دو بٹی

اُن نونہالوں کے نام جن کے خط جگہ کی کمی کے باعث شائع نہ کیے جاسکے۔

کراچی: ۔ وردہ خورشید بھٹی، جمیل احمد خاں، عقیل احمد خان، کنیز سیدہ سجادی، آصف علی، شائستہ نازش قادری، زہرہ محمد یونس، آمنہ محمد یونس، محمد عارف یونس، محمد معین یونس، محمد فیصل یونس، محمد ایمن یونس، سید نوید اقبال احمد شمسی، شاہد منور حسین وارثی، روشن زکریا کھتری، عابد علی زیدی، لبنیٰ ناز صدیقی، سیدہ صائمہ انیس رحمان، سید عسکری رضا، فائزہ صدیقی، قدسیہ جلیس صدیقی، سید محمد راشد عزیز، نفیس رحمان، عامر حنیف، کاشف عظیم، نزہت فاطمہ زیدی، حبیب احمد قریشی، ہما گلناز، محمد عامر عزیز، محمد انور نجم، راجا شہزاد علی، عامر مقبول، محمد اعجاز علی بھولو، جلال، انور خاں، فیاض، نوازش علی، اعجاز عثمان سہگل، سطوت کامرانی، پیر عبدالحفیظ سرہندی، ارسلان، سامیہ رفیق بھوجانی، ثوبیہ نثار، طالب بھوجانی، محمد نعیم، محمد جواد صادق حسین، تنویر شعیب، اسد اللہ، عبدالوکیل عبدالوحید پیرزادہ، شائستہ وجاہت، محمد ایاز انصاری، ذیشان مجید خان، ظل ہما۔ حمیرا نوئین، سمی، سمیرا نوئین، سائرہ نورین، ثروت شہناز، ہمایوں عبدالعلیم خان، علی محمد، مرزا شاہ جہاں فیضی، محمد عسکری، عظمت حسین خان، سہیل حسن، شہنیلا یونس، محمد ادریس قمر، کوثر یاسمین، محمد عمران مقبول، سید حیدر علی، اظفر کلیم قادری، محمد سفیان ناصر، سید محمد راشد عزیز، عاصمہ حفیظ علوی، نگہت اشفاق، بشریٰ میر، خرم خان، علیا عثمانی، ابوذر حسین صدیقی، مشتاق احمد بلوچ عثمان، کوثر جہاں، علی اکبر، محمد آصف صدیق، عبدالمقیت انصاری، ندیم احمد، عبدالغفار ساجد، یوسف ظفر، عبدالوحید، عدنان عالم حسن، شہلا عرفان فاطمی، سید ذوالفقار حسین نقوی، شاہدہ عزیز، فرح دیبا، عاشق حسین شوکی، طاہر انصاری، شیر احمد جلال افغانی، خالد مجید مغل، حفیظ الرحمٰن، ساجدہ پروین، نذیر حسین، حماد رضا، محمد سمیع محسن، محمد خالد رانا، مرزا امین علی بیگ، کریم بخش بلوچ، سید زاہد حسین، مریم شفیع اعوان، قیصر ظہور، عابدہ بشیر خان، ارم عنبرین، منور رضا چانڈ، فرزان القریشی، رسیلہ کوثر، منور سلطانہ صابر، سلامت علی شاہ، سمن حبیب، حمیرا گوہر، وقار عظیم، غزالہ ساجد، رضوانہ ساجد، فرحت، سید آصف مصطفےٰ نقوی، عادل الغفور سلیمی، سید خالد شفیق، سیما ادریس، حمیرا عاشقین، زینب یوسف، منزہ کوکب، غلام ربانی، روبینہ عظمت، آمنہ عظمت، عبدالمجید یوسف، عنایت اللہ عتیق، راشدہ حمید، امین حسن علی، محمد فراز منور، اطہر نور، آسیہ شہزادی، علی محمد، کرن خواجہ، عائشہ عنبرین، عبدالرزاق انصاری، عبدالقادر خرم عبدالحئی، سید طاہر عزیز، احسان اللہ۔ لاہور: فاران مرزا، سہیل ملک، محمد عامر افضال رانا، عمر فاروق، شعیب فرخ۔ اسلام آباد: عظمیٰ شکور احمد، محمد شکیل۔ واہ کینٹ: مہوین اعظم، محمد رفاقت۔ بہاول نگر: پرنس افضل شاہین، رانا امجد حسین امجد۔ ٹنڈو محمد خان: ایم اسلم ناگوری، عمران احمد شیخ۔ ملتان: مجید احمد ساجد، امجد علی۔ میانوالی: آبی ذر خان، سرور خان نیازی، امیر خان نیازی، جاوید اقبال براچہ، عطاء اللہ خان نیازی۔ فیصل آباد: یاسمین ضیا، فوزیہ رشید شیخ، راجا عبدالحئی بٹ، ثوبیہ رفیق، شمائلہ ناز ملک۔ نواب شاہ: جاوید ممتاز خان زادہ، قرۃ العین عین قاضی، تحسین وسی فاروقی، راشدہ منصورہ، مظفرہ بشرہ ڈاہری، افتخار احمد، صائمہ کنول۔ شکارپور: خالد عبداللہ چاچڑ، شبیر حسین صدیقی۔ میرپور خاص: فرزانہ حاجی علاؤ الدین، محمد ندیم ملک، محمد قدرت اللہ بیگ، محمد طاہر رضا۔ خیرپور میرس: منور علی کنگو، مبین حیدر انصاری، عالیہ کھرو۔ سانگھڑ: جہانگیر شہزادی نوشین ناز، جہانگیر معروف، شفیق آرائیں۔ ساہی وال: فرید ظفر۔ سکھر: دیدار احمد بھٹو، محمد علی شاہین، طارق، شبانہ اشتیاق، محمد پرویز عالم، پریتم کمار شیروانی، محمد خرم، سلیم احمد سومرو، نسرین انصاری، محمد سلیم بھٹی۔ حیدرآباد: سلمیٰ خالد خان، چندر ریکھا، فرزانہ شیخ، پروین ظفر، ریحانہ مجید، ایم آصف خان، محمد حفیظ، شہزاد شرجیل، محمد سلمان شیخ، اے صمد، اکرم عالم انصاری، شبانہ صدیقی، جمیل احمد صدیقی، جاشورو: کاشف رضا خان۔ دربند کالونی: محمد خالد۔ کوٹ غلام محمد: رانا ندیم حیدر۔ مورو: ظفر حسین بھکر، طارق محمود۔ کشمور: آنسہ نوشابہ سلیم۔ ایبٹ آباد: محمد امین۔ پشاور: ناجیہ ارم۔ شہداد پور: محمد زاہد قریشی۔ تربت مکران: نذیر احمد ساحر۔ اٹک: اسما سنقر۔ سرگودھا: رضیہ سردار اعوان۔ لاڑکانہ: تسنیم فاطمہ جعفری۔ میاں چنوں: مظہر غازی۔ بیلان: سیف اللہ خالد۔ رحیم یار خاں: سید محمد رضا شاہ۔ مردان: فیصل عباس شاہ جعفری۔ سیالکوٹ: کلثوم محمد نذیر۔ کوٹلی: لیاقت محمود جنجوعہ زخمی۔ ٹنڈو محمد خاں: عمر دراز خان خٹک۔ مظفر گڑھ: تسلیم روبینہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ: طاہرہ سلطانہ۔ ہارون آباد: شہباز علی انجم۔ عارف آباد: خالد امین۔ مظفر گڑھ: شیخ ناصر محمود۔ گوادر: عبداللہ بلوچ۔ فیصل آباد: طارق ظفر۔

نونہال ادیب

حمد

مرسلہ: سلمان شیخ اے صمد، حیدر آباد

زمیں خلق کی آسماں کو بنایا
خدا نے ہمارے جہاں کو بنایا

زمیں میں چھپائے ہیں اُس نے خزانے
اشارے پہ اُس کے چلے ہیں زمانے

یہ آگ اور مٹی ہوا اور پانی
ہر اک چیز اُس نے بنائی ہے فانی

یہ بلبل یہ مینا یہ توتے سہانے
بنائی جہاں کی ہر اک شے خدا نے

ہمیں دی اسی نے صداقت شجاعت
ہماری یہ جاں بھی ہے اس کی امانت

نعت

مرسلہ: عابد الشکور نظر، جہلم

مقصودِ کائنات تُو ایسی بہار دے
جو جسم سے خزاں کا لبادہ اُتار دے

ربِّ کریم گنبدِ خضرا کے چاند سے
غم کی سیاہ رات کا چہرہ نکھار دے

وردِ زباں ہو اسمِ محمدؐ تمام عمر
اس غازۂ صفات سے خود کو نکھار دے

ذکرِ نبیؐ کے نور سے روشن ہے کائنات
اس نور سے حیات کے عارض نکھار دے

عبدالشکور روضۂ انور کا بھی طواف
اس آرزو میں عمر تُو اپنی گزار دے

نقالی

صالحین رضا، کراچی

سلمان ایک ذہین لڑکا تھا۔ اس میں تمام اچھی عادتیں تھیں، مگر ایک بُرائی تھی۔ وہ ہر استاد کی نقل اُتارتا تھا کہ فلاں ماسٹر اس طرح چلتے ہیں، اس طرح بولتے ہیں۔ اس کی اس حرکت کا علم گھر والوں کو بھی تھا۔ انھوں نے اس کو بہت منع کیا، مگر وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔

ایک دن اُس نے گھر والوں کو جمع کیا اور بولا، ہمارے نئے ماسٹر صاحب اس طرح چلتے ہیں اور ماسٹر کے انداز میں خراماں خراماں چلنا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ فرش پر اس کا پاؤں پھسلا اور وہ چاروں شانے چت گر پڑا۔ اب گھر والوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ جب سب ہنس چکے تو سلمان کے ابّو نے کہا، "بیٹے، تم نے اپنے استاد کی نقل کی تھی جو میرے برابر ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمھیں سزا دی ہے۔"

سلمان نے اُس دن سے توبہ کر لی۔

اللہ کے نام پر

شاہد انور شاد، لیہ

میں ابھی دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسکول سے چھٹی ہوئی تو میں سیدھے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سڑک کے موڑ پر ایک نہایت ہی غریب آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے قریب ہی دو چھوٹے چھوٹے بچّے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑے درد بھرے انداز میں آوازیں دے رہا تھا: "خدا کے نام پر کچھ دیتے جاؤ میں اور میرے بچّے صبح سے بھوکے ہیں۔" مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے ایک رُپیہ نکال کر دے دیا اور پھر میں نے اس سے کہا کہ چلو میں تم کو روٹی کھلاؤں۔ راستے میں تین چار آدمیوں نے پیسے دیے۔ میں نے اُسے گھر سے پانچ چھے روٹیاں اور سالن لا کر دیا۔ فقیر اور اس کے بچّے خوشی خوشی بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر بڑی ہمدردی ہوئی۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو میں ان کے پاس جا بیٹھا اور پوچھنے لگا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہم یہاں سے سو میل دور ایک شہر میں رہتے ہیں۔ وہاں پر ہمارا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ جب سے یہاں آئے ہیں دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ بابا اگر آپ کوئی کاروبار کر لیں تو بہتر ہے۔ اس سے بھیک مانگنے سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ وہ کہنے لگے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں میں ابھی پیسے لا دیتا ہوں۔ میں ابھی یہ بات کہہ رہا تھا کہ اُس نے یک دم شور مچا دیا۔ میں گھبرا گیا کہ یا اللہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ شور سُن کر لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ فقیر زور زور سے کہنے لگا کہ اس لڑکے نے میری صندوقچی اُٹھا لی ہے جس میں پورے پانچ سو رُپے تھے۔ میں یہ الفاظ سُن کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے لاکھ اپنی صفائی پیش کی، قسمیں بھی کھائیں مگر وہ مجھے تھانے لے جانے پر بہ ضد رہا۔ میں نے جب تھانے کا نام سُنا

تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے آج تک تھانے کی صورت تک نہ دیکھی تھی مگر وہ مجھے تھانے لے جانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔

اس فقیر کی مسکین صورت دیکھ کر لوگ مجھے تھانے لے جانے پر رضامند ہو گئے۔ میرے والد کو اطلاع کر دی گئی وہ بھی پہنچ گئے۔ جب تھانے دار نے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے کہا، میں نے اس کی کوئی صندوقچی نہیں اُٹھائی۔ اس پر فقیر قسمیں کھانے لگا۔ میں نے دلیری اور جرات سے تمام واقعہ سُنا دیا۔ پھر تھانے دار نے فقیر سے پوچھا کہ اگر تمھارے پاس پانچ سو رُپے تھے تو تم بھیک کیوں مانگ رہے تھے کہ میرے بچّے بھوکے ہیں کچھ اللہ کے نام پر دے دو۔ اگر تمھارے پاس رقم تھی تو تم نے اپنے بچّوں کو کھانا کیوں نہ کھلایا۔ اس فقرے پر وہ لاجواب ہو گیا۔ اس کا جھوٹ صاف ظاہر ہو چکا تھا۔

تھانے دار نے اس کے تین چار زوردار تھپڑ لگائے، مگر مجھے اس کی حالت پر ترس آگیا۔ میں نے اس کو فوراً چھڑا لیا۔ فقیر نے مجھ سے معافی مانگی۔ تھانے سے جب ہم واپس گھر آرہے تھے تو ایک کار گلی کے موڑ پر رُکی اور ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔ ہم بھاگے بھاگے وہاں پہنچے تو اسی فقیر کا بچّہ کار کے نیچے آچکا تھا۔

میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ میں نے تو اُسے معاف کر دیا تھا، مگر خدا نے اُسے معاف نہیں کیا۔ اور اُسے اس کے کیے کی سزا دی۔

کفایت

مرسلہ: نیلوفر جہانگیر، اسلام آباد

ننھّے مُنّے پیارے بچّو
غور سے ساری باتیں سُن لو
اپنا پیسہ ہم نہ گنوائیں
جتنا پائیں کچھ تو بچائیں
گلّہ اپنا ایک بنائیں
پیسے اس میں ڈالتے جائیں
قرض کی لعنت دُور رہے گی
ساری مصیبت دُور رہے گی
کھاؤ پیو اور موج اُڑاؤ
شکر خدا کا کرتے جاؤ
ہر اِک اپنی چیز سنبھالو
پنسل روز نئی مت مانگو
مہنگی چیزیں تم نہ منگاؤ
امّی ابّا کو نہ ستاؤ
خوشیوں کا گلشن مہکاؤ
کام وطن کے ایسے آؤ
جو تم پاؤ سب نہ گنواؤ
قطرہ قطرہ دریا بناؤ
ملک کی خدمت کر سکتے ہو
دُور مصیبت کر سکتے ہو

ریڈار کی ایجاد

فیاض انور چوہان، کھرو

اس وقت ہم سائنسی اور ٹکنالوجی کے دَور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بہت سی ایجادات کو کام میں لانے سے ہم بہت سی مشکلات سے بچ گئے ہیں۔ ہم آج کے دور میں بہت سی حیرت انگیز ایجادات دیکھ رہے ہیں۔

ان ایجادوں میں ایک اہم ایجاد ریڈار کی ہے۔ عملی طور پر ریڈار ۱۹۳۰ء میں امریکا میں ایجاد کیا گیا۔ سب سے پہلے ریڈار کو دشمن کے ہوائی جہازوں کا پتا چلانے کے لیے ترقی دی گئی۔ اب یہ جہازوں کے اُڑنے اور حفاظت کے ساتھ اُترنے کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوا ہے۔ یہ پانی کے جہازوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے سے بھی بچاتا ہے۔

ریڈار ایک الیکٹرانک نظام ہے۔ یہ ریڈیو کی لہریں استعمال کرتا ہے۔ یہ ان چیزوں کا پتا چلاتا ہے جو فاصلے، اندھیرے یا بادلوں کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتیں۔ ریڈار ایک ایک چیز کی پوزیشن اور فاصلہ بتاتا ہے۔ اگر چیز متحرک ہو تو یہ اس کی رفتار اور سفر کی سمت بتا سکتا ہے۔ جب ریڈیو کی لہریں کسی چیز سے ٹکراتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جہاز، پہاڑ یا چٹانوں سے ٹکراتی ہیں تو یہ واپس ریسور کی طرف منعکس ہو جاتی ہیں جس سے اُن کا فاصلہ یا سمت معلوم ہو جاتی ہے۔

آج کل کے دور میں ریڈار تقریباً تمام جہازوں میں نصب ہوتا ہے۔ ریڈار کی بناوٹ ایک گول پلیٹ جیسی ہوتی ہے۔ اب تو دنیا کے مشہور سائنس دانوں نے چورخ والے ریڈار بھی تیار کر لیے ہیں۔

چوری کا انجام

محمد یحییٰ، کراچی

ظہیر اور کبیر بہت گہرے دوست تھے۔ دونوں کو شرارتیں کرنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ان کے ماں باپ ان کو بہت منع کرتے، مگر یہ مانتے ہی نہ تھے۔

ایک دن ان دونوں نے پروگرام بنایا کہ رجّو مالی کو جمال گوٹا پلایا جائے۔ جمال گوٹا کھانے سے دَست آنے لگتے ہیں اور جب رجّو کی طبیعت خراب ہو جائے تو اس کے باغ سے آم توڑ کر کھائے جائیں۔ یہ سوچ کر دونوں ایک حکیم صاحب کے پاس گئے اور ان سے جھوٹ بولے کہ جمال گوٹا دے دیجیے ہماری امی نے منگوایا ہے۔ پھر یہ لوگ مٹھائی کی دُکان میں گئے وہاں سے ایک لڈّو خرید کر اس کے اندر جمال گوٹا بھر دیا اور پھر رجّو مالی کے پاس گئے اور کہنے لگے، ہمارے گھر میں قرآن خوانی ہوئی ہے۔ یہ مٹھائی تمھارے حصّے کی ہے۔ رجّو مالی دونوں کو دعائیں دیتے ہوئے لڈّو کھا گیا۔

اُس وقت تو یہ شیطان یہاں سے کھسک گئے، لیکن جب رجّو مالی کی حالت خراب ہوئی اور وہ کُٹیا کے اندر جا کر جیسے ہی لیٹا یہ شیطان ایک چھوٹے سے درخت پر چڑھ کر آم توڑنے لگے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان بچّوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ لوگ جس پیڑ پر چڑھے ہوئے تھے اس کے نیچے ایک بھیڑیا

آگیا۔ ڈر کے مارے ظہیر کے ہاتھ سے دو آم گرے اور بھیڑیے کی پیٹھ پر لگے۔ جس سے بھیڑیا غصے میں آگیا اور ان کے اوپر چھلانگیں لگانے لگا۔ وہ لوگ درخت کے بہت زیادہ اوپر نہیں تھے اس لیے وہ زخمی ہو گئے اور چیخنے چلانے لگے۔ اُن کی چیخیں سُن کر رجّو مالی اپنی بندوق لے کر آیا اور بھیڑیے کو گولی مار دی۔ دونوں لڑکے بہت شرمندہ ہوئے اور رجّو سے معافی مانگنے لگے۔ رجّو مالی نے کہا میں نے تو تمھیں معاف کر دیا۔ اب تم لوگ جھوٹ اور چوری سے توبہ کر لو۔ پہلے ہی تمھیں اس کی سزا مل چکی ہے۔ یہ دونوں اس کے بعد اچھے بچّے بن گئے۔

شکستِ فاتحانہ

نورین رحمٰن، نواب شاہ

آج میں آپ کو جو واقعہ سنا رہی ہوں۔ وہ بالکل سچّا ہے۔ یہ واقعہ میرے اور میری چند سہیلیوں کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ ہماری کلاس میں ایک گونگی لڑکی نازنین پڑھتی تھی۔ میں اور میری سہیلیاں اُسے بہت چھیڑتی تھیں۔ نازنین نظمیں بھی لکھتی تھی۔ میرا گروہ اُسے "گونگی شاعرہ" کہتا تھا۔ ہم لوگ پرائمری پاس کر کے ہائی اسکول میں آ گئے تھے۔ ہائی اسکول ہمارے پرائمری اسکول سے بہت بڑا تھا۔ جہاں ایک اسٹیج بھی تھا۔ میں اسٹیج پر آئی۔ نازنین اسٹیج پر ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا، "اس وقت جو آپ محسوس کر رہی ہیں وہ اسٹیج پر آ کر بیان کریں۔" ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ بول نہیں سکے گی اس لیے ہم سب منھ چھپا کر ہنس رہے تھے۔ نازنین نے اپنی کاپی سے کاغذ پھاڑا اور اس پر کچھ لکھ کر ہمیں دیا۔ جسے پڑھ کر میری گردن شرم سے جھک گئی اس نے کاغذ پر لکھا تھا:

ایک گونگی اگرچہ لڑکی ہوں
بے زبانی پہ فخر کرتی ہوں
اپنے منھ میں اگر زباں رکھتی
اپنے جذبات کو بیاں کرتی
دن میں کتنی دفعہ ہر اک کا دل دُکھاتی
بے شمار گناہ اپنے نامۂ اعمال میں لکھاتی
زباں اپنی گندی کرتی غیبت سے
ہر جگہ میرا ذکر ہوتا نفرت سے
کتنی دفعہ ہر ایک کی برائیاں کر چکی ہوتی
ہر جگہ لڑائیاں کر چکی ہوتی
خدا کا شکر ہے لاکھ لاکھ
جس نے مجھے رکھا برائیوں سے پاک

نازنین نے مجھے اور میری سہیلیوں کو ایسا سبق سکھایا جو ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔

ماں

کاشف متین انصاری، راولپنڈی

ماں سے زیادہ دنیا میں محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ ماں ہی وہ ہستی ہے جو اپنی اولاد کو سُکھ چین اور آرام پہنچانے کے لیے دُکھ جھیلتی ہے۔ خود بھوکی رہ لیتی ہے،

لیکن اپنے بچّوں کو بھوکا نہیں دیکھ سکتی۔ جب کبھی انھیں کسی تکلیف میں دیکھ لے تو تڑپ اٹھتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ماں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا اور ماں کی فرماں برداری کو افضل قرار دیا۔ حضورؐ سے کسی شخص نے پوچھا کہ ماں باپ میں سے کون زیادہ خدمت کا مستحق ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، "ماں"۔ اس نے دوبارہ پوچھا، تب بھی فرمایا، "ماں"۔ جب تیسری بار پوچھا تب بھی حضورؐ نے فرمایا، "ماں"۔ چوتھی بار پوچھنے پر فرمایا کہ باپ۔ ماں کی خدمت اور اطاعت شعاری ہی سے انسان کو بڑا مقام مل سکتا ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔

اس کی مثال حضرت اویس قرنی کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ جب آپ حضورؐ کی زیارت کے لیے مدینہ تشریف لے جانے لگے تو آپ کی والدہ نے کہا کہ بیٹا، حضورؐ کے گھر کے علاوہ اور کہیں نہ جانا۔ جب آپ مدینہ پہنچے اور حضورؐ کے گھر تشریف لے گئے تو حضرت عائشہؓ سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کہیں اور گئے ہوئے ہیں۔ آپ نے جب یہ سُنا تو حضورؐ کی زیارت کیے بغیر قرن واپس آگئے، کیوں کہ یہ آپ کی والدہ کی نصیحت تھی کہ حضورؐ کے گھر کے علاوہ آپ اور کہیں نہ جائیں۔ آپ پھر کبھی حضورؐ کی زیارت کرنے نہ جا سکے، مگر پھر بھی حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جس نے اویس قرنی کو دیکھا وہ جنّتی ہے۔ آپؐ نے حضرت اویسؓ سے اُمتِ محمدیہ کی مغفرت کے لیے دُعا مانگنے کو کہا اور اپنی وفات کے وقت اپنا خرقہ بھی آپ کو بھجوایا۔

آپ کو یہ مقام صرف اور صرف اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت اور اطاعت شعاری سے ملا۔ جو لوگ اپنی ماں کی خدمت نہیں کرتے بلکہ نافرمانی کرتے ہیں اُن پر اللہ تعالیٰ اپنا قہر نازل کرتا ہے اور انھیں اپنی رحمت سے دُور فرما دیتا ہے۔ حضورؐ نے ایسے شخص کو بہت بدبخت اور بدنصیب کہا ہے جس نے ماں باپ کی خدمت کر کے جنّت حاصل نہ کی۔

حضورؐ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص بہت نیک تھا، مگر جب اس کی موت کا وقت آگیا تو وہ مرتا ہی نہ تھا بلکہ نزاع کی تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ نزاع کو سکرات الموت بھی کہتے ہیں۔ یہ انسان کے مرنے سے پہلے اُس پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس کی تکلیف اتنی ہوتی ہے کہ ہم اُس کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ صحابۂ کرام اُس شخص کے پاس بیٹھے تھے اور اُسے کلمہ پڑھنے کی تاکید کر رہے تھے اور اُس کی زبان سے کلمہ جاری نہیں ہو رہا تھا۔ جب اس طرح تین دن گزر گئے کہ نہ تو وہ مرتا ہے اور نہ نزاع کی تکلیف سے نجات پاتا ہے تو صحابۂ کرام نے حضورؐ سے درخواست کی کہ اُس کے لیے کچھ کیجیے۔

حضورؐ نے صحابہ سے استفسار فرمایا کہ کیا اُس کی ماں زندہ ہے تو صحابہ نے عرض کیا کہ جی ہاں یارسول اللہ وہ زندہ ہیں اور اس کے گھر سے کچھ ہی دُور ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتی ہیں۔ حضورؐ نے اُن سے فرمایا کہ اُن کے پاس جاؤ اور ان سے میری طرف سے درخواست کرو کہ اگر وہ پسند کریں تو میرے پاس آجائیں۔ صحابۂ کرام نے اُس شخص کی ماں کے پاس جا کر حضورؐ کے پاس چلنے

کو کہا۔ جب وہ حضورؐ کے پاس حاضر ہو گئیں تو حضورؐ نے پوچھا کہ اپنے بیٹے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ کہنے لگیں کہ وہ بہت نیک ہے۔ سچ بھی کیا بولتا ہے، نماز بھی پابندی سے ادا کرتا ہے، روزے بھی رکھتا ہے اور زکوٰۃ بھی دیتا ہے۔ حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ اماں کیا آپ اُس سے ناراض ہیں۔ وہ کہنے لگیں یارسول اللہ، کچھ نہ پوچھیے اس نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آپ انھیں معاف کر دیجیے۔ تو وہ کہنے لگیں کہ یارسول اللہ، میں اُسے معاف نہیں کر سکتی، کیوں کہ ایک دفعہ میں اس کے گھر گئی اور ایک چادر پر بیٹھ گئی تو اس کی بیوی نے میرے نیچے سے وہ چادر کھینچ لی کہ کہیں گندی نہ ہو جائے۔ اُس وقت یہ بھی کھڑا تھا، لیکن اس نے اپنی بیوی کو کچھ نہ کہا۔ اُس وقت میں نے اُسے یہ بد دعا دی تھی کہ اللہ کرے تجھے مرتے وقت کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو۔

حضورؐ نے جب یہ سنا تو صحابہ سے کہا کہ لکڑیاں جمع کر کے لے آؤ۔ اُس شخص کی ماں نے پوچھا کہ یارسول اللہ، آپ لکڑیاں کیوں منگوا رہے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ تم اپنے بیٹے کو معاف نہیں کرتیں اس وجہ سے اُس کو مرنے کے بعد بھی جلنا ہے تو اسے ہم یہیں پر جلا دیتے ہیں۔ اس پر ماں کا دل پسیج گیا اور وہ تڑپ کر کہنے لگی، "یارسول اللہ، میں اپنے بچّے کو جلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے اُسے معاف کیا۔" جیسے ہی ماں نے یہ کہا تو اُس شخص کی زبان پر خود بہ خود کلمہ جاری ہو گیا اور اُس پر وقتِ نزاع آسان ہو گیا۔

چھے ستمبر

مرسلہ: سمیعہ رؤف، گوجرانوالہ

صداقت کا بیاں ہے چھے ستمبر
شجاعت کا نشاں ہے چھے ستمبر

جہازوں اور ٹینکوں کو اُڑایا   کیا دشمن کی فوجوں کا صفایا
ہماری داستاں ہے چھے ستمبر   خدا کے نام کا نعرہ لگایا
شجاعت کا نشاں ہے چھے ستمبر

یقین و عزمِ محکم لے کے نکلے   جہادِ حق کا پرچم لے کے نکلے
اجالوں کا جہاں ہے چھے ستمبر   عمل کی روشنی ہم لے کے نکلے
شجاعت کا نشاں ہے چھے ستمبر

وہ چوروں کی طرح منھ کالے کالے   وہ تاریکی میں چھپ کر آنے والے
عدالت کا بیاں ہے چھے ستمبر   بڑے مکار ہیں دشمن کے لالے
شجاعت کا نشاں ہے چھے ستمبر

چلے ہیں غازیانِ دیں کے لشکر   لگا کر نعرۂ اللہ اکبر
کہ اب تک نغمہ خواں ہے چھے ستمبر   کیا یوں دشمنوں پہ وار بڑھ کر
شجاعت کا نشاں ہے چھے ستمبر

ہمیں آتا ہے الفت کا قرینا   وطن کی آن پر مرنا ہے جینا
مجاہد کی اذاں ہے چھے ستمبر   دھڑک اُٹھا ہے کہساروں کا سینا
شجاعت کا نشاں ہے چھے ستمبر

آج کا طالبِ علم

مرتضیٰ علی حسن، کراچی

٭ اب آپ اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ اب آپ کی اپنی

حکومت ہے جس کے تحت آپ آزاد مردوں کی طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اب معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مسائل سے متعلق آپ کی رائے اور آپ کی ذمے داری میں تبدیلی آنی چاہیے۔ اب آپ کے فرائض یہ ہیں کہ نظم قائم کریں، کردار اور اخلاق کو بلند کریں اور علمی قابلیت کو فروغ دیں۔"

یہ الفاظ قائدِ اعظم نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ پاکستان عظیم قربانیوں کے نتیجے میں بن چکا تھا۔ پاکستان کے طلبہ ہمارے قائد کے ان الفاظ سے متفق تھے اور انھوں نے ایسا کرنے کا سوچا تھا، لیکن ہم نے قائدِ اعظم کا یہ خواب پورا نہیں کیا۔ آج پاکستان کی حالت اس کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ آج پاکستان کے طلبہ میں نظم و ضبط کا فقدان ہے۔ ہمارے کردار مسخ ہوتے جارہے ہیں، اخلاق تباہ ہو رہا ہے اور ذہنی قابلیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ بعض طالب علم سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور اس میں ناکامی کی صورت میں توڑ پھوڑ مچاتے ہیں، ہنگامے کرتے ہیں اور ٹرانسپورٹ کے مسائل کھڑے کرتے ہیں۔ آپ بتائیے کیا ہمارے قائدِ اعظم نے ہم سے یہی کہا تھا؟ کیا انھوں نے ہم سے یہی اُمید رکھی تھی؟ کیا اُن کے خیال میں ایک ایسی ہی مملکت کا قیام تھا؟ نہیں! ہرگز نہیں۔

پاکستان بنتے وقت جن مشکلات کا سامنا مسلمانوں نے کیا تھا اُس کا اظہار قائدِ اعظم کے ان الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے کہ

"کوئی قوم بھی مصیبتوں اور قربانیوں کے بغیر آزادی حاصل نہیں کر سکتی اور برصغیر میں رونما ہونے والے حالیہ الم ناک واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہم ایسی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی ہے اور ایسے مصائب سے دوچار ہیں جو اندازے سے باہر ہیں۔ ہمیں خوف اور کرب کے تاریک دن دیکھنے پڑے ہیں، مگر میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمت اور خود اعتمادی کے بل پر اور خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم اس مرحلے سے کامیاب گزر جائیں گے۔"

اب آپ سوچیے کہ ہمارے ملک میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا جواب ہمیں قائد کے الفاظ میں مل جائے گا کہ ہم قرآن کو بُھلا بیٹھے ہیں۔ قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ "فتح آخر کار ہماری ہو گی بشرطے کہ ہم قرآنِ کریم کو اپنے لیے فیضان و ہدایت کا سرچشمہ بنائے رکھیں۔" اس وقت یقیناً ہماری فتح اسی وجہ سے ہوئی تھی، لیکن آج ہم ناکام ہو چکے ہیں، کیوں کہ جب ہم نے قرآن کو بھلایا تو خدا کو بھلایا اور خدا کو بھلایا تو اس کے رسولؐ کو بھول گئے۔ یعنی آج ہمارے ملک کے طالب علموں نے دنیا میں اپنا مقام کھو دیا ہے، لیکن ہم آج بھی دنیا میں اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ کھونا پڑے گا، کچھ قربانیاں دینی پڑیں گی اور مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے طالب علم ساتھیو! یہ سُن لو کہ جب تک کوئی قوم ٹھوکر نہیں کھاتی ہے اس وقت تک وہ سنبھلتی نہیں ہے۔

"اگر ہمیں حقیقی، تیز رفتار اور نتیجہ خیز ترقی کرنا ہے تو ہمیں تعلیم پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اپنی تعلیم کی پالیسی کو

ایسے خطوط پر چلانا چاہیے جو ہمارے عوام کے مزاج کے مطابق ہو، جو ہماری تاریخ و ثقافت سے ہم آہنگ ہو، جو ہم عصر حالات اور دنیا بھر میں وقوع پذیر ہونے والی وسیع ترقیات سے ہم سری رکھتی ہو۔ ہماری مملکت کا مستقبل اس تعلیم سے وابستہ ہے اور لازماً ہونا چاہیے، جو ہم اپنے بچوں کو بہم پہنچائیں۔"

"مختصراً یہ کہ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کے کردار کی تشکیل و تعمیر کرنا ہے، جس کا مطلب ہے اعلا اخلاق، دیانت، شرافت، قوم کی بے لوث خدمت اور احساس ذمے داری۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ معاشی زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیار، اہل اور آمادہ ہوں اور اس انداز میں کہ پاکستان کی شان اور اس کے وقار میں اضافہ ہو۔"

عزیز طالب علم ساتھیو! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آج کے عیش و آرام کو ترک کر کے پاکستان کی ترقی و کامرانی کے لیے محنت کیجیے، کیوں کہ اس میں ہماری عظمت ہے۔ ایک غریب ملک کے باشندے ہونے کے ناتے ہم کو اتنا عیش و آرام ہرگز ہرگز زیب نہیں دیتا ہے۔ آپ میری ان باتوں پر ٹھنڈے دل سے سوچیں اور عمل کریں۔

حکیم محمد سعید

محمد عارف محمد یوسف، حسین آباد

جناب حکیم محمد سعید صاحب ۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں حکمت و تجارت کی روایت موجود تھی۔ آپ کے والد محترم جناب حکیم عبدالمجید صاحب شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

آپ کی ۳ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ ۷ سال کی عمر میں حج کی سعادت حاصل ہوئی اور پونے ۹ سال کی عمر میں قرآنِ حکیم حفظ کر لیا۔ عام تعلیم حاصل کرنے کے بعد فنِ طب کو سیکھنے کے لیے طبیہ کالج دہلی میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں وہاں سے طب کی سند حاصل کی۔

آپ کے والد حکیم عبدالمجید صاحب نے ۱۹۰۶ء میں ہمدرد کی بنیاد رکھی، لیکن جوانی ہی میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ والد صاحب کے قائم کیے ہوئے ادارے "ہمدرد" کا انتظام جناب حکیم عبدالحمید صاحب اور جناب حکیم محمد سعید صاحب نے سنبھال لیا اور ایک عرصے کی رات دن محنت سے ہمدرد ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت سے اُبھرا۔

۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو حکیم صاحب پاکستان آ گئے۔ جب آپ یہاں آئے تو دہلی سے ہمدرد وقف کا ایک پیسہ اپنے ساتھ نہ لائے تاکہ ہندستان میں ہمدرد کی تعمیری جدوجہد میں جو تقسیمِ ہند کے بعد نازک و مشکل ہو گئی تھی، کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے۔

پاکستان میں "ہمدرد" کی بنیاد ۱۹ نومبر ۱۹۴۸ء کو رکھی گئی۔

ہمدرد صحت ۱۹۴۸ء سے پاکستان میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ عوامی حلقوں میں اس کو بہت مقبولیت

حاصل ہے۔

حکیم محمد سعید صاحب نے ۱۹۵۳ء میں ہمدرد کو ذاتی ملکیت سے نکال کر قومی وقف بنا دیا۔ ۱۹۵۳ء میں حکیم صاحب نے بچّوں کے لیے "ہمدرد نونہال" جاری کیا اور جناب مسعود احمد برکاتی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس رسالے کو بچّوں اور بڑوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہے اور کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حکیم محمد سعید صاحب نے طِب کی معیاری تعلیم کے لیے ۱۴۔ اگست ۱۹۵۸ء کو جامعہ طبیہ شرقیہ کی بنیاد رکھی اور ۱۹۶۴ء میں ہمدرد فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی۔ حکیم محمد سعید صاحب اس کے صدر ہیں۔ اس کا مقصد علم اور نادار و بے کس لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔

حکیم صاحب کی علم دوستی کا واضح ثبوت "کتب خانہ ہمدرد" ہے۔ جس میں دنیا کے مختلف علاقوں میں شائع ہونے والی ۵۰ ہزار کتابیں ہیں۔ دنیا کی ۲۶ زبانوں میں شائع ہونے والا مشہور ماہ نامہ یونیسکو کوریئر کا اردو ایڈیشن "پیامی" بھی آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

آپ کی لکھی ہوئی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں قلب و صحت، ہمدرد فارماکو پیا، مڈیسن ان چائنا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب کے لکھے ہوئے سفرنامے بہت مشہور ہیں ان میں ایک مسافر چار ملک، یورپ نامہ، جرمنی نامہ اور کوریا کہانی قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۷۸ء میں آپ کو صدرِ مملکت کا مشیرِ طب مقرر کیا گیا تھا جس سے آپ کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ تو آپ نے ۱۹۸۲ء میں اس عہدے سے استعفا دے دیا۔ حکیم محمد سعید صاحب کو کویت میں "کویت پرائز برائے طبِ اسلامی" دیا گیا۔ جون ۱۹۸۴ء میں اسٹاک ہوم میں حکیم صاحب کو ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری پیش کر کے ان کی طبّی مہارت اور خدمات کو بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

حکیم محمد سعید صاحب کا یہ سفر جاری ہے اور خدا کرے عرصۂ دراز تک جاری رہے۔ وہ ایک شریف و نفیس انسان ہیں۔

یہ پیارا پاکستان

مرسلہ: زرینہ اختر

یہ تیرا میرا پاکستان
اس دیس کی اونچی شان
یہ پیارا پاکستان
اس کے جیالے
طوفانوں کے پالے
یہ پیارا پاکستان
اس کی آزادی کا جشن منائیں
کھیلیں کودیں ناچیں دل بہلائیں
یہ پیارا پاکستان
اس کی خدمت اس سے محبّت
اس کی خاطر مر مٹ جائیں
اپنا پاکستان

اپنی محبت عام کریں ہم
دیس کا اونچا نام کریں ہم
اونچا پاکستان

ستمبر کے اہم واقعات

محمد اسحاق انجم، ڈگری

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمن فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔

۲ ستمبر ۱۹۶۲ء کو پاکستان میں پرانے ایک پیسے کی قانونی حیثیت ختم ہو گئی۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

۴ ستمبر ۹۷۳ء کو ابو ریحان البیرونی پیدا ہوا۔

۵ ستمبر ۱۸۲۲ء کو شام میں زلزلہ آیا جس سے ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔

۷ ستمبر ۱۹۶۲ء کو سابق صدر ایوب خاں نے ایران کا دورہ کیا۔

۸ ستمبر ۱۸۲۸ء کو مشہور مصنف ٹالسٹائی پیدا ہوا۔

۹ ستمبر ۱۹۸۲ء کو مقبوضہ جموں و کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ شیخ عبداللہ کا انتقال ہوا۔

۱۰ ستمبر ۱۵۷ء کو جنگِ افیون شروع ہوئی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح انتقال فرما گئے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۸۲ء کو ظہور الحسن بھوپالی کو شہید کر دیا گیا۔

۱۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خواجہ ناظم الدین دوسرے گورنر جنرل تھے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو برطانیہ نے جنگ میں پہلی بار ٹینک استعمال کیا۔

۱۷ ستمبر ۱۹۰۸ء کو دنیا کا پہلا فضائی حادثہ رُونما ہوا۔

ہمدرد نونہال، ستمبر ۱۹۸۴ء

۱۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو مغربی جرمنی اقوام متحدہ کا ممبر بنا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۸۲ء کو اسرائیلی فوجوں نے بیروت میں ہزاروں فلسطینیوں کا وحشیانہ قتلِ عام کیا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۷۴ء کو ہیکٹر بولیتھو (مصنفِ سوانح قائدِ اعظم) نے وفات پائی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۳۲ء کو نجد و حجاز کا نام بدل کر سعودی عرب رکھا گیا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۸۲ء کو امین جمائل لبنان کے نئے صدر منتخب ہوئے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۳ء کو گلف ایئر کا طیارہ ابوظہبی کے قریب گر کر تباہ ہوا، ۱۱۲ افراد ہلاک ہوئے۔

۲۴ ستمبر ۱۷۱۷ء کو ہیرس اول پیدا ہوا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو سری لنکا کے وزیرِ اعظم بندرا نائیکے قتل کر دیے گئے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۵۷ء ڈاگ ہمرشولڈ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بنے۔

۲۸ ستمبر ۱۸۹۵ء کو لوئی پاسچر فوت ہوا۔

۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو مصر کے صدر جمال عبدالناصر کا انتقال ہوا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر بنا۔

پاکستان کے بچوں کے نام

دردانہ جبیں، بھکر

ہم آج جس منزل اور مقام پر کھڑے ہیں کیا ہمیں معلوم ہے کہ ہم کو یہاں کس نے پہنچایا ہے۔ یہ ہمارے رہنما قائدِ اعظم محمد علی جناح نے۔ ہمارے بزرگوں نے جو قربانیاں پاکستان بنانے کے لیے دی ہیں اُن کی مثال نہیں ملتی ہے، ہمارے بزرگوں نے اپنے ملک کی خاطر اپنا مال اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں، لیکن آنے

والی نسلوں کے لیے ایک آزاد ملک بنایا۔ انھی کی بہ دولت آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں، جہاں ہمیں آزادی کا سُکھ نصیب ہے۔ اگر آج ہم اُسی دوراہے پر کھڑے ہوتے جہاں پر چھتیس سال پہلے تھے تو ہمارا حشر بھی فلسطینیوں کی طرح ہوتا۔ آج فلسطینیوں کو پناہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی چھتیس سال پہلے پناہ کی ضرورت تھی جہاں ہم اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اور ہم نے وہ ملک حاصل کر لیا ہے۔ فلسطینیوں نے ملک بنایا، لیکن افسوس انھوں نے اپنے جھگڑوں سے اپنا ملک کھو دیا۔ اگر وہ اتحاد سے رہتے تو انھیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ہمیں فلسطینیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے، کیوں کہ اگر ہم اپنے ملک کی حفاظت نہ کر سکے تو خدا نہ کرے کوئی بڑی طاقت ہمارا سب سے بڑا اثاثہ یعنی ہمارا ملک ہم سے چھین لے گی۔ اگر ہم اتحاد سے رہیں اور اپنے ملک کی حفاظت کریں تو یہ ملک ہم سے کوئی قیامت تک نہیں چھین سکتا۔ آج ہمارے ملک میں افراتفری ہے اور ہر پاکستانی پیسے کے لیے ہر کام کرتا ہے، لیکن ہمیں اپنے ملک کی بھلائی، قوم کی ترقی اور عوام کے فائدے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ صرف اسی طرح اپنے پیارے پاکستان کو ترقی دے سکتے ہیں۔

کیا خوب صورت رات تھی

شازیہ فیض، کراچی

آج میں جس رات کا ذکر کرنے والی ہوں وہ میری

سال گرہ کی رات ہے، جس کا احساس مجھے تو کیا میری امی تک کو نہ ہوا اور احساس ہوا بھی تو کس کو، میری جانِ عزیز دوست لبنیٰ کو۔ لبنیٰ نہ صرف میری دوست ہے بلکہ میری خالہ زاد بہن بھی ہے۔ ہم لوگ آمنے سامنے ہی رہتے ہیں۔ لبنیٰ اپنے امّی ابّو کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اکثر میرا اس کے ہاں آنا جانا رہتا ہے۔

ہاں تو دوستو! یہ اس رات کی بات ہے جس دن سردی بہت تھی اور خون کو جما دینے والی ہوا چل رہی تھی۔ یہ رات ۲۰ فروری کی تھی۔ میں بستر میں جانے ہی والی تھی کہ فون بول پڑا۔ میں نے فون اُٹھایا تو پتا چلا کہ یہ لبنیٰ کا فون تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ پلیز شازیہ تم فوراً آجاؤ مجھے تمھاری سخت ضرورت ہے۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ فون بند ہو گیا۔ فون رکھنے کے بعد میں دیر تک سوچتی رہی کہ کیا کروں۔ خیال آیا کہ کیوں نہ فون کر کے بُلانے کی وجہ پوچھ لوں، لیکن پھر سوچا کہ رہنے دوں چل کر دیکھ لوں۔ چناں چہ میں نکل پڑی۔

لبنیٰ کے گھر پر پہنچی۔ دروازہ کھٹکھٹایا جو خود کُھل گیا۔ میں ہمت کر کے اندر داخل ہوئی، لیکن کچھ

نظر نہ آیا۔ میں نے باری باری تمام کمرے دیکھ ڈالے، لیکن کسی کمرے میں کسی کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ میں بڑی حیران ہوئی۔ ابھی واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ خیال آیا کہ بیٹی کے کمرے میں تو دیکھ لوں۔ جیسے ہی اندر داخل ہوئی کمرا روشن ہو گیا اور "سال گرہ مبارک" کا شور ہوا۔

میں نے دیکھا تو وہاں میری کلاس کی لڑکیاں تھیں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آج تو ۲۰ فروری ہے۔ آج تو میری سال گرہ کا دن ہے۔ پھر میں سب کو اپنے گھر لے آئی۔ وہ لوگ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لائی تھیں گھر آکر خوب کھایا پیا۔

اور اس دن مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی۔

قائم رہے پاکستان

مرسلہ: شمع نورین، کراچی

تیری اُونچی شان رہے
ہر لحظہ ہر آن رہے
میرا یہ ایمان رہے
قائم پاکستان رہے

تیرے دریا رہیں رواں
تیری فصلیں رہیں جواں
خوش ہر اک دہقان رہے
قائم پاکستان رہے

اُونچا تیرا پرچم ہو
سب زخموں کا مرہم ہو
اونچی تیری شان رہے
قائم پاکستان رہے

غالب کی شاعری

شبانہ پروین، کراچی

غالب کی شاعری آسمان پر کبھی نہ غروب ہونے والا سورج ہے۔ ان کا طرزِ بیان نرالا ہے۔ ان کا تخیل انوکھا اور اچھوتا ہے۔ جذبات کے اظہار پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ادب اور خاص طور سے غزل میں مرزا غالب نے اپنی جدّت طبع سے نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ قدما کے انداز سے ہٹ کر ایک مختلف انداز ایجاد کیا ہے۔ غزل میں گہرائی اور وسعت پیدا کی ہے۔ زندگی کا کوئی نغمہ ایسا نہیں جو اُن کے کلام میں خوابیدہ یا بیدار نہیں۔ شوخی اور ظرافت، انسان کی فطرت کی داستانیں، قلبِ غالب کے مشاہدات سب ہی کچھ موجود ہے۔ غالب کے کلام کی مقبولیت کی وجہ یہی حیرت انگیز تنوّع ہے۔

ترتیب سے لکھیں

محمد زاہد سومرو، کراچی

مثال کے طور پر یہ چند حروف ہیں :۔

ی ر ل ان ۔

ان کی صحیح ترتیب ن اری ل (ناریل) ہوگی۔ اس طرح آپ نیچے دیے ہوئے بے ترتیب لفظوں کو ترتیب سے لکھیں۔

(۱) روب ل آ ا اخ (۲) ی ارج ن ا (۳) ہ س پ ت (۴) ٹ ڑ ک ا ہ ی ش ے (۵) م ش ل ار ی (۶) ھ ن ڑ ا اس گ (۷) ل ھ ک ٹ (۸) ل چ ی ی۔

(۱) آلو بخارا (۲) انجیر (۳) پستہ (۴) شاہی ٹکڑے (۵) شیرمال (۶) سنگھاڑا (۷) کٹھل (۸) لیچی۔

پاکستانی بچّہ

مرسلہ: علی احمد زاہدی، کراچی

پاکستانی بچّہ ہوں
اپنی بات کا سچّا ہوں
گھر والوں کا پیارا ہوں
سب کی آنکھ کا تارا ہوں
کہنا بڑوں کا مانتا ہوں
اچھا بُرا سب جانتا ہوں
کام میں سب کے آتا ہوں
ہر تہوار مناتا ہوں
اچھے کام ہی کرتا ہوں
قدم سمجھ کر دھرتا ہوں

آنکھوں کا نور

محمد احمر شاہین، کراچی

کسی زمانے میں ایک بستی بالکل جنگل کے قریب آباد تھی۔ اس بستی میں بہت ہی نیک اور پُرخلوص لوگ رہا کرتے تھے۔

ان ہی لوگوں میں ایک شخص رحمان بھی تھا۔ رحمان گاؤں کی ایک مسجد میں پیش امام تھا اور محلّے کے بچّوں کو قرآنِ کریم کی تعلیم بھی دیا کرتا۔ رحمان کا ایک بیٹا بھی تھا جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کرتا تھا، جو اس گاؤں میں بہت ہی مشکل تھا۔ رحمان کے بیٹے کا نام نعمان تھا۔ گاؤں میں وہ نومی کے نام سے مشہور تھا۔ نومی ابھی چودہ سال کی عمر کو پہنچا تھا کہ وہ نو کلاسیں پاس کر کے دسویں میں پہنچ چکا تھا۔ نومی میں دوسرے بچّوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ادب تھا۔ وہ بڑے بزرگوں کو سلام کرتا اور سب محلے والوں سے ادب اور تمیز سے پیش آتا۔

جب اُس نے میٹرک کا امتحان دیا تو سارے لوگوں نے اُس کی کام یابی کی دُعا کی، جس کی وجہ سے اور امتحان میں محنت کرنے کے باعث وہ بچّہ پورے گاؤں میں اوّل آیا۔ جب اُس نے اپنی کام یابی کا سہرا ایک بڑے بزرگ کو باندھا تو بزرگ بولے "بیٹے، یہ سب تمھاری محنت کا پھل ہے۔" نومی نے جواب میں کہا کہ بابا، یہ سب تمھاری دُعاؤں کا صلہ ہے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے

کہا کہ بیٹے، تمھاری محبت کی وجہ سے تمھیں تو اب ہم ایک پل بھی اپنے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ تم ہماری آنکھوں کے نُور ہو۔

دریا مہران سکھر

شفاالحق شمس انصاری، پرانا سکھر

سکھر سندھ کا تیسرا بڑا تاریخی شہر ہے۔ سکھر کے عربی میں معنی ہیں "سخت تکلیف کے ساتھ"۔

سکھر کا نام بھی تاریخی ادوار کے ساتھ بدلتا رہا۔ شکّر اور کبھی سقر کے نام سے۔ بعض جگہ یہ بھی تذکرہ ملتا ہے کہ بکّھر کا نام تبدیل کر کے سکّھر رکھ دیا گیا اور

پھر یہ سکّھر کہا جانے لگا جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

سکّھر کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر کیپٹن "پوسٹانس" نے کہا تھا کہ "وادی مہران میں سکھر میں قدرتی مناظر کا حسن لاثانی اور قابلِ دید ہے"۔

شہر سکھر دریائے سندھ کے دائیں کنارے واقع ہے۔ اس کا رقبہ سات میل ہے جب کہ سطح سمندر سے ۱۹۲ تا ۱۸۰ فیٹ بلند ہے۔ شہر دو حصّوں میں منقسم ہے پرانا سکھر اور نیا سکھر۔

شہر سکھر میں قدیم تاریخی فنِ تعمیر کے شاہ کار موجود ہیں جن میں معصوم شاہ کا مینار قابلِ دید ہے۔ جو قدیم مشرقی روایات و طرزِ تعمیر کا منھ بولتا ثبوت اور اعلا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ قابلِ دید مقامات اور تعمیرات میں سکھر بیراج، لینس ڈاؤن پُل، سادھو بیلا، شاہ جو لوتار، آدم شاہ کی پہاڑی اور آستانۂ شاہ خیرالدینؒ (جیے شاہ جیلانی) ہیں جو سکھر کی سیر کے لیے آنے والوں اور سیّاحوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں اور اپنی تاریخی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

شہر سکھر میں دو بڑی لائبریریاں بھی ہیں جن میں نہایت نایاب کتابیں موجود ہیں۔ تشنگانِ علم یہاں اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ سکھر میں چار کالج ہیں۔ ایک پولی ٹیکنک کالج بھی ہے۔ یہاں بڑے پُر رونق بازار ہیں۔

اس کے علاوہ دریائے سندھ کے کنارے مسجد منزل گاہ ہے۔ یہ مسجد میر معصوم شاہؒ نے ۱۶۰۷ء میں تعمیر کروائی تھی۔ اس سے متصل سکھر شہر کی ایک معیاری اور مشہور درس گاہ گورنمنٹ تعمیرِ نو ہائی اسکول ہے۔ کھیلوں کے لیے شہر میں ایک خوب صورت میونسپل اسٹیڈیم بھی ہے۔

شہر کو برقی توانائی کی فراہمی کے لیے سکھر میں ایک بڑا تھرمل پاور اسٹیشن ہے۔ یہ اسٹیشن ساٹھ ملین رُپے کی لاگت سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی برقی پیداواری صلاحیت ۵۲ ملین کیلو واٹ ہے۔ سکھر سندھ کا تیسرا بڑا ڈویژن ہے۔ اس کے اضلاع میں خیرپور، لاڑکانہ، جیکب آباد اور شکارپور شامل ہیں۔ سکھر میں بلدیہ کے ارکان کی تعداد ۳۴ ہے۔

یہاں ترقیاتی کام جاری ہے۔ ان شاء اللہ سندھ کا

یہ تاریخی شہر چند سال میں ترقی کی منزلیں طے کرے گا اور اپنی تاریخی حیثیت برقرار رکھے گا۔

آنکھ مچولی

مرسلہ: ظہور شاہ چین، پسنی مکران

آؤ آنکھ مچولی کھیلیں
مِل کر سب ہم جولی کھیلیں
پہلے کس کی باری بولو
بولو بولو جلدی بولو
اچھا گنجل تم ہی آؤ
لو اب باقی سب چھپ جاؤ
سب سے پہلے کس کو کھاؤں
اچھا بولو! کیا آ جاؤں
آؤ میاں اب آ بھی جاؤ
پہلے اپنا نام بتاؤ
بھاگم بھاگ ہیں سب سے آگے
مجھ سے شبیر بھی ڈر کے بھاگے
لال میاں کو پکڑوں گا
لو میں آیا لو میں آیا

عبرت

علی ناصر رضوی، جہلم

"ملک صاحب! آج تو میں ایس ڈی او صاحب اور دوسرے افسر پُل چیک کرنے آرہے ہیں نا؟"

کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے منشی محمد حسین نے جمیل ملک صاحب سے پوچھا۔

"ہاں" ملک صاحب نے جواب دیا پھر ڈرائیور سے بولے "ذرا اسپیڈ تیز کرو۔ ٹائم کم ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب" یہ کہہ کر ڈرائیور نے ایکسیلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

جمیل ملک صاحب شہر کے مشہور ٹھیکے دار تھے۔ اکثر وہ سڑکوں، سرکاری عمارتوں اور پُل وغیرہ بنوانے کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اچھا مٹیریل لگانے کا وعدہ کرتے تھے۔ ملک صاحب ایمان دار تو تھے نہیں، مگر یہ حقیقت ہے وہ چالاک بڑے تھے۔ وہ حکومت سے بہت بڑے بڑے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اچھا مٹیریل لگانے کا وعدہ کرتے، مگر مٹیریل ذرا سستا ہی لگاتے اور اس طرح زیادہ پیسے بچا لیتے تھے۔

لیکن وہ بہت ہوشیار اور سمجھ دار آدمی تھے۔ اس لیے ٹیپ ٹاپ کر کے عمارت کی ظاہری شان بڑھا دیتے تھے۔ اس طرح خراب مٹیریل سے بنی ہوئی عمارت عمدہ اور پختہ لگنے لگتی تھی۔ کسی کو بھی ان پر شک نہیں ہوتا تھا۔

ان کا بھلا منشی غلام احمد بڑا ایمان دار آدمی تھا۔ وہ انھیں کمیشن سے زیادہ پیسے کھانے سے منع کرتا تھا، لیکن ملک صاحب اس کی نہیں مانتے تھے۔ آخر کار انھوں نے تنگ آ کر غلام احمد کو ملازمت

سے الگ کر دیا اور اپنے ہی جیسے بے ایمان محمد حسین کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔

اب تو معاملہ نہلے پر دہلے کا ہو گیا تھا۔ اگر ملک صاحب رُپے کی بے ایمانی کرتے تو محمد حسین سو رُپے کی بے ایمانی کرتا تھا۔ اس لیے اب تو مٹیریل بالکل ہی خراب لگنے لگا تھا۔ عمارتیں مہینے دو مہینے کے بعد ہی کریک ہو جاتیں۔ شہر میں ملک صاحب کی شہرت خراب ہو رہی تھی، لیکن انھیں اس بات کی پروا نہیں تھی۔ انھیں تو بس پیسہ کمانے سے غرض تھی۔ زیادہ سے زیادہ پیسہ جلد سے جلد کما لیا جائے۔

آج کل ملک صاحب نے ایک پُل کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ دو تین مہینے کے کام کے بعد پُل مکمل ہو چکا تھا۔ اس دفعہ تو ملک صاحب نے کمال کر دیا تھا۔ ڈھائی فیٹ کی جگہ ایک فُٹ چوڑے شہتیر سے ہی کام چلا لیا تھا۔ مسالے میں ریت زیادہ اور سیمنٹ کم رکھا تھا۔ پُل کی ظاہری حالت سے ہی اس کی کم زوری کا پتا چلتا تھا۔

پُل مکمل ہونے کے بعد ایس۔ڈی۔او اور دیگر افسر چیکنگ کے لیے آئے۔ انھوں نے کئی گاڑیاں پُل پر چلوا کر دیکھیں۔ وہ پُل جو کم زور ہی نظر آتا تھا بھاری گاڑیوں کے وزن سے لرزنے لگا، لیکن وہ ایس۔ڈی۔او اور افسر بھی ملک صاحب کے ہی بھائی تھے۔ انھوں نے ایک لاکھ رُپے لے کر پُل منظور کر دیا اور اگلے دن سے پُل عام گاڑیوں کے لیے کھول دیا گیا۔

لرزتے کانپتے پُل کو دیکھ کر لوگوں نے اپنے سَر پیٹ لیے۔ انھیں انسانی جانیں خطرے میں نظر آنے لگیں۔ ہر لمحہ خطرہ رہتا کہ اب پُل گیا تو جب گیا۔ انھوں نے اعلا حکام کو درخواستیں بھی دیں، لیکن کچھ شُنوائی نہ ہوئی۔

پانچ چھے دن تو پُل نے جیسے تیسے لرزتے کانپتے گزار ہی دیے، لیکن کب تک۔ ایک دن شام کو جب پُل پر سے ایران کی بارہ پہیّوں والی بھاری گاڑی گزر رہی تھی تو یہ پُل کاغذ کے پُل کی طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے اب گرا جب گرا۔ اتنے میں مخالف سمت سے دو بسیں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی آگئیں اور پُل اتنی تیز رفتار اور بھاری گاڑیوں کا بوجھ نہ سنبھال سکا اور زمین بوس ہو گیا۔

دریائے سندھ کی خوف ناک موجوں میں تینوں گاڑیاں کھلونوں کی طرح قلابازیاں کھانے لگیں۔ خاص طور پر بسیں تو کافی دُور تک لہروں کے ساتھ ہی بہتی چلی گئیں۔ ان میں جتنے آدمی بھی سوار تھے ان میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔

علاقے میں ایک کہرام مچ گیا۔ ارد گرد کے سیکڑوں لوگ موقعِ واردات پر جمع ہو گئے۔ لوگوں کا ہجوم غم اور غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ لوگ جو شروع دن سے ہی اس پُل کی خستہ حالی دیکھ کر پریشان تھے آج اس کا انجام دیکھ کر دہل ہی تو گئے۔ وہ اس ظالم ٹھیکے دار کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

اتنے میں پولیس بھی آگئی۔ اس نے سرکاری کارروائی شروع کردی۔ پھر غم و غصّے سے بے قابو ہجوم کو تسلیاں اور مناسب کارروائی کا یقین دِلا کر رخصت کر دیا جو اَب اس ظالم اور زر پرست ٹھیکے دار کو پھانسی دینے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اگلے دن اخباروں نے بھی اس واقعے کو خوب نمک مرچ لگا کر چھاپا اور پُل بنانے والے ظالم ٹھیکے دار کو سزا دینے کا مطالبہ کیا، جس کی بے ایمانی اور ہوس کی وجہ سے نوّے بیچارے انسانی جانیں لقمۂ اجل بن گئیں۔

لوگوں نے کورٹ میں ملک صاحب کے خلاف مقدمہ کردیا، لیکن ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جج نے ملک صاحب سے اسّی ہزار رُپے لے کر فیصلہ اُن کے حق میں کر دیا۔ بے چارے لوگ بے بس ہو گئے۔ ملک صاحب صاف بچ گئے۔ کوئی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

لوگوں کی نگاہوں سے بچنے اور کچھ تبدیلیِ مقام کے لیے ملک صاحب نے اپنا وہ مکان بیچ کر ماڈل ٹاؤن میں بنا بنایا ایک بنگلہ خرید لیا۔ ابھی نئے گھر میں صرف دو دن ہی گزرے تھے کہ رات کو ایک کمرے کی چھت بیٹھ گئی۔ اس کمرے میں ملک صاحب کے تین بچے سو رہے تھے۔ جب تک ملبہ ہٹایا گیا وہ تینوں معصوم بچے موت کی نیند سو چکے تھے۔

شام کو جب ملک صاحب ان تینوں کو دفنا کر گھر واپس آئے تو وہ بہت اُداس دکھائی دے رہے تھے۔ ایک تو انھیں اپنے بچّوں کی موت کا غم تھا دوسرے ان کا ضمیر انھیں برابر ملامت کر رہا تھا کہ ان کی بنائی ہوئی ناقص عمارتوں کے گر جانے سے جو لوگ ہلاک ہوئے تھے اللہ میاں نے یہ اس کی سزا دی ہے۔ دنیا والے خود تو ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے، کیوں کہ وہ ان کے پیسے کے آگے مجبور تھے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے ان غریبوں کی ضرورسُن لی اور اس مرتبہ ملک صاحب کا پیسہ کچھ کام نہ آسکا۔ قدرت نے ان معصوم جانوں کا ملک صاحب سے ایسا انتقام لیا کہ وہ ٹوٹ کے رہ گئے۔

ملک صاحب جو ہمیشہ دوسروں کو دُکھ دیتے تھے آج خود بہت دکھی تھے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے اور اب واحد بیٹے کو سینے سے چمٹاتے ہوئے سوچا کہ آئندہ کبھی بھی وہ ناقص مسالا استعمال نہیں کریں گے اور دیانت داری سے کام کریں گے۔

اس شمارے کے چند مشکل الفاظ

ہر لفظ کے سامنے اُس زبان کا اشارہ بھی لکھا گیا ہے جس سے وہ لفظ اردو میں آیا ہے۔ یہ اشارے اس طرح سے لکھے ہوئے ہیں: ع = عربی، ف = فارسی، ہ = ہندی، س = سنسکرت، ت = ترکی، انگ = انگریزی، الف = اردو۔

وَقار: (ع) وَ قَا رْ : عزّت، قدر و منزلت، جاہ و جلال۔

اُسلوب: (ع) اُسْ لُو بْ : ڈھنگ، طور، طرز، روش، طریقہ۔

مطلوب: (ع) مَطْ لُو بْ : جس چیز کی طلب ہو، محبوب۔

سِحر: (ع) سِحْ رْ : جادو، ٹونا، طلسم۔

سَحَر: (ع) سَحَرْ : صبح، فجر، سورج نکلنے سے پہلے کا وقت۔

زیرِ دام: (ف) زے رے دَام : جال میں پھنسنا، پھندے میں آجانا۔

صداقت: (ع) صَدَ ا قَتْ : خلوص، سچائی، راست بازی، کھراپن، تصدیق، ثبوت۔

مُہذّب: (ع) مُ ہَذْ ذَ بْ : شائستہ، آراستہ، تہذیب یافتہ۔

جِلا: (ع) جِ لا : چمک، روشنی، صفائی۔

غمّاز: (ع) غَمْ مَا زْ : چغل خور، آنکھ سے اشارہ کرنے والا، لُترا، بدگو۔

تناول: (ع) تَنَا وُ لْ : لینا، کھانا کھانا، کسی چیز کا پکڑنا۔

افراط: (ع) اِف رَا طْ : کثرت، زیادتی، حد سے گزر جانا، بہت زیادہ کرنا۔

معمور: (ع) مَعْ مُو رْ : بھرا ہوا، لبریز، پُر، آباد، بسا ہوا۔

انکشاف: (ع) اِنْ کِشَا فْ : کُھلنا، ظاہر ہونا، کھولنا۔

مُضمر: (ع) مُضْ مَرْ : چھپا ہوا، دل میں رکھا ہوا، پوشیدہ۔

اِنبساط: (ع) اِمْ بِسَا طْ : خوشی، فرحت۔

فراخ: (ف) فَ رَا خْ : کشادہ، وسیع، چوڑا، بہت بڑا۔

مشغلہ: (ع) مَشْ غَلَہْ : شغل، کام، تفریح، کسی کام میں مصروف رہنا۔

عُذر: (ع) عُذْ رْ : بہانہ، حیلہ، انکار، معذرت۔

سبقت: (ع) سَبْ قَتْ : کسی سے آگے بڑھنا، بڑائی، ترجیح، فوقیت، برتری۔

طرب انگیز: (ع) طَرَبْ اَنگْ گیز : خوشی پہنچانے والا، فرحت بخشنے والا۔

گُل ریز: (ف) گُل رِ ئے زْ : پُھلجھڑی، گلابی رنگ، کپڑا جس پر سرخ پھول کڑھے ہوں، پت جھڑ کا موسم۔

مقصود: (ع) مَقْ صُو دْ : مقصد، مطلب، غرض، مدعا۔

عارض: (ع) عَا رِ ضْ : رخسار، گال، پیش آنے والا، لاحق ہونے والا، سپہ سالار۔

ادوار: (ف) اَدْ وَا رْ : دَور کی جمع، زمانہ، عہد

معلوماتِ عامہ ۲۱۹ کے صحیح جوابات

ہمدرد نونہال کی مقبولیت میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جارہا ہے معلوماتِ عامہ کے جوابات اور تصویریں بھیجنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ہم سے بعض نونہالوں نے شکایت کی ہے کہ ہماری تصویریں کیوں شائع نہیں کی گئیں، جب کہ ہمارے تمام جوابات درست تھے۔ بات یہ ہے جن کی عمر اچھی ہو گئی ہے یا وہ اپنی عمدہ صحت کی وجہ سے ماشاء اللہ جوان معلوم ہوتے ہیں ان کی تصویریں نونہالوں کے ساتھ کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اس لیے ہم ذرا تامل کرتے ہیں۔ ویسے بھی اصل چیز تو نام ہے۔ نام بہت بڑا انعام۔ معلوماتِ عامہ ۲۱۹ کے صحیح جوابات یہ ہیں۔

۱۔ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خانۂ کعبہ میں اعلانیہ باجماعت نماز حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد ادا کی۔

۲۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلا عجائب گھر شہر کراچی میں قائم کیا گیا۔

۳۔ لفظ ابتدا کا مخالف لفظ انتہا ہے۔

۴۔ رنگ بدلنے میں سب سے زیادہ مشہور گرگٹ ہے۔

۵۔ مشہور تاتاری سردار جس نے انسانی سروں کا مینار بنوایا تھا، چنگیز خاں تھا۔

۶۔ برّاعظم ایشیا رقبے میں برّاعظم یورپ سے بڑا ہے۔

۷۔ ربر کی کان نہیں ہوتی، ربر کا درخت ہوتا ہے۔

۸۔ "میں موت سے بالکل نہیں ڈرتا" یہ آخری الفاظ مشہور سائنس داں ڈارون کے تھے۔

۹۔ اگر بارہ منزلہ عمارت سے دو ایسے پتھر ایک ساتھ پھینکے جائیں جن میں ایک کھوکھلا ہو اور ایک ٹھوس ہو تو دونوں ایک ساتھ گریں گے۔

۱۰۔ زلزلے کے جھٹکے ناپنے کے لیے جو آلہ استعمال ہوتا ہے اُسے زلزلہ پیما (سیسمو میٹر SEISMOMETER) کہتے ہیں۔

دس صحیح جوابات بھیجنے والوں کے نام

کراچی
مشتاق حسین
لبنیٰ ناز
منور سلطانہ صابر
مسعود احمد صدیقی
نادرہ مجید
محمد عبدالمتین
محمد عبدالصمد

سانگھڑ
محمد یامین مغل

محمد امین سیف الملوک

راول پنڈی
نگہت رسول
حسن اختر

کوئٹہ
طاہر گلزار

پیرانا سکھر
شفاء الحسن انصاری

دس صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تصاویر

عبدالمجید نواز مغل، سکھر

مشتاق رحمت اللہ، کراچی

نو صحیح جوابات بھیجنے والے کا نام

کراچی
زرین ناز
ہما ناز
ثروت شہناز
محمد فہیم اقبال
عبدالرشید اسمٰعیل
محمد شاہد اقبال صدیقی
شیر احمد جلال افغانی
اسما بی بی
سیدہ زینب راضیہ زیدی
عادلہ خانم
محمد سمیع محسن
عظمت حسین خان
ثروت حسین خان ہمدانی
محمد شکیل
بینش ناز
زہرا احمد یونس
ارشد حمید
خالد مجید مغل
سید عسکری رضا
محمد بخش
انجم شہناز
عقیل احمد
سیدہ شاہین تبسم
یاسمین رضا
سید آصف مصطفیٰ نقوی
سید محمد عرفان
شیر بہادر افغانی شیر زادہ
سبل سید
محمد اعظم حمیدی
علی عمران رضوی
تبسم شہناز

لبنیٰ خان	نواب شاہ	قاضی وصی الدین فاروقی	محمد ادریس ظفر
سلیم فراز	محمد طارق لودھی	قاضی سمیع الدین فاروقی	اسلام آباد
ستارہ جبین	ساجدہ رجب علی	عالیہ وصی فاروقی	شمیلہ نسرین
محمد عارف اقبال انصاری	قاضی ایاز الدین فاروقی	منزہ وصی فاروقی	حمیرا ارم
سیدہ رخشندہ بانو نقوی	قاضی منظور احمد کاشف فاروقی	نوشابہ سمیع فاروقی	میرپور خاص
نوازش علی	قاضی وسیم غیاث فاروقی	نزہت غیاث فاروقی	اعجاز حسین
روشن جمیل اختر	قاضی عاصم سمیع فاروقی	شازیہ وصی فاروقی	لبنیٰ حسین
محمد عارف اقبال انصاری	قاضی شعیب مغیث فاروقی	تمثلہ مغیث فاروقی	حیدرآباد
حافظ احمد ولی اللہ ارباب	قاضی تحسین وصی فاروقی	انیلہ رجب علی	محمد سلمان شیخ اے صمد
ادریس خان	عافیہ وصی فاروقی	یاسمین رجب علی	لاہور
شاہد اقبال شاہد	شیر حسن رجب علی	فیصل آباد	سید مدثر محسن
صنوبر اقبال	محسن رجب علی	محمد عمران	قمر الدین، لاڑکانہ
عظمیٰ اقبال	قاضی غیاث الدین فاروقی	علی عمران جان	معظم علی بلوچ، جہلم
عاصمہ حفیظ علوی	قاضی مغیث الدین فاروقی	محمد ارشد رشید	صدف گل، کوٹری
محمد احمیر اعجاز	قاضی شرف الدین فاروقی	سکھر	ٹنڈو محمد خان
	قاضی مجید الدین فاروقی	محمد سلمان آرائیں	عمر دراز خان خٹک

بعض نونہال اپنے خط میں، مضمون یا کہانی وغیرہ پر اپنا پتا نہیں لکھتے۔ یاد رکھیے، جب بھی آپ کسی کو خط لکھیں اپنا پتا ضرور لکھیں۔ یہ نہ سوچیے کہ آپ کا پتا جس کو خط لکھ رہے ہیں اُس کے پاس محفوظ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا پتا کھو گیا ہو، یا جواب دیتے وقت اس کو نہیں ملے۔ اگر آپ اپنے کسی عزیز کو بھی خط لکھ رہے ہوں تب بھی اپنا نام اور پتا ہر خط میں ضرور لکھ دیا کیجیے۔ یہ عادت بنا لیجیے کہ جب بھی خط لکھنے بیٹھیں تاریخ اور پتا پہلے لکھ دیں۔
ہمدرد نونہال کے لیے بھی آپ جو چیز بھیجیں اس پر اپنا نام اور پورا پتا ضرور لکھ دیا کیجیے

ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
رُوح افزا مشروبِ مشرق

آوازِ اخلاق
بدزبانی ذہن کا سرطان ہے

Adarts/84

متعدّد علمی، طبّی، ادبی اور دینی کتابوں کی اشاعت
کے علاوہ
اُردو میں بچّوں کے ادب کو
مالامال کرنے کے لیے

ہمدرد نونہال

جیسے مفید، صاف سُتھرے، تعلیمی اور تفریحی رسالے کی
۳۱ سال تک مسلسل باقاعدہ اشاعت پر

ماس پرنٹرز

ہمدرد فاؤنڈیشن، اس کے شعبۂ تصنیف وتالیف
اور خصوصاً اس کے محترم صدر

جناب حکیم محمد سعید صاحب

کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں

ماس پرنٹرز ناظم آباد ۳ کراچی ۱۸ فون: ۶۱۲۴۴۷